H

حرفِ چند

دنیا دارالامتحان ہے اور خدا نے اتنی وسیع وعریض، خوبصورت اور حسین دنیا اسی لئے بنائی ہے کہ فرزندان آدم کی ثابت قدمی اور استقامت کا امتحان ہو، اس دارالامتحان میں نفس کی گمراہی کے اتنے سامان رکھ دیئے گئے ہیں کہ ان کا حساب اور شمار ممکن نہیں۔ دوسری طرف انسان کو ارادۂ واختیار کی ایک خاص قوت بھی فراہم کی گئی ہے کہ وہ جیسا ارادہ کرے گا اور اپنی قوت اختیار وانتخاب کا استعمال کرے گا مشیت خداوندی اپنی مدد کا ہاتھ بڑھائے گی، اگر کسی پاؤں نے یہ طے کرلیا ہو کہ اسے کعبہ کے بجائے صنم خانہ جانا ہے اور کوئی زبان اسی پر مصر ہو کہ وہ ''شیرِطہور'' کے بجائے شراب ہی سے لذت آشنا ہوگی تو نہ اس کا پاؤں جنبش سے رک سکے گا اور نہ زبان ذوق اور لذت کے ادراک سے محروم ہوگی۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعہ انسانیت کو اس سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ وہ کن اعمال سے خوش ہوتا ہے اور کن اعمال سے ناراض؟ اس کی مرضیات کیا ہیں اور منہیات کیا ہیں؟ اپنے ارادۂ واختیار کی صلاحیت کو کن افعال کے کرنے میں صرف کرنا چاہئے اور کن باتوں سے اجتناب کرنا چاہئے؟ جو باتیں کرنے کی ہیں اور خدا کی مرضیات کے مطابق ہیں وہ حلال ہیں اور جو باتیں بچنے کی ہیں اور خدا نے ان سے منع فرمایا ہے وہ حرام ہیں، گویا غور کیا جائے تو دین و شریعت تمام تر حلال وحرام کی رہنمائی سے عبارت ہے، چاہے اعتقادات کا شعبہ ہو، معاملات ہوں معاشرتی زندگی ہو، آداب واخلاق ہوں، اجتماعی زندگی ہو، حقوق اور

تعلقات ہوں، ان سب میں جو خدا کی مرضیات ہیں وہ حلال ہیں اور جو منہیات ہیں وہ حرام ہیں۔ حلال وحرام کی تمام تفصیلات اسی اصول پر مبنی ہیں۔

اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو قرآن وحدیث کے جتنے مضامین ہیں اور ان سے متکلمین نے عقیدہ، فقہاء نے عملی زندگی اور صوفیاء نے اخلاق وعادات کی بابت استنباط کیا ہے وہ سب کے سب حلال وحرام ہی میں داخل ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اس مختصر کتاب میں ان تمام امور کا احاطہ مقصود نہیں بلکہ فقہاء نے حلال وحرام کے کچھ ضروری احکام (جو روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں) کو ایک الگ عنوان سے جمع کیا ہے۔ جس کو بعضوں نے "کتاب الحظر والاباحۃ" بعضوں نے "کتاب الکراہیۃ" بعضوں نے "کتاب الاستحسان" کے عنوان سے ذکر کیا ہے، اس باب کو مختلف گوشوں سے متعلق حلال وحرام کے احکام کا منتخب مجموعہ ہی کہا جا سکتا ہے، اس میں بڑے مفید اور ضروری اور کثیر الوقوع مسائل ذکر کئے جاتے ہیں۔

ماضی قریب میں ان احکام کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کے پیش نظر مختلف اہل علم نے حلال وحرام کے نام سے احکام ومسائل کے مجموعے مرتب کئے ہیں ان میں مشہور عرب عالم ڈاکٹر قرضاوی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے جن کی کتاب اردو میں بھی منتقل ہو چکی ہے، ڈاکٹر قرضاوی کی کتاب اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود ایک تو جزئیات وتفصیلات کو جامع نہ تھی اور اس میں کتب فقہ اور سلف صالحین کی آراء سے نسبتاً کم فائدہ اٹھایا گیا تھا۔ دوسرے بعض مسائل میں ایسی رائے اختیار کی گئی ہے جو اکثر اہل علم اور مستند ارباب افتاء کی آراء سے مختلف ہے، نیز بعض ایسے مسائل جن کی مسلمانان ہند کو ضرورت پیش آتی ہے فطری بات ہے کہ اس میں زیر بحث نہیں آئے ہیں —— غالباً انہی وجوہ کے تحت ڈاکٹر قرضاوی کی کتاب کے بعد عالم عرب میں مختلف اہل علم نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور بعضوں نے خاص طور پر قرضاوی صاحب کی بعض آراء کی تردید اور تنقید پر رسائل تصنیف کئے اس سلسلہ میں صالح

فوزان کی "الاعلام بنقد کتاب الحلال والحرام" راقم سطور کی نظروں سے گزری ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس طرح کے موضوعات پر جو تحریریں مرتب ہوں، ان میں فقہ وقانون کی خشکی کے ساتھ دعوت وتذکیر کی حلاوت اور چاشنی بھی ہو کہ اصل مقصود عمل کی ترغیب ہی ہے اور وہ اسی طرح حاصل ہوسکتا ہے، مسائل واحکام بیان کرتے ہوئے تو غیبی وتہدیدی آیات وروایات ذکر کی جائیں، حکم کی ظاہری مصلحت اور حکمت بھی بیان کی جائے، زبان واسلوب مؤثر ہو تو فائدہ زیادہ ہوتا ہے، امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''احیاء العلوم'' اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مایۂ ناز تالیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں نیز امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تحریروں میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے اور اسے قوم وملت کو جو فائدہ پہنچا وہ محتاج اظہار نہیں۔

اردو زبان میں ایک ایسی کتاب کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس میں ایسے ضروری اور کثیر الوقوع مسائل جمع کردیئے جائیں کہ اس میں کتاب وسنت کی نصوص اور فقہاء کے اجتہادات دونوں سے فائدہ اٹھایا جائے، زبان شستہ اور عام فہم ہو، تحریر میں تذکیر اور دعوت کا رنگ بھی نمایاں ہو، حوالہ جات کا اہتمام ہو اور مآخذ سے براہِ راست مراجعت کی جائے، آداب واذکار بھی ذکر کئے جائیں۔

پیش نظر کتاب اسی ضرورت کی تکمیل ہے، مسائل کے احاطہ، حوالہ جات کے اہتمام، زبان کی حلاوت اور شائستگی، اسلوب تحریر میں نصح وتذکیر کا غلبہ اور مسائل کے بیان کرنے میں اور قابل بحث امور پر اظہار رائے میں اعتدال وتوازن اور افراط وتفریط سے گریز اور کتب فقہ میں پھیلے ہوئے اور منتشر مسائل کے درمیان حسن انتخاب نیز ہر باب کے شروع میں موضوع کے مناسب مؤثر تمہید وغیرہ کی وجہ سے قوی امید ہے کہ یہ کتاب بھی انشاء اللہ مؤلف کی دوسری کتابوں کی طرح مقبول اور نافع ہوگی۔

مجھے مسرت ہے کہ یہ کتاب دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد کے دارالاشاعت

سے طبع ہو رہی ہے اور جامعہ ہذا نے ادھر اس سمت میں خاصی پیش قدمی کی ہے ــــ علم و تحقیق کے کاموں کی حوصلہ افزائی اور اس کے فروغ و ترقی میں شرکت و تعاون جامعہ کے اولین مقاصد میں ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو ثبات و دوام عطا فرمائے اور مفید اور بہتر تحریروں کی سوغات یہاں سے قوم و ملت کو ملتی رہے اور جامعہ کی تمام مطبوعات اور بالخصوص پیشِ نظر کتاب کو قبولِ عام سے سرفراز فرمائے۔ "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ"

آخر میں محترم الحاج سیّد ضیاء الرحمٰن صاحب صدر مجلس انتظامی دار العلوم سبیل السلام کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی علم نوازی کے سبب چاہتے ہیں کہ یہاں کے دوسرے شعبوں کی طرح شعبۂ تصنیف و تالیف اور شعبۂ صحافت بھی روز افزوں ترقی کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے اور منتظمین دار العلوم کی، دار العلوم کی فلاح و ترقی اور بقاء و استحکام کے سلسلہ میں جو نیک خواہشات اور عزائم ہیں ان کی تکمیل کا سامان مہیا فرمائے ــــ "وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ وَعَلَیْہِ التُّکْلَانُ"

محمد رضوان القاسمی
ناظم دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد
۱۸/ ربیع الآخر ۱۴۱۳ھ
۱۶/ اکتوبر ۱۹۹۲ء

%

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صدیقی صاحب

الحمد للّٰہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔

اسلام ایک مستقل نظام حیات کا نام ہے، جس کا کائنات انسانی کو اللہ تعالیٰ نے مکلّف قرار دیا ہے۔ ہر وہ انسان جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتا ہے اور تعلیمات کتاب وسنت پر ایمان رکھتا ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اسلامی نظامِ حیات کو اپنائے اور اس ضابطہ کے مطابق اپنی زندگی گزارے اور اسی پر اس کی موت ہو۔

یہ ظاہر کہ انسانی مزاج مجموعہ اضداد ہے۔ اس میں نیکی اور بھلائی کے جذبات بھی ہیں اور بدی اور خواہشات بھی اس میں محبت اور الفت بھی پائی جاتی ہے اور نفرت وعداوت بھی، وہ خیر خواہی اور رواداری کو بھی پسند کرتا ہے اور اس کی فطرت میں فتنہ و فساد سے دلچسپی بھی ہے۔

اور اسی انسانی مزاج کی اصلاح کے لئے ہر دور میں پیغمبر اور رسول بھیجے گئے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ہزاروں نبی اور رسول آئے اور انہوں نے راہِ حق کی ہدایت کی اور ضلالت وشیطنت کی راہ سے روکا۔ اسی کے ساتھ حلال وحرام اور جائز و ناجائز میں امتیاز رکھنا سکھایا۔ صراطِ مستقیم اختیار کرنے پر بشارت دی اور اس راہِ حق سے دور ہونے پر جہنم کی وعید سنائی۔

ربّ العالمین نے اپنی آخری آسمانی کتاب میں بھی کلیات واصول کو سامنے رکھ کر حلال وحرام کی نشان دہی کی اور رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مزید

تفصیل بیان فرمائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت کے مجتہدین اور صحابہ کرام نے اس کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا اور کتاب وسنت کے مجتہدین اور صحابہ کرام نے اس کی اشاعت میں فقہی جزئیات اور مسائل کا استنباط اور استخراج کیا اور پھر تمام احکام ومسائل کو مرتب کر کے کائنات انسانی کے سامنے پیش کیا تاکہ امت کو کوئی دشواری پیش آئے تو وقت ضرورت اس ذخیرہ سے مدد ملے اور اس کی رہنمائی کا فریضہ ادا ہو اور شیطان کا لشکر اس کو راہ راست سے دور کرنے میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

زمانہ جس جس طرح آگے بڑھتا گیا۔ انسان کی ضرورتیں بڑھتی گئیں اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے گئے۔ فقہاء کرام نے ان پیش آمدہ مسائل کا جواب فراہم کیا جو آج بھی ضخیم کتابوں کی صورت میں الحمدللہ امت کے سامنے موجود ہیں اور اہل علم اس مجموعہ سے استفادہ کررہے ہیں اور آئندہ بھی انشاءاللہ کرتے رہیں گے۔

حرام و حلال کا تعلق انسانی معاشرہ سے ہو یا اس کی عائلی زندگی سے، پھر ماکولات ومشروبات سے ہو یا کسب معاش سے یا زندگی کے دوسرے شعبۂ جات سے، کوئی گوشہ ایسانہیں ہے جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔

قرآن پاک میں حلال وحرام دونوں مسائل آئے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ ! " # $ % & ' ( ) * +

, - . /﴾ 1

D: ''حرام کیا گیا تم پر مردہ جانور اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا اور وہ جو مر گیا گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر یا سینگ مارنے سے۔''

نکاح کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

q المائدہ، آیت: ۱

1 ﴾W V U T S﴿

D:''حرام ہوئی ہیں تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں۔''

خرید وفروخت کے سلسلہ میں ارشاد ہوا:

2 ﴾< ; : 9 8 7﴿

D:''حلال کیا اللہ نے تجارت کو اور حرام کیا سود کو۔''

شراب وجوا کے متعلق کہا گیا:

, + *) (' & % $﴿

3 ﴾-

D:''بلاشبہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب شیطان کے گندے کام ہیں، سو ان سے بچتے رہو۔''

غیروں کا مال بالخصوص یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھانے کے سلسلہ میں فرمایا گیا:

] \ [Z Y X W V U T﴿

4 ﴾b a ` _^

D:''جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب آگ میں داخل ہوں گے۔''

بت پرستی اور جھوٹ کی مذمت کی گئی اور ارشاد ہوا:

Â Á À ¿ ¾ ½ ¼ »﴿

5 ﴾

D:''بتوں کی گندگی سے بچتے رہو اور جھوٹی باتوں سے بچتے رہو۔''

زنا اور زانیہ و زانی کے متعلق بیان کیا گیا:

q النساء، آیت: ۲۳ w البقرہ: ۲۷۵ e المائدہ، آیت: ۹۰

r النساء، آیت: ۱۰ t الحج، آیت: ۳۰

﴿ Z [\ ] ^ _ ` a b c﴾ [1]

D: ''زنا کاری اور بدکاری کے قریب مت جاؤ دراصل یہ بڑی بے شرمی اور بے حیائی کا فعل ہے جس سے بدی کے راستے کھلتے ہیں۔''

﴿ + , - . / 0 1 2 3 4 5 6 7 8
9 :﴾ [2]

D: ''بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والے مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو اور تم کو ان پر ترس نہ آئے اللہ کے حکم کے چلانے میں۔''

حد قذف کو بیان فرمایا اور ارشاد ہوا:

﴿ \ ] ^ _ ` a b c d e
f﴾ [3]

D: ''اور جو لوگ پاکدامن عورتوں کو عیب لگائیں پھر وہ چار مرد گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی درے مارو۔''

﴿ ª « ¬ ® ¯ ° ± ² ³ ´ µ
¶ ¸ ¹ º﴾ [4]

D: ''آج حلال ہوئیں تمہارے لئے تمام پاکیزہ چیزیں اور اہلِ کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کو حلال ہے۔''

﴿یَآ اَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾

D: ''اے رسولو! ستھری و پاک چیزیں کھاؤ اور بھلے کام کرو۔''

﴿ M N O P Q R S T﴾ [2]

---

q بنی اسرائیل، آیت: ۳۲ w النور، آیت: ۱
e النور، آیت: ۴ r المائدہ، آیت: ۵

D: ''اے ایمان والو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تم کو دیئے ہیں۔''

احادیث نبوی میں قرآن پاک سے زیادہ صراحت ہے ور بہت ساری چیزوں کی حلت وحرمت کو بتایا گیا ہے۔ رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"أَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ۔"[3]

D: ''سن لو، کسی آدمی کا مال دوسرے کے لئے حلال نہیں ہوتا ہے جب تک وہ بخوشی اجازت نہ دے دے۔''

ایک دوسرے موقع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أَلَا لَا يَحِلُّ لَكُمُ الْحِمَارُ الْأَهْلِيُّ وَلَا كُلُّ ذِيْ نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ۔"[4]

D: ''خبردار! تمہارے پالتو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ دانت والے درندے۔''

ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی:

"إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَحِلَّ لَكُمْ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوْتَ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا بِإِذْنٍ وَلَا ضَرْبَ نِسَائِهِمْ وَلَا أَكْلَ أَثْمَارِهِمْ إِذَا أَعْطُوْكُمُ الَّذِيْ عَلَيْهِمْ۔"[5]

D: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال نہیں فرمایا ہے کہ تم اہل کتاب کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر داخل ہو اور نہ ان کی عورتوں کو مارنا درست اور نہ ان کا پھل کھانا جب انہوں نے جزیہ ادا کر دیا ہو۔''

جو چیزیں ناجائز اور حرام تھیں مختلف مواقع سے سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے روکا:

---

q سورۃ النور، آیت: ۵۱ w البقرہ، آیت: ۱۷۲

e مشکوٰۃ r مشکوٰۃ: ۲۹ t مشکوٰۃ: ص ۲۹

"اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنْ ثَمَنِ الْکَلْبِ وَمَھْرِ الْبَغْیِ وَحُلْوَانِ الْکَاھِنِ۔"

D: ''رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتا کی قیمت اور بازاری عورت کی اجرت اور کاہنوں کے لین دین سے روکا ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ خون وغیرہ بیچ کر اس کی قیمت مت کھاؤ کہ یہ بھی حرام ہے:

"اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنْ ثَمَنِ الدَّمِ وَثَمَنِ الْکَلْبِ وَکَسْبِ الْبَغْیِ۔"[w]

D: ''بلاشبہ خون کی قیمت، کتے کی قیمت اور طوائف کی کمائی کھانے سے منع فرمایا ہے۔''

"کُلُّ ذِیْ نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ فَاَکْلُہٗ حَرَامٌ"

D: ''ہر ذی ناب درندوں کا کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔'' [e]

"عَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لُحُوْمَ الْحُمُرِ الْاَھْلِیَّۃِ۔" [r]

D: ''ابوثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پالتو گدھے کا گوشت حرام قرار دیا۔''

احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حلال وحرام کا بڑا ذخیرہ ہے۔ یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث نقل کر دی گئی ہیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ حلال وحرام کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں صراحت کے ساتھ موجود ہے جن کو سامنے رکھ کر ہی بعد کے فقہاء نے تمام احکام ومسائل کا ذخیرہ مدون کیا ہے جو فقہ وفتاویٰ کی

---

q مشکوٰۃ: ص ۲۴۱ — w مشکوٰۃ: ص ۲۴۱

e مشکوٰۃ: ص ۳۵۹ — r مشکوٰۃ: ص ۳۵۹

کتابوں کی صورت میں امت میں پائی جاتی ہیں اور آج علماء انہی کتابوں کے حوالہ سے حلال وحرام کا فتویٰ دیتے ہیں۔

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی پیش گوئی فرمائی ہے کہ آئندہ ایک ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے کہ لوگ حلال وحرام کی تمیز اٹھا دیں گے اور ساری چیزوں کا استعمال شروع کر دیں گے۔

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَأْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یُبَالِی الْمَرْأُ اَخَذَ مِنْہُ اَمِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ الْحَرَامِ رواہ البخاری۔"[1]

D: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ آدمی اس کی قطعاً پرواہ نہیں کرے گا کہ وہ حلال کھا رہا ہے یا حرام کھا رہا ہے۔"

حالانکہ حلال وحرام ظاہر ہوگا۔ علماء اس کی نشاندہی کر چکے ہوں گے۔ لیکن کچھ لوگ اس کی پرواہ نہیں کریں گے۔

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَّالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَبَیْنَھُمَا مُشْتَبِھَاتٌ لَا یَعْلَمُھُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ۔"[2]

D: "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی اور ان دونوں کے درمیان جو چیزیں مشتبہ ہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے۔"

یہ بات ذہن نشین رکھی جائے کہ ہر غذا کی تاثیر ہوتی ہے۔ حرام سے جو گوشت پوست اور خون تیار ہوتا ہے۔ اس میں وہ ساری برائیاں پیوست ہوتی ہیں جو کھانے

q مشکوٰۃ: ص ۲۴۱ w مشکوٰۃ: ص ۲۴۱

والوں کو نیکی کے کام پر آمادہ نہیں ہونے دیتی اور ایسے ہی لوگ ملک وملت میں فتنہ و فساد کو جنم دیتے ہیں اور ملک کا امن وامان اور سکون واطمینان برباد کرتے ہیں اور ان کی ہی وجہ سے قتل اور خوں ریزی، چوری، ڈکیتی عام ہوتی ہے اور ملک تباہی و بربادی کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے اور پبلک آرام کی نیند نہیں سو پاتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسے لوگ جہنم کے ایندھن بنیں گے۔

"عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ جَسَدٌ غُذِیَ بِالْحَرَامِ۔[1]"

D: ''حضرت ابوبکر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس جسم کی پرورش حرام غذا سے ہوئی ہے وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''

فقہاء کرام نے حلال کی تعریف کی ہے:

"اَلْحَلَالُ فِی الشَّرْعِ مَا اَبَاحَہُ الْکِتَابُ وَالسُّنَّۃُ اَیْ مَا اَبَاحَہُ اللّٰہُ وَضِدُّہُ الْحَرَامُ۔[2]"

D: ''شریعت میں حلال وہ ہے جسے اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت نے مباح قرار دیا ہے یعنی جس کی حلت اللہ کی طرف سے ثابت ہے، حلال کے مقابل حرام ہے۔''

حرام کی تعریف میں فرمایا:

"اَلْحَرَامُ ضِدُّ الْحَلَالِ قَالَ الرَّاغِبُ اَلْحَرَامُ الْمَمْنُوْعُ مِنْہُ۔[1]"

D: ''حرام وہ ہے جو حلال کے مخالف ہو اور امام راغب نے کہا حرام وہ ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔''

مباح کے متعلق لکھا:

---

q مشکوٰۃ: ص ۲۴۳ w التعریفات الفقہیۃ

"اَلْمُبَاحُ هُوَمَا يَسْتَوِي طَرَفَاهُ يَعْنِي مَا لَيْسَ بِفِعْلِهٖ ثَوَابٌ وَلَا لِتَرْكِهٖ عِقَابٌ۔"[2]

D: "مباح کہتے ہیں جس کے دونوں طرف برابر ہوں۔ کہ جس کے کرنے پر نہ ثواب ہو اور جس کے چھوڑنے پر نہ کوئی سزا متعین ہو۔"

یہ اپنی جگہ درست ہے کہ یہ ساری کائنات انسانوں کے لئے پیدا ہوئی ہے اور انسانوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا پورا حق ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حلال و حرام کی تمیز اٹھا دی جائے اور جائز و ناجائز کی راہ چھوڑ دی جائے۔

"هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعاً وَسَخَّرَلَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰاتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا"

D: "وہ ذات باری ہی ہے جس نے دنیا کی ساری چیزیں تمہارے لئے پیدا فرمائیں اور آسمان و زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے تابع کر دیا۔"

پھر حرام میں کچھ اشیاء حرام لذاتہ ہیں اور کچھ حرام لغیرہ۔ کسی کی حرمت بڑھی ہوئی ہے کسی کی کم مگر حرام بہر حال حرام ہے، جس کی حرمت دلیل قطعی یقینی سے ثابت ہو اور اس میں کسی تاویل کا احتمال نہ ہو اس کا چھوڑ دینا فرض ہوتا ہے اور ایسے حرام کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، جس طرح فرض قطعی کا منکر کافر ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی حرام کو حرام سمجھ کر کرے گا وہ گنہ گار تو ہوگا مگر اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہوگا۔

موجودہ دور مادی دور ہے، روحانیت عنقاء ہے۔ لوگوں میں عقائد کی پختگی، معاملات کی صفائی اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگی ناپید ہوتی جا رہی ہے دوسری طرف خدا بیزاری کا فتنہ پورے عروج پر ہے اس لئے ضرورت ہے کہ دینی مسائل کی

q التعریفات الفقهية w التعریفات الفقهية

B

اشاعت پر توجہ دی جائے اور حرام وحلال کو بیان کیا جائے تا کہ یہ مسائل مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہیں۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مدارس دینیہ کا سلسلہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے اور ان سے بڑی تعداد میں علماء ومشائخ پیدا ہورہے ہیں اور ان کی تعلیم وتبلیغ سے برصغیر کا ہر خطہ معمور ہے اور عوام وخواص ان سے مستفید ہورہے ہیں۔

عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ حلال وحرام کے مسائل جو مختلف فقہ وفتاویٰ کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں ان کو یکجا کر کے اردو زبان میں ایک کتاب کی صورت میں شائع کردیا جائے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے برادر عزیز مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سلمہ کو کہ ان کی نظر اس طرف مبذول ہوئی اور انہوں نے محنت کر کے یہ قیمتی سرمایہ یکجا کردیا جن کی اس سے پہلے بھی کئی کتابیں شائع ہوکر مقبول عام ہوچکی ہیں۔ مولانا موصوف ماشاءاللہ نوجوان علماء کرام میں اپنی ایک امتیازی شان رکھتے ہیں اور انہیں فقہ وفتاویٰ سے کافی مناسب ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ کتاب ہر پہلو سے جامع ہے، زبان سلیس وشگفتہ ہے، مستند مراجع سے مستفاد ہے، مسائل واحکام کا بصیرت مندانہ انتخاب ہے اور ترتیب عمدہ ہے۔ امید ہے یہ کتاب شائع ہوکر امت کے لئے مفید ثابت ہوگی، اور مسلمانوں میں رہبری کا فریضہ ادا کرے گی۔

اس موقع سے ہمارا خوشگوار فرض ہے کہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد اور اس کے ناظم عزیز مکرم مولانا محمد رضوان القاسمی زید مجدہ کا شکریہ ادا کریں جن کے ایماء سے یہ مہتم بالشان کام انجام پایا اور جسے دارالعلوم سبیل السلام اپنے اخراجات سے شائع کر رہا ہے۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف وناشر کی اس گرانقدر خدمت کو قبول فرمائے

اور مسلمانوں کو اس کتاب کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

طالب دعا: محمد ظفیر الدین غفرلہ
مفتی دارالعلوم دیوبند
۸/ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ

%

C3

ابتدائیہ

راقم الحروف کو عرصہ سے خیال تھا کہ اردو میں ایک ایسی تحریر مرتب ہو جائے جس میں "کتاب الحظر والاباحۃ" کے عنوان سے فقہاء جن مسائل کو درج کرتے ہیں، ان میں سے بہ کثرت پیش آنے والے مسائل یکجا ہو جائیں۔ نیز اس بات کا بھی اہتمام ہو کہ روزمرہ کے معمولات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں اور پاک طریقے مستند کتابوں کے حوالوں کے ساتھ لکھ دیئے جائیں کہ مسلمان کی زندگی کا خلاصہ یہی اتباع سنت اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم کی پیروی ہے۔ مختلف مصروفیات کی وجہ سے کئی دفعہ جی میں آیا کہ اپنے بعض عزیزوں اور خصوصیت سے تخصص فی الفقہ کے کسی طالب علم سے یہ کام لیا جائے لیکن چونکہ ان حضرات کو دوسرے کاموں کے ساتھ اسے انجام دینا مشکل تھا اس لئے طے کیا کہ مختلف ابواب پر مختلف طلبہ سے کام کرایا جائے۔

ادھر ایک ایسا موقعہ نکل آیا کہ جس نے خود قلم اٹھانے کی ہمت دی۔ میرا معمول ہر سال رمضان المبارک میں تصنیفی، تالیفی کاموں کا ہے، رمضان میں جو کام باقی بچ رہتا ہے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے سال بھر میں مکمل کرتا ہوں اور اسی لئے ماہ مبارک میں کوئی سفر نہیں کرتا لیکن گزشتہ رمضان المباک میں حرمین شریفین کی زیارت کا موقع نکل آیا، یہ ایسی سعادت تھی کہ طبیعت اس سے محرومی پر آمادہ نہ تھی اور اس بات پر افسوس بھی تھا کہ امسال کوئی تصنیفی کام نہ ہو سکے گا۔ پہلے سے ارادہ نہ تھا کہ اسی رمضان میں "قاموس الفقہ" کے حصہ سوم کا کام کروں گا، اچانک ذہن میں یہ بات آئی کہ سفر میں قاموس الفقہ کا کام تو نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ خیال جو عرصہ سے دل و دماغ میں

پرورش پا رہا تھا شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے، چنانچہ دوتین دنوں کتابوں کی ورق گردانی کی اورضروری عبارتیں کچھ تو نوٹ کروالیں اور کچھ کی فوٹو اسٹیٹ اور دوران سفر ہی اس کام کوشروع کیا بلکہ دو یا تین ابواب قیام حجاز ہی کے درمیان لکھے گئے، تبرکاایک دوصفحہ مقام ابراہیم پر اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صفہ میں بھی لکھے گئے کہ شاید ان مقامات کی برکت وسعادت اس مردگنہ گار کی اس تحریر کے قبول کا باعث ہوجائے۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بعزيز۔

سفر کے درمیان خاصا کام ہوجاتا،لیکن اندازہ ہوا کہ مجھ جیسےمحرومان لذت ذکرو عبادت اورخوگران معصیت کوبھی وہاں پہنچ کر چوکھٹ یار پر جبین گناہ خم کرنے کےسوا کسی اور کام میں کم لطف آتا ہے، چنانچہ اواخر رمضان المبارک میں واپسی ہوئی اور کام بہت تھوڑا ہوا۔ پھر بعض اسفار اور مدرسہ کی انتظامی ذمہ داریوں کی وجہ سے اوائل ذیقعدہ تک مسودہ یونہی پڑا رہا، وسط ذوقعدہ سے ختم ذی الحجہ تک اس کام کو پورا کیا کہ آغاز سال ہونے کی وجہ سے ان دنوں تدریسی مصروفیات کم رہتی ہیں۔اب یہ تحریر جیسی کچھ مرتب ہوسکی قارئین کے سامنے ہے۔

میں نے اس تحریر میں کتاب وسنت کی نصوص اور فقہاء کی نصوص دونوں کوملحوظ رکھا ہےاوراس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ خدااوررسول کی ہدایات کوفقہاء کےاجتہادات اورشارحین کی تشریحات پر اولیت حاصل رہے۔کتب فقہ میں بہت سی ایسی جزئیات مل جاتی ہیں جوان کے زمانہ کی ضروریات یااس عہد کےسماجی یا اخلاقی حالات کے تحت لکھی گئی تھیں،موجودہ حالات میں اس کو جوں کا توں نقل کردینا بعض موقعوں پر اباحیت اور بعض صورتوں میں حرج وتنگی کا باعث ہوگا۔ان احکام کے مطابق فتویٰ دینا تو کجا،حق یہ ہے کہ عوام میں ان کا بیان کرنا بھی صحیح نہیں۔میں نے ایسے مسائل کونقل کرنے سے گریز کیا ہےاور ہر باب کےمنتخب ضروری اور کثیرالوقوع مسائل ذکر کئے ہیں۔

مسائل واحکام اورآداب کے ساتھ قرآن وحدیث سے اس کا ماخذ بھی نقل کردیا ہے اور فضائل ورذائل بھی بیان کردیئے گئے ہیں تاکہ یہ تحریر صرف تحقیق نہ ہو بلکہ دعوت وتذکیر بھی ہو، جہاں ضرورت محسوس ہوئی حکمت ومصلحت بھی واضح کردی گئی ہے اور ہر باب کے شروع میں اس باب سے متعلق اسلام کی اصولی ہدایات اور شریعت کے عمومی مزاج ومذاق پر بھی اختصار کے ساتھ روشنی ڈال دی گئی ہے، نیز ہر باب سے متعلق معلومات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے نقل کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ بات مستنداور معتبر ماخذ سے لی جائے اوران کی صراحت کے ساتھ ذکر کی جائے۔زبان سہل اور عام فہم ہواور فقہ وقانون کی خشکی کے ساتھ دعوت و نصح کی حلاوت بھی قارئین کے لئے سامان لذت بنے۔

کتاب کے بعض حصے میری دوسری کتابوں قاموس الفقہ ، جدید فقہی مسائل، طلاق وتفریق، کے بعض مضامین کی تلخیص پر مشتمل ہے۔میرا ایک کتابچہ جو''مزدور کے حقوق'' سے متعلق تھااور جس کے مختلف حصے جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں لوگوں نے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کئے تھے،تھوڑی تبدیلی اور حذف واضافہ کے ساتھ قریب قریب مکمل اس کتاب میں آگیا ہے۔

بہت سے مقامات پر میں نے حافظہ سے حوالہ جات لکھ دیئے تھے،بعض مواقع پر کتب حدیث سے براہ راست مراجعت کرنے کی بجائے مشکوٰۃ شریف کے ذریعہ بالواسطہ حوالہ دے دیا تھا،ان حوالہ جات کی تخریج میں طلبۂ تخصص عزیزان مولوی کمال الدین قاسمی مولوی محمد ابراہیم صدیقی سبیلی ،مولوی حبیب الرحمٰن قاسمی ،مولوی مجیب الرحمان قاسمی مولوی عبداللہ حامد رشادی اور بالخصوص مولوی اشرف علی قاسمی (**زادھم اللّٰہ علماً و توفیقاً**) نے بڑا تعاون کیا ہے، چوں کہ عجلت کی وجہ سے مطالعہ،مواد کی یکجائی اور پھر تسوید وتبییض کا موقعہ نہیں تھا اس لئے ایک ہی دفعہ کتابوں کو سامنے رکھ کر املاء کرایا گیا اور وہی کاتب کے حوالہ کیا گیا، اس سلسلہ میں بھی عزیز القدر مولوی

اشرف علی سلمہ، استاذ دارالعلوم سبیل السلام نے بڑی مدد کی اور کتاب کے اکثر حصے انہی کے ذریعہ لکھائے گئے۔ سفر کے درمیان جو کچھ لکھا گیا تھا، عجلت میں لکھنے اور تحریر کے صاف نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تبییض ضروری تھی، عزیز مولوی احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی سلمہ استاذ دارالعلوم سبیل السلام نے پوری سعادت مندی کے ساتھ اس کی تبییض کا کام کیا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام عزیزوں کو علم نافع عمل صالح اور توفیق سے حظ وافر عطا فرمائے اور اپنے دین اور علم دین کی خدمت کے لئے قبول کرے۔" واللّٰہ المستعان"

دارالعلوم سبیل السلام میں بحمد اللہ متعدد اصحاب علم اور اصحاب ذوق کا اجتماع ہے اور علمی اور فقہی مسائل پر باہمی تبادلۂ خیال کا سلسلہ بھی ہے، راقم الحروف کا معمول بھی ہے کہ جب بھی کوئی اہم چیز لکھی تو یا تو اس کی اجتماعی خواندگی کر لی یا ان حضرات کے حوالہ کر دیا کہ نظر ثانی ہو جائے، پیش نظر کتاب چوں کہ بڑی عجلت میں مرتب ہوئی اس لئے کئی آدمیوں کی نظر سے نہ گزر سکی، لیکن مدرسہ کے ایک ممتاز استاذ حدیث وفقہ صدر شعبۂ تخصیص فی الدعوۃ اور زبان و ادب کے مزاج شناس حضرت مولانا محمد مصطفیٰ صاحب مفتاحی کے حوالہ کیا کہ وہ اس پر نظر ثانی کر دیں، موصوف نے بحمد اللہ بالاستیعاب اور بنظر غائر دیکھا۔ ایک دو جگہ بعض ضروری مسائل کے اضافہ کی رہنمائی بھی فرمائی، راقم سطور تہ دل سے ان کا ممنون ہے۔

اس موقعہ پر ناسپاسی ہوگی اگر حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب ناظم دارالعلوم سبیل السلام کا شکریہ نہ ادا کروں جن کی علم پروری اور علمی کاموں کی حوصلہ افزائی نیز اہل علم کے ساتھ سیر چشمی اور التفات خاص ہی کی وجہ سے اس "دارالعلوم" میں جس کی عمر زیادہ نہیں اور وسائل محدود ہیں، بہت کچھ کام ہو رہا ہے۔" حفظہ اللّٰہ وجزاہ عنا خیر الجزاء" مولانا موصوف ہی کی خواہش پر یہ کتاب اس وقت دارالعلوم سبیل السلام سے شائع بھی ہو رہی ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقعہ پر اپنے بزرگ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کی عنایت فرمائی کا ذکر نہ کروں جن کی شفقت و محبت ہمیشہ شریک حال رہی ہے۔موصوف گرامی نے اپنے بیش قیمت پیش لفظ کے ذریعہ اس حقیر تالیف کی قدر افزائی فرمائی ہے۔"متعنا اللّٰہ بطول بقاءہ"

اس کتاب کی ترتیب سے میرا مقصد خاص مسلمانوں کے سماج میں اسلامی تہذیب وتمدن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور سنن مبارکہ کا احترام اور محبت پیدا کرنا اور اس پر عمل کی دعوت وترغیب ہے۔اگر واقعی اس کتاب سے کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچے اور دو چار سنتیں بھی دو چار مسلمانوں کی زندگی میں آ جائیں تو یہی ہماری محنت کا ثمرہ، ہماری کوششوں کا حاصل اور آخرت میں ہمارے لئے شعاع امید ہے۔"وباللّٰہ التوفیق"

خالد سیف اللہ رحمانی

(صدر مدرس دارالعلوم سبیل السلام)

بیت العلم کوتہ پیٹ، حیدرآباد دکن

۱۴/محرم الحرام ۱۴۱۳ھ

%

پہلا باب

شریعت کے بنیادی اصول وقواعد

اسلامی شریعت اور اسلامی قانون کی بسم اللہ ہی اس امر سے ہوتی ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا رب، اس کا پروردگار، روزی رساں اور مالک ہے، وہی اس کا حاکم بھی ہے، قانون قدرت تمام تر اس کے احکام کی تعمیل سے عبارت ہے۔ مہر و ماہ کی گردش، بادلوں کی حرکت، سمندر کا بہاؤ، موسموں کا تغیر، زمین کا نشیب وفراز، پہاڑوں کا جماؤ، یہ سب کا سب اضطراری طور پر حکم خداوندی کی تعمیل اور مشیت الٰہی کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد کے لئے انسان کو بھی دنیا میں بھیجا لیکن چونکہ اس کا امتحان بھی مقصود تھا اس لئے ارادہ واختیار کی قوت بھی اس کے سپرد کی کیوں کر یہ اپنی قوت ارادی کا صحیح استعمال کر کے خدا کی مرضیات پر ثابت قدم رہتا ہے اور شریعت کی ممنوعات سے اپنے دامن عمل کو بچاتا اور محفوظ رکھتا ہے لیکن فرضی منصبی اس کا بہر حال یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی نظم کائنات کے ساتھ جوڑ دے اور اس راہ کو اختیار کرے جو اس کے رب کی خوشنودی کا ذریعہ ہو۔ "ان الحکم الا للّٰہ۔"[1]

"الا لہ الحکم۔"[2]

حکم خداوندی کے مطابق فیصلہ نہ ہو تو کہیں اس کو کفر[3] کہیں فسق[4] اور کہیں ظلم[5] قرار دیا گیا اور حکم و فیصلہ اور حلال وحرام کرنے میں کسی اور کے شریک و سہیم بنانے کو شرک

q الانعام، آیت: ۵۷ w الانعام، آیت: ۶۲ e مائدہ، آیت: ۴۴
r مائدہ، آیت: ۴۷ t مائدہ، آیت: ۴۵

کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔1 یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے علماء اور فقہاء کے اقوال کو حکم خداوندی کا درجہ دے رکھا تھا، اور حرام وحلال کی کلید ان کے حوالے کر دی تھی، قرآن نے اسے احبار و رہبان کو رب قرار دینے کے مرادف قرار دیا۔

﴿ ¨ © ª « ¬ ® ¯﴾ 2

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض چیزیں اپنے اوپر عملی طور پر ممنوع کر لی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، اور ارشاد ہوا:

﴿# $% & ')(﴾ 3

اس لئے جس طرح کسی حرام کو حلال اور جائز کو ناجائز قرار دینا بددینی اور گمراہی ہے۔ اسی طرح کسی حلال کو بطور خود حرام کر لینا بدعت اور اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اختیارات میں دست اندازی ہے اور گناہ و معصیت ہونے میں اصولی اعتبار سے دونوں ہی ہم درجہ ہیں۔

حرام ـــــ فقہاء کی اصطلاح میں

حرام کے معنی روکنے کے ہیں ''حریم'' اس احاطہ کو کہتے ہیں جو کنویں میں کسی چیز کو گرنے سے روکے ـــــ فقہ کی اصطلاح میں ان باتوں کو کہتے ہیں جن کے ارتکاب سے منع کر دیا گیا ہو، اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے مختلف اہل علم نے جو تعبیریں اختیار کی ہیں ان میں معمولی سا تفاوت پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے چست اور جامع تعبیر غالباً وہ ہے جو آمدی نے اختیار کیا ہے۔

''ما ینتهض منه سبباً للذم شرعاً بوجه ما من حیث هو فعل له''

D: ''جو بحیثیت اپنے فعل ہونے کے کسی بھی طرح شرعاً مذمت کا باعث ہو۔''

q کہف، آیت: ۲۹ w توبہ، آیت: ۳۱ e سورۂ تحریم، آیت: ۱

"ما ینتهض سبباً للذم شرعاً" (جو شرعاً مذمت کا باعث ہو) کی قید نے واجبات و مستحبات کو حرام کے دائرہ سے نکال دیا کہ وہ شریعت کی نگاہ میں قابل مدح ہیں نہ کہ قابل مذمت۔

"بوجہٍ ما" (کسی صورت مذموم) ہوگی۔ تعبیر سے مباحات کو مستثنیٰ کرنا مقصود ہے کہ مباحات کا ارتکاب بعض صورتوں میں ضرور قابل مذمت ہوتا ہے، لیکن ہمیشہ نہیں، حرام بہر طور پر مذموم ہوتا ہے۔

"مِنْ حَیث ھو فعل له" (حیثیت اپنے فعل ہونے کے مذموم ہو) اس کا مقصد یہ ہے کہ کبھی ایک مباح کسی واجب کے ترک کرنے کو مستلزم ہوتا ہے، وہ اس حیثیت سے ضرور مذموم ہوتا ہے، فی نفسہٖ مذموم نہیں ہوتا ہے جب کہ حرام کا ارتکاب فی نفسہٖ مذموم ہوتا ہے۔[1]

امام رازی کا بیان ہے کہ حرام کے لئے چار اصطلاحیں ہیں، حرام (محرم) محظور، معصیت اور ذنب۔[2]

حرام کے لئے کتاب وسنت کی تعبیرات

مختلف اسالیب اور تعبیرات ہیں کہ نصوص میں ان کا استعمال حرمت کو بتلاتا ہے، اور وہ یہ ہیں:

1 نہی اور ممانعت کا صیغہ، جیسے ارشاد خداوندی ہے:

﴿½ ¾ ﻧ À Á Â﴾ [3]

یا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا یَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ"[4]

2 حرام اور حرام سے نکلنے والے الفاظ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

q الاحکام فی اصول الاحکام: ۱/۱۵۶ w المحصول فی علم الاصول: ۱/۱۹

e آل عمران، آیت: ۱۳۰

﴿ ! " # ﴾ 2

3 حلال اور جائز نہ ہونے کی صراحت، جیسے ارشاد خداوندی ہے:

﴿ î ¡ ¢ £ ¤ ¥ ¦ § ﴾ 3

4 کسی فعل پر حد شرعی مقرر کی گئی ہو، مثلاً:

﴿ / 0 1 2 ﴾ 4

5 کسی فعل پر کفارہ واجب قرار دیا گیا ہو۔

6 کسی فعل پر عذاب اخروی کی دھمکی دی گئی ہو۔

7 کسی فعل پر ایمان کی نفی کی گئی ہو۔

8 کسی فعل کو گناہ قرار دیا گیا ہو۔

9 کوئی بھی ایسی تعبیر کی گئی ہو جو ممانعت اور اجتناب کو بتاتی ہو جیسے " ﮟ

À Á۔" 5

0 صیغۂ نہی کے بجائے صراحۃً نہی کا لفظ استعمال ہوا ہو، مثلاً: "نَهٰى اللّٰهُ، نَهٰى الرَّسُوْلُ، ینھٰو" وغیرہ۔

البتہ بعض اوقات نہی کا صیغہ، نہی کا لفظ، اجتناب و ممانعت کو بتلانے والی تعبیر یا کسی فعل کو گناہ قرار دینے کی عبارت کا مقصود حرمت کی بجائے "کراہت" کا اظہار ہوتا ہے، جس کا اندازہ قرائن، ممانعت کے اسباب اور شریعت کے مجموعی مزاج سے کیا جاتا ہے، گو کہ امر اصل میں کسی بات کو واجب قرار دینے کے لئے ہے۔ کہیں مباحات اور مستحبات کو بھی امر کے صیغہ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

حرام اور مکروہ

q مسلم w مائدہ، آیت: ۳ e بقرہ، آیت: ۲۲۹
r مائدہ، آیت: ۳۸ t حج، آیت: ۳۰

حرام سے قریب ایک اور لفظ ''مکروہ'' ہے۔ جن چیزوں کی ممانعت پر دلیل قطعی موجود ہوتی ہے۔ ان کے لئے فقہاء صریحاً لفظ حرام کا استعمال کرتے ہیں۔ جن چیزوں کی ممانعت پر کوئی نص قطعی موجود نہیں ہوتی ہے ان کو ازراہ احتیاط حرام کے بجائے مکروہ کہہ دیا کرتے ہیں[1] گویا کہ مکروہ کا درجہ حرام کے مقابلہ میں ویسا ہی ہے جیسے فرض کے مقابلہ میں واجب، جیسے واجب قریب بہ فرض ہوتا ہے اور اس کا ترک باعث گناہ، البتہ یہ حکم مکروہ تحریمی کا ہے اور فقہاء جہاں مطلق مکروہ بولتے ہیں وہاں یہی مکروہ تحریمی مقصود ہوتا ہے، گویا جو بات خلاف مستحب اور خلاف اولیٰ ہو وہ فقہاء کی زبان میں مکروہ تنزیہی ہے۔[2]

کچھ ضروری اصول وقواعد

کچھ چیزیں تو ایسی ہیں کہ شریعت میں ان کے حلال یا حرام ہونے کی صراحت موجود ہے لیکن انسانی زندگی میں پیش آنے والے بہت سے حالات و واقعات اور معاملات وہ ہیں کہ کتاب وسنت میں ان کے بارے میں صریح حکم موجود نہیں بلکہ ایسے اصول وقواعد کی طرف رہنمائی کر دی گئی ہے کہ ان کو سامنے رکھ کر پیش آمدہ واقعات اور نو پید مسائل کے بارے میں حلال یا حرام ہونے کا حکم متعین کیا جا سکتا ہے اور یہ فطری بات ہے کہ ایک ایسا دین جس کو قیامت تک کے لئے باقی رہنا تھا وہ صرف جزوی واقعات اور ان کی تفصیلات پر مشتمل نہیں ہوسکتا، ان کا احاطہ دشوار بھی ہے اور اکثر اوقات مستقبل میں پیش آنے والے جزئی واقعات کا اظہار انسان کی عقل کوتاہ کے لئے نامناسب بھی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ایک ایسے دین میں بنیادی خطوط، مقاصد اور شریعت کے مزاج و مذاق کی بنیادوں کو اس طرح واضح کر دیا جائے کہ ہر دور

---

[1] ردالمحتار: ۲۱۶/۵

[2] درمختار علی ھامش الرد: ۲۱۶/۵، کتاب الخطر والاباحۃ

میں پیش آنے والے مسائل کو ان پر منطبق کیا جاسکے اوران رہنما اصولوں کو فیصلوں کی بنیاد واساس بنایا جاسکے۔

قرآن وحدیث میں ایسے بے شمار اصول وقواعد موجود ہیں۔بعض جگہ ان کی صراحت کردی گئی ہے اور بعض جگہ اہل علم نے اجتہاد واستنباط کے ذریعہ ان کو دریافت کیا ہے—— حلال وحرام کے سلسلہ میں بھی فقہاء کے یہاں بعض قواعد ملتے ہیں جو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔مناسب ہوگا کہ ان میں سے بعض اہم اور ضروری قواعد کا ذکر کردیا جائے۔

1 چیزیں اصلاً مباح وحلال ہیں

قرآن مجید میں متعدد مواقع پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ خدا نے اس کائنات کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انسان کا مقصود خدا کی بندگی اور عبادت ہے اسی طرح کائنات کا مقصد انسان کی خدمت اور راحت ہے، دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں کہ انسان ان سے بغیر اس کے فائدہ نہیں اٹھا سکتا کہ وہ اس کے لئے مباح ہوں، اسی لئے فقہاء کا خیال ہے کہ اشیاء میں اصل مباح اور جائز ہونا ہے۔

"الاصل فی الاشیاء الاباحة۔"[2]

کسی شئی کے ناجائز اور حرام ہونے پر جب تک کوئی دلیل نہ آجائے اس کو مباح ہی سمجھا جائے گا۔امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تو یہ رائے ہے ہی، محققین مثلاً امام کرخی اور صاحب ہدایہ رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے۔[3]

اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے جن چیزوں کو اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے وہ حلال ہیں، جن

q بقرہ، آیت: ۲۹ w الاشباہ للسیوطی: ص ۱۳۳

e الاشباہ لابن نجیم: ص ۶۶

اشیاء کو حرام قرار دیا وہ حرام ہیں، کچھ اشیاء ہیں کہ ان کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے، وہ ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سلسلہ میں درگزر سے کام لیا ہے۔[1] گویا جن امور کی بابت کتاب وسنت خاموش ہے وہ مباح ہیں۔

نو پید مسائل میں خصوصیت کے ساتھ اس قاعدہ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ایسے جانور جن کی حلت وحرمت کی قرآن وحدیث میں صراحت نہ ہو اور نہ کتاب و سنت کے بیان کئے ہوئے کسی اصول کے تحت وہ آتے ہوں، حلال سمجھے جائیں گے۔ یہی حکم اس قسم کے پودوں اور پھلوں کا بھی ہوگا[2] موجودہ زمانہ کی ایجادات و اختراعات اور آلات واکتشافات کے احکام پر اس قاعدہ کو خصوصیت کے ساتھ منطبق کیا جا سکتا ہے۔

2 عصمت انسانی میں اصل حرمت ہے

انسانی عصمت وعفت اور عزت وآبرو کا مسئلہ چوں کہ نہایت نازک ہے اس لئے فقہاء نے ایک استثنائی قاعدہ یہ مقرر کیا ہے کہ عصمت کے معاملہ میں اصل حرمت ہے "الاصل فی الابضاء التحریم"[3] مثلاً ایک شخص کی کئی بیویاں ہیں۔ اس نے ان میں سے ایک کو طلاق دے دی لیکن کون سی بیوی مطلقہ ہے؟ یہ یاد نہیں رہا تو جب تک اس مطلقہ کی تعیین نہ کرلے وہ سب اس پر حرام ہوں گی، اسی طرح بلا تعیین کسی ایک کو طلاق دے دی تو جب تک اس خاص عورت کی تعیین نہ کردے، ان عورتوں میں سے کسی سے بھی مقاربت جائز نہ ہوگی۔

مگر یہ اس وقت ہے کہ حرمت ثابت ہو، محض حرمت کا شک ہو تو صرف شک کی وجہ سے حرمت ثابت نہ ہوگی، جیسے ایک عورت نے اپنے پستان بچہ کے منہ میں رکھا مگر دودھ کا نکلنا مشکوک ہے اور اس عورت کا خیال ہے کہ دودھ نہیں نکلا ہے تو محض شک کی

---

[1] ترمذی باب ماجاء فی لبس الفراء ابن ماجہ، باب اکل الجبن والسمن
[2] الاشباہ للسیوطی: ص ۱۳۶ [3] الاشباہ لابن نجیم: ص ۶۷

وجہ سے دودھ والی حرمت (حرمت رضاعت) ثابت نہ ہوگی[1]

3 مجبوری ناجائز کو جائز کر دیتی ہے

حرام وحلال سے متعلق فقہاء نے جو قواعد مقرر کئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اعذار اور مجبوریوں کی وجہ سے ناجائز اور حرام حلال ہو جاتا ہے: "الضرورات تبیح المحظورات"[2] اس قاعدہ کی بنیاد قرآن وحدیث دونوں میں موجود ہے۔ قرآن نے اضطرار کی حالت میں مردار اور خنزیر وغیرہ کے استعمال کی اجازت دی ہے بہ شرطیکہ صرف اتنا کھائے کہ رمق حیات باقی رہے[3] حدیث میں ہے کہ نہ نقصان اٹھایا جائے اور نہ پہنچایا جائے "لا ضرر ولا ضرار"[4] ضرورت انسانی اور ہنگامی وغیر معمولی حالات کا تقاضا بھی ہے، اسی لئے فقہاء کے ہاں اس کو احکام کی تطبیق وتشریح کے لئے ایک مستقل اصل مانا گیا ہے۔

مشہور شافعی عالم علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر احتیاطی شرط کا بھی اضافہ کیا ہے کہ وہ ضرورت اس ناجائز فعل سے کم درجہ کی نہ ہو مثلاً اگر کسی شخص کو دوسرے شخص کے قتل کرنے یا کسی عورت سے زنا کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس کے لئے دوسرے کا قتل یا زنا جائز نہ ہوگا کہ اپنی جان جانے کا اندیشہ دوسرے کے قتل یا زنا سے کم تر بات ہے[5]

ہماری فقہ کی کتابوں میں سیکڑوں احکام ہیں جو اسی قاعدہ پر مبنی ہیں، مثلاً حلق میں لقمہ اٹک جائے اور شراب کے سوا کوئی سیال چیز نہ ہو جس کے ذریعہ لقمہ حلق سے اتارا

---

1. الاشباہ لابن نجیم: ص ۹۷ — 2. الاشباہ والنظائر لابن نجیم: ص ۸۵
3. سورہ بقرہ، آیت: ۱۷۳
4. سیوطی نے مؤطا امام مالک، بیہقی مستدرک، حاکم اور دار قطنی کے حوالہ سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ابن ماجہ کے حوالہ سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ الاشباہ والنظائر: ص ۱۷۳
5. الاشباہ للسیوطی: ۱۷۳، ۱۷۴

جا سکے تو شراب کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جان بچانے کے لئے زبان سے کلمہ کفر کا تلفظ کرسکتا ہے۔[1] بھوک سے جان جانے کی نوبت ہو اور رفیق سفر کے پاس کھانا موجود ہو تو بلا اجازت اس کا کھانا کھا سکتا ہے۔[2] صرف ریشمی کپڑا ہی ہو، کوئی اور کپڑا موجود نہیں ہو تو بے لباس رہنے، یا اس طرح نماز پڑھنے کے بجائے یہی کپڑا پہن لے۔[3]

حرام وناپاک اشیاء کے بطور علاج جائز ہونے کا مسئلہ بھی اسی قاعدہ سے متعلق ہے۔

جو مجبوریاں ناجائز کو وقتی طور پر جائز کر دیتی ہیں وہ یا تو ایسی ہوں کہ ان سے چارہ نہ ہو، مثلاً ان کے بغیر ہلاکت کا اندیشہ ہو یا ایسی ہوں کہ ان کی رعایت نہ کی جائے تو شدید مشقت اور دشواری پیدا ہو جائے پہلی صورت کو اصطلاح میں ''ضرورت'' اور دوسری صورت کو ''حاجت'' کہا جاتا ہے۔[4] اسی لئے فقہاء کے یہاں قاعدہ ہے کہ حاجت کا بھی وہی حکم ہوتا ہے جو ضرورت کا۔ ''الحاجة تنزل منزلة الضرورة۔''[5]

اس قاعدہ کے ساتھ بنیادی شرط یہ ہے کہ ضرورت کے بہ قدر ہی ایسی ناجائز باتیں جائز رہیں گی۔ مثلاً ڈاکٹر نے کسی اجنبی عورت کو علاج کی غرض سے دیکھا تو اتنا ہی حصہ کھولے جتنا ناگزیر ہے، اس سے زیادہ نہ کھولے اور پورا جسم چھپائے رکھے۔[6]

4 حرمت وحلت میں احتیاط

شریعت میں حلال وحرام کے باب میں خاص حزم و احتیاط برتی گئی ہے اور جہاں حلال وحرام دونوں پہلو جمع ہو جائیں وہاں حرام ہونے کو ترجیح دی گئی ہے۔ ''ما اجتمع الحلال والحرام الا غلب الحرام الحلال۔''[7]

بعض حضرات نے اسی مضمون کی ایک روایت خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

q الاشباہ للسیوطی: ص ۱۲۳، ۱۲۴ w عالمگیری: ۲۳۸/۵

e تاتارخانیہ: ۴۱۸/۱ r الاشباہ للسیوطی: ص ۱۲۶

t الاشباہ لابن نجیم: ص ۹۱ y الاشباہ للسیوط: ص ۱۲۵

سے نقل کی ہے۔ لیکن علامہ عراقی نے اس کو بے اصل قرار دیا ہے صحیح یہ ہے کہ یہ افقہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے [2] اور اتنی ہی بات اس کی ہمیت و اعتبار کے لئے کافی تھی لیکن اس کے علاوہ دین کا مزاج و مذاق بھی اس کی تائید میں ہے۔

فقہاء کے اس قاعدہ پر اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روشنی پڑتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال وحرام تو کھلا ہوا ہے اور اس کے درمیان ایسی چیزیں ہیں جن کی حلت وحرمت مشکوک ہے [3] پس ان مشتبہات سے بھی بچنا ضروری ہے کہ جو شخص کھیت کی آر پر جانور چرائے گا اس کا جانور کھیت میں اتر سکتا ہے، جو مشکوک اور مشتبہ چیزوں سے نہ بچے وہ حرام کا بھی مرتکب ہوسکتا ہے۔

دو حلال وحرام جانور کے اختلاط سے جو بچہ پیدا ہو، اس کو احتیاطاً حرام ہی سمجھا جائے گا۔ شکار پر تیر پھینکا گیا اور وہ پہلے پہاڑ پر اور پھر اس سے زمین پر گرا تو احتمال اس کا بھی ہے کہ موت تیر سے واقع ہوئی ہو، ایسی صورت میں اسے حلال ہونا چاہئے۔ امکان یہ بھی ہے کہ پہاڑ سے گرنا موت کا باعث بنا ہو، اگر ایسا ہو تو شکار حرام ہوگا، فقہاء نے دونوں احتمالات میں حرمت کے پہلو کو ترجیح دیا اور ایسے شکار کو حرام کے زمرہ میں رکھا۔ چھری مسلمان کے ہاتھ میں ہو اور کوئی مشرک اس کا ہاتھ تھام کر جانور کے حلقوم پر چلائے تو ذبح میں اس مشرک کی شرکت کی وجہ سے احتیاطاً اسے حرام ہی قرار دیا جائے گا [4] اس طرح کے بہت سے مسائل ہیں جن کی بنیاد اسی قاعدہ پر ہے۔

5 ذرائع حرام کا سد باب

اگر کسی بات سے منع کرنا اور روکنا مقصود ہو تو فطری بات ہے کہ ان اسباب و ذرائع کو بھی منع کرنا ہوگا جو اس ممنوع بات کا ذریعہ بنتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی شان میں

q الاشباہ لابن نجیم: ص ۱ تا ۹
w الاشباہ لابن نجیم: ص ۱ تا ۹
e الاشباہ للسیوطی: ص ۲۰۹
r الاشباہ لابن نجیم: ص ۱۱۰

گستاخی بری بات ہے۔ معبودان باطل کی مذمت کی جائے تو ضرور ہے کہ خدا شناس کفار خود خدائے برحق کی شان میں گستاخی کریں گے۔ اسی لئے قرآن پاک نے معبودان باطل کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا[1]

زنا سے روکنا مقصود ہے۔ لیکن زنا کے سدباب کے لئے اجنبی مرد و عورت کی خلوت، نیز بے پردگی کو بھی منع فرمایا۔ اصل ممانعت شراب یا سود کی ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ذرائع کو بھی حقدار لعنت ٹھہرایا جن کے ذریعہ شراب نوشی یا سود خوری کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو اور اس میں مدد ملتی ہو ـــــ فقہاء کی زبان میں کسی فساد کو روکنے کے لئے اس کے ذرائع اور اسباب کے منع کر دینے کو ''سد ذریعہ'' کہا جاتا ہے جو بظاہر جائز و مباح ہوتے ہیں لیکن ایسے نتائج تک پہنچاتے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں۔[2]

تاہم سوال یہ ہے کہ کس درجہ کا ذریعہ ممنوع ہوگا اور کس درجہ کا ممنوع نہیں ہوگا؟ کیونکہ ذریعہ بعید اور واسطہ در واسطہ ذرائع بھی ممنوع قرار دیئے جائیں تو بڑی دقت اور مشکلات پیدا ہو جائیں گی ـــــ علماء اصول نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ذریعہ کے چار درجات ہیں:

1 اس ''ذریعہ'' کا فساد کا سبب بننا یقینی ہو ـــــ ایسے ذرائع بالاتفاق ممنوع ہوں گے۔ اگر یہ ذرائع خود بھی ممنوع ہوں تب تو ظاہر ہے کہ ممانعت کے دوسرے اسباب بھی موجود ہیں۔ ورنہ ممنوع کا ذریعہ بننا بجائے خود اس کی ممانعت کے لئے کافی ہے۔

2 جس کا فساد کا سبب بننا یقینی تو نہ ہو لیکن اس کا غالب گمان ہو، اس صورت کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی صورت کا ہے کیوں کہ عملی احکام میں غالب گمان بھی ''یقین'' کے درجہ میں ہے۔

---

q الانعام، آیت: ۱۰۸

w دیکھئے: الموافقات: ۴/۱۹۸، و اعلام الموقعین: ۳/۱۳۶ مابعدہ

3 جو شاذ و نادر کسی مفسدہ کا سبب بن جاتا ہو —— ایسے ذرائع معتبر نہیں ہیں اور ان پر ممانعت کا حکم نہیں لگے گا۔ یہ تینوں صورتیں متفق علیہ ہیں۔

4 جو کام بکثرت فساد کا ذریعہ بنتا ہو لیکن اکثر نہیں یعنی جو دوسرے اور تیسرے درجہ کے درمیان ہو —— یہاں دو اصل متعارض ہیں، ایک پہلو یہ ہے کہ شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ جائز ہو۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ بکثرت مفاسد کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کو ممنوع ہونا چاہئے تھا۔ احناف و شوافع نے پہلی اصل کو پیش نظر رکھا اور اس درجہ کے ذریعہ کو ممانعت کے لئے کافی نہیں مانا۔ مالکیہ نے دوسری اصل کو سامنے رکھا اور اس ذریعہ کو بھی ممنوع قرار دیا —— مثلاً ایک مہینہ کی مہلت پر کوئی چیز دس درہم میں فروخت کی اور پھر اسی سامان کو مکمل ہونے سے پہلے پانچ درہم میں خرید کر لیا، پس بیچنے والے نے اپنا سامان جوں کا توں واپس لیا۔ پانچ درہم دیئے اور دس درہم حاصل کئے۔ اس طرح یہ بالواسطہ ربا کا ذریعہ بن گیا —— امام ابواسحاق شاطبی کا بیان ہے کہ اسی اصولی اختلاف کے پیش نظر احناف اور شوافع نے اس نام نہاد بیع کی اجازت دی اور مالکیہ نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے۔[1]

مالکیہ کا نقطۂ نظر ہے کہ صورت واقعہ اصل نہیں ہے۔ اصل قابل توجہ بات اس سے پیدا ہونے والے نتائج اور صاحب معاملہ کے مقاصد ہیں۔ دوسرے ایک طرف اذن شرعی ہے اور دوسری طرف ایک انسان کو دوسرے انسان کے ضرر سے بچانا ہے اور یہ دوسری مصلحت اس پر مرتب ہونے والے مفاسد کے اعتبا سے زیادہ قوی ہے۔ تیسرے صحیح روایات بہت سی ایسی باتوں کی حرمت پر شاہد ہیں جو اصلاً جائز ہیں، لیکن بہ کثرت مفاسد کا ذریعہ بننے کی وجہ سے ممنوع قرار دی گئی ہیں جیسے اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی، غیر محرم کے ساتھ عورت کا سفر، قبروں پر مساجد کی تعمیر اور خرید و فروخت

q حقیقت یہ ہے کہ احناف بھی اس قسم کی بیع کو ناجائز ہی کہتے ہیں۔ دیکھئے ھدایہ: ۴۱/۳

کے معاملہ کے ساتھ قرض کو متعلق کرنا[1] اس لئے اس درجہ کا ذریعہ بھی معتبر ہے اور میرے خیال میں یہی صحیح ہے۔

6 معصیت میں تعاون

سد ذریعہ کا جو اصول اوپر ذکر کیا گیا اسی سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ گناہ کے کاموں میں اعانت کا کیا حکم ہوگا؟ اس قاعدہ کے تحت معصیت میں تعاون کو مطلقاً معصیت ہونا چاہئے کہ یہ " Ä ÆÅ Ç È É"[2] گناہ اور ظلم پر تعاون نہ کرو—— کے خلاف ہے لیکن سوال یہ ہے کہ گناہ کا بعید ترین تعاون بھی ممنوع ہو تو خصوصیت سے معاملات کے باب میں اتنی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی کہ خلق خدا سخت تنگی میں مبتلا ہو جائے گی اور شریعت کا مزاج یہ ہے کہ وہ انسان کے لئے سامان حروج و تنگی نہیں بلکہ باعث سکون و سہولت ہے—— ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے تعاون کی بعض صورتوں کو ممنوع اور بعض صورتوں کو جائز قرار دیا ہے۔

اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات اور قیاسات میں خاصا اختلاف بھی ہے اور تعارض بھی۔ فقہاء کی مختلف جزئیات اور بعض تصریحات کو سامنے رکھ کر خیال ہوتا ہے کہ معصیت میں تعاون کی تین صورتیں ناجائز اور گناہ ہیں۔

ایک یہ کہ وہ ایسا کرم کا رہا ہو جس کا مقصود اور جس کی وضع کا منشاء ہی کوئی گناہ کی بات ہو مثلاً ایسے آلات اور اسباب کی تجارت، جن کا مقصد ہی لہو ولعب ہو جیسے بت فروشی، بت گری اور گانے بجانے کے سامان، فلمی گانوں کے ریکارڈ کیسٹ، فحش تصاویر اور لٹریچر کی طباعت اور اشاعت وغیرہ۔

یہ چیزیں بذات خود گناہ کا ذریعہ ہیں اور ان کا مقصد گناہ و معصیت کی اشاعت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لئے ان کی حرمت میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہوسکتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا عمل بذات خود درست ہو اور اس کی نیت بھی یہ

q ملخصاً، الموافقات للشاطبی: ۲۵۳/۲ w مائدہ، آیت: ۲

نہیں ہو مگر بعض ایسے قرائن موجود ہوں جو اس بات کو بتلاتے ہوں کہ اس کے عمل سے کسی معصیت اور گناہ کو تقویت اور مدد حاصل ہوگی اور وہ قرائن اس کے علم میں بھی ہوں، یہ صورت بھی معصیت میں اعانت سمجھی جائے گی اور اس کی نظیر یہ ہے کہ فقہاء نے اس بات کو مکروہ قرار دیا ہے کہ کسی ایسے شخص سے غلام کی بیع کی جائے جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ لواطت کا مریض ہے، یا ایسے ملک کے ہاتھ اسلحہ فروخت کیا جائے جو عالم اسلام سے جنگ کے درپے ہے۔[1] جس کو فقہ کی اصطلاح میں دارالحرب کہا جاتا ہے۔

اس لئے کہ ایک لواطت کے خوگر آدمی کا امرد کو خرید کرنا اور ایک ایسے ملک کا اسلحہ خرید کرنا جو مسلمانوں سے برسر عداوت ہے اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ وہ اس کا استعمال معصیت و گناہ اور عالم اسلام کو ضرر پہنچانے کے لئے کرے گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی کام اس نیت سے کرنا کہ اس سے معصیت میں مدد ملے، گو کہ وہ کام اپنی اصل اور موقع کے لحاظ سے معصیت کے لئے نہ ہو۔ البتہ اس کا استعمال گناہ کے لئے بھی کر لیا جا سکتا ہو —— یہ صورت بھی جائز نہ ہوگی، اس لئے کہ کسی کام کے مذموم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو وہ کام خود مذموم اور گناہ کا ہو۔ یا وہ اپنی ذات کے اعتبار سے تو درست ہو، البتہ اس کے پیچھے جو جذبہ اور جو نیت کارفرما ہے وہ مذموم اور ناپسندیدہ ہو۔ پہلی دونوں صورتوں میں یہ عمل بذات خود مذموم تھا، اس لئے وہ معصیت میں تعاون شمار ہوگا۔ چاہے نیت اچھی ہو یا بری، جب کہ زیر بحث صورت میں کام اپنی جگہ درست ہے مگر نیت نے اس کو مذموم کر دیا ہے۔

7 حیلہ کی شرعی حیثیت

حلال وحرام کے سلسلہ میں ایک اہم اور ضروری بحث حیلوں کی ہے حیلہ کے اصل

---

[1] رد المحتار: ۳۸۸/۵

معنی ''مہارت تدبیر'' کے ہیں۔ فقہاء کی اصطلاح میں حرمت و معصیت سے بچنے کے لئے ایسی خلاصی کی راہ اختیار کرنے کا نام ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہو۔[1] اسی لئے بعض لوگوں نے حرام سے بھاگنے کو حیلہ قرار دیا ہے:"انما ھو الھرب من الـــــــ [2] غرض کہ حیلہ حرام سے بچنے" کا نام ہے نہ کہ حرام کا ارتکاب کرنے اور دوسروں کو اور اپنے آپ کو دھوکہ دینے کا۔

اس میں شبہ نہیں کہ فقہ کی کتابوں میں بعض ایسے حیلوں کا ذکر آگیا ہے جو شریعت کے مزاج و مذاق سے میل نہیں کھاتا لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ فقہاء اس طرح کے حیلوں کو جائز قرار دیتے ہوں اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوں۔ مقصود محض یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کر ہی گزرے تو کیا حکم ہوگا؟ اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اسی کی طرف علامہ ابن نجیم مصری نے بعض لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اشارہ کیا ہے کہ:"انما المعنی انه لو فعل کذا لکان حکمه کذا"[2] ـــــ امام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حیلہ کی جائز اور ناجائز صورت پر گفتگو کرتے ہوئے خلاصۂ بحث یوں لکھا ہے:

''حاصل یہ ہے کہ وہ حیل جن کے ذریعہ انسان حرام سے خلاصی، یا حلال تک رسائی کا خواہاں ہو بہتر ہے، ہاں کسی کے حق کا ابطال، یا باطل کی ملمع سازی، مقصود ہو تو ناپسندیدہ ہے...... غرض حیلہ کی یہ راہ نادرست اور پہلے ذکر کی گئی صورت جائز ہے۔''[3]

فقہاء نے جس طرح کے حیلے ذکر کئے ہیں۔ ان کے مجموعی مطالعہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، مثلاً کوئی عورت کسی مرد سے نکاح کی مدعی ہو اور وہ انکار کرتا ہو۔ ثبوت فراہم نہ ہو تو اب یہ دقت ہے کہ چوں کہ مرد اس سے نکاح کا منکر ہے اس لئے اس سے طلاق دلوائی نہیں جا سکتی اور عورت نکاح کی مقر ہے۔ اس لئے دوسرا نکاح

q المبسوط: ۲۱۰/۳۰ w الاشباہ لابن نجیم: ص ۴۰۶

e الاشباہ والنظائر لابن نجیم: ص ۴ تا ۶

نہیں کرسکتی۔ ایسی صورت میں یہ حیلہ بتایا گیا کہ مرد سے کہلایا جائے کہ اگر میں نے اس سے نکاح کیا ہے تو اس پر طلاق واقع ہو تا کہ عورت کے لئے دوسرے نکاح کا راستہ نکل آئے۔[2]

یا اگر کسی نے کہہ دیا کہ اگر تم نے ایسی ہانڈی نہ پکائی جس کا نصف حلال اور نصف حرام ہو تو تم پر طلاق واقع ہو جائے۔ ایسی صورت میں ایسے سر پھرے شخص کی بیوی کو شراب کی ہانڈی میں چھلکا سمیت انڈا ڈال کر پکانا چاہئے کہ انڈے کے پوست کی وجہ سے شراب کا اثر انڈے کے اندر نہ پہنچ پائے گا اور اس طرح وہ ایسی چیز پکانے کی مصداق ہوگی جو آدھا حلال اور آدھا حرام ہے اور وہ اپنے آپ کو طلاق جیسی ابغض المباحات سے بچا کر خاندان کے شیرازہ کو محفوظ رکھ سکے گی۔[3]

غور کیا جائے کہ حیلہ کی ان صورتوں میں گناہ اور حرام سے بچنے، معصیت کا دروازہ بند کرنے اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے حلال کو طلب کرنے اور حاصل کرنے ہی کا جذبہ تو کارفرما ہے، اس لئے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ انسان حیلہ کی آڑ میں حرام اور معصیت کا ارتکاب کرنے لگے اور ظلم وعدوان پر اسلام کا غلاف چڑھانے کی کوشش کرے تو یہ قطعاً حرام اور معصیت ہے اور خدا کو دھوکہ دینے کی سعی ہے: ﴿يُخَادِعُونَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ﴾

قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے ایک طبقہ پر خاص اسی وجہ سے عذاب خداوندی کے نازل ہونے کا ذکر کیا ہے کہ وہ حدود اللہ کو توڑتے ہوئے ہفتہ کے دن بھی شکار کیا کرتے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے منع کر دیا تھا اور اس حرام کے ارتکاب کے لئے ایک خاص طرح کا حیلہ اختیار کرتے تھے۔

---

[1] المبسوط: ۲۱۰/۳۰ [2] الاشباہ لابن نجیم: ص ۴۰۷
[3] الاشباہ والنظائر لابن نجیم: ص ۴۰۹

حیل کا باب عوام اور بالخصوص علماء کے لئے بڑا نازک اور پرخطر ہے اور بغیر
ضرورت شدیدہ کے کبھی اس دروازہ پر دستک نہیں دینی چاہیئے اور یہ بھی ملحوظ رکھنا
چاہیئے کہ حیلہ کا مقصد سلف صالحین کے نزدیک حرام سے بچنا ہے نہ کہ اس کو حلال و
طیب بنانا۔

%

دوسرا باب

عقیدہ وایمان

اسلام میں اعتقادات کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی توحید پر ہے، اسلام کا تصورِ توحید سب سے زیادہ کامل ومکمل اور جامع ہے کہ خدا اپنی ذات کے اعتبار سے بھی ایک ہے۔ اپنی صفات واختیارات کے اعتبار سے بھی یکتا ہے اور اپنے مخصوص حقوق عبادت، دعا، سجدہ، نذر وقربانی وغیرہ میں بھی کوئی اس کا شریک وسہیم نہیں۔ اس نے صرف کائنات کو وجود ہی نہیں بخشا بلکہ کائنات کا تمام نظام ہر لمحہ اور ہر آن اس کے حکم کی پابندی میں مصروف ہے وہ رب ہے اور وہ تمام معاملات کو براہ راست دیکھتا اور سنتا ہے، اس کی بادشاہت وزیروں کی محتاج نہیں اور اس تک رسائی کے لئے واسطوں کی ضرورت نہیں۔ خدا کو سب سے زیادہ جو چیز ناپسند ہے وہ اس کی ذات کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرانا ہے۔ غیرت مند شوہر کو اپنی ہرجائی بیوی پر جو غیرت آسکتی تھی، خدا کی آتش غضب بندوں کے مشرکانہ اعمال وافعال پر اس سے زیادہ بھڑکتی ہے۔

اسلام کا یہ تصور توحید انسانی مساوات وبرابری کے تصور کو اجاگر کرتا ہے، انسان کو ناامیدی سے بچاتا ہے اور خدا کی رحمانیت کی آس دلاتا ہے، اس کی جبر وقہر کی صفت انسان کو جرائم سے باز رکھتی ہے، خدا تک بلاواسطہ رسائی اور خدا سے نسبت بندگی عظمت انسانی میں اضافہ کرتی ہے۔ واقعہ ہے کہ اسلام کا تصور توحید ایک انقلابی تصور ہے، جس کا فکر وخیال اور قول وعمل سے گہرا رشتہ ہے، شریعت میں جتنے اعمال ہیں غور کیا جائے تو وہ سب اسی عقیدہ کی بازگشت اور اسی کے اقرار واعتراف کی تجدید

سے عبارت ہے، نماز خدا کی کبریائی سے شروع ہوتی ہے اور اسی کی توحید کی شہادت پر ختم ہوتی ہے۔ روزہ اسی کے حکم کی تعمیل ہے اور بندہ جب اسے مکمل کرتا ہے تو کہتا ہے کہ خدایا! میں نے تیرے ہی لئے روزہ رکھا ہے: "اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ" زکوٰۃ مال پر خدا کی سلطانی کا اعتراف ہے، حج خانۂ خدا کی زیارت ہے، قربانی خدا کے لئے جان دینے کا عہد ہے۔ نکاح سے پہلے خطبہ اس بات کا اظہار ہے کہ حلال وحرام کی کلید خدا ہی کے ہاتھوں ہے اور اسی کے حکم سے یہ دو مرد وزن ایک دوسرے کے لئے حلال ہوئے ہیں، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور خوشی وغم کے موقع پر جتنی دعائیں ہیں اور جو بھی اذکار منقول ہیں وہ سب خدا کی قدرت کے اعتراف، اس کی نعمت پر شکر اور مصیبت میں اسی کی طرف رجوع اور اسی سے مدد خواہی اور استعانت کے سوا اور کیا ہے؟

افسوس کہ عقیدۂ توحید جو مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا سرمایۂ فخر تھا، اقوام عالم جس کی معقولیت پر رشک کرتی رہی ہے اور انہوں نے دیکھا دیکھی بگڑی ہوئی شکل میں سہی اپنے یہاں توحید کے لئے جگہ پیدا کی ہے، وہی امت مرحومہ آج شرک کے دام ہم رنگ میں پھنسنا چاہتی ہے آج اس کی جبین انسانوں اور انسانی قبروں اور مزاروں اور آستانوں کی خاک مذلت کو اپنے لئے تمغۂ امتیاز اور طغرۂ افتخار بنائے ہوئی ہے۔ "فیا عجباہ ویا اسفاہ"

جیوتشیوں کے پاس جانا

اسلام کا تصور یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی غیب کی باتوں سے باخبر ہے۔ خدا کے سوا کوئی انسانوں کے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات اور حالات سے باخبر نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس آیا اور اس کی باتوں کی تصدیق کی، اس نے قرآن مجید کو جھٹلایا: "فقد کفر بما انزل علی

مـحـمـس[1] میں وہ تمام لوگ داخل ہیں جو قسمتوں کا حال بتاتے ہیں، پنڈت ہوں، جیوتشی ہوں، جھوٹے درویش ہوں، سڑکوں پر بیٹھ کر تماشا کرنے والے ہوں اور ان کو اجرت کے بطور کچھ دینا بھی حرام ہے اور ان کی خبروں پر یقین کرنا اور اس پر اعتقاد رکھنا بقول ملا علی قاری کفر ہے۔[2]

بدعت اور اس کی پہچان

بحیثیت مسلمان ہم اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا نے اپنے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنی رضا وخوشنودی اور خیر کی تمام باتیں بتا دی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتایا وہ خیر ہے اور جو کچھ خیر کی باتیں تھیں اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً یا اصولاً واضح فرما دیا ہے۔ اس لئے اب دین میں کسی بات کا اضافہ اور کمی بیشی کرنا جائز نہیں اور غضب خداوندی کا باعث ہے۔ اسی کو شریعت کی اصطلاح میں ''بدعت'' کہتے ہیں۔ پس بدعت دین میں شریعت کے مشابہ ایسا خود ایجاد کردہ عمل ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رضا جوئی میں مبالغہ مقصود ہو۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔[4] ایک روایت میں ہے کہ جو شخص کسی بدعت کو جنم دے یا بدعتی کو پناہ دے اس پر خدا، ملائکہ، اور تمام انسانیت کی لعنت ہو۔[5] صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور سلف صالحین نے بھی بدعت کے بارے میں ایسی ہی شدت برتی ہے صوفیاء جن کے نام پر بدعت کی جاتی ہے، بدعت کے سخت مخالف تھے اور اس کی مذمت کیا کرتے تھے۔ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ

---

q شرح فقہ اکبر: ص ۲۲۱

w ومنها ان تصدیق الکاهن بما یخبره من الغیب کفر، شرح فقہ اکبر: ص۲۲۱

e الاعتصام: ۱/۳۷

r مسلم عن جابر بن عبداللّٰہ

فرمایا کرتے تھے: بدعتی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ رکھو، یہ دل کو بیمار کرتا ہے۔ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو بدعتی کے ساتھ بیٹھے وہ حکمت دین سے محروم رہے گا۔[1] حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے خطبات میں بدعات سے بطور خاص منع فرماتے تھے۔[2] حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ بدعت سے پناہ مانگتے تھے۔[3] فقہاء نے لکھا ہے کہ بدعتی کی اقتداء مکروہ ہے۔[4]

بدعات جو ہمارے یہاں مروج اور ذہن نشیں ہیں، افسوس کہ ان کی فہرست بہت طویل ہے اور ناسمجھی اور خدا ترسی کی وجہ سے طویل تر ہوتی جاتی ہے، ان میں بعض تو اعتقادی بدعات ہیں جو درجہ کفر کو پہنچی ہوئی ہیں اور بعض عملی بدعات ہیں اور ان کا ارتکاب کبائر میں داخل ہے۔

یہاں ان میں سے ایک ایک کو ذکر کرنا مقصود نہیں۔ البتہ کچھ علامات ذکر کی جاتی ہیں جو اصولی حیثیت کی حامل ہیں اور ان کے ذریعہ کسی چیز کے بارے میں صحیح رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

1 جو عبادتیں انفرادی طور پر ثابت ہوں، ان کو اجتماعی طور پر انجام دینا جائز نہیں۔[5]

2 جو سنت سے ''خفا'' کے ساتھ ثابت ہو، اس کو آہستہ ہی پڑھنا چاہئے، زور سے پڑھنا بدعت ہے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے: ''رفع الصوت بالذکر بدعة''[6]

3 شریعت میں کسی عمل کے لئے کوئی مخصوص وقت مقرر نہ ہو۔ اب اگر کسی وقت خاص ہی میں اس کو کیا جائے اس کو اہمیت دی جائے تو یہ بھی بدعت ہوگا، چنانچہ شاطبی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم پیدائش پر خصوصیت سے خوشیاں منانے کو بدعت قرار دیا ہے۔[1]

---

t بخاری، باب حرم المدینة

q دیکھئے: الاعتصام: ۸۹/۱ تا ۹۹

w فیوض یزدانی: ص ۵۰۷

e دفتر اول مکتوب: ص ۱۸۹

r عالمگیری: ۸۳/۱

4 کسی عمل کے لئے کوئی خاص کیفیت اور ہیئت ثابت نہ ہو اور اس کا التزام کیا جائے تو یہ بھی بدعت ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانہ میں اسکندریہ کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر قرآن مجید کی ایک سورہ کی اجتماعی قرأت کیا کرتے تھے، حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بدعت قرار دیا۔[2]

5 ایسا عمل جس سے دین کے کسی کام میں کمی یا اضافہ کا وہم ہو سکتا ہو، یا نسبتاً کم اہم امر کے متعلق زیادہ اہمیت کا اظہار ہوتا ہو تو یہ بھی ممنوع ہے اور علماء نے اس کو بھی بدعت میں شمار کیا ہے، تاکہ یہ عام لوگوں کے لئے غلط فہمی کا موجب نہ بن جائے۔[3]

6 دین میں جو چیز واجب نہ ہو، اس کا اس درجہ التزام کہ اگر اسے نہ کیا جائے تو لوگ اسے مطعون کرنے لگیں اور اس کے ضروری ہونے کا وہم ہونے لگے، بدعت ہے۔

7 جو عمل خیر کسی خاص کام کے لئے ثابت نہ ہو، اس کا کرنا بھی بدعت سے خالی نہیں، چنانچہ ہشام بن عبدالملک نے عیدین کے لئے اذان واقامت کا سلسلہ جاری کیا تو علماء نے اس کو بدعت اور مکروہ قرار دیا[4] کہ اذان اس موقع خاص پر ثابت نہیں۔

8 غیر مسلموں سے دینی امور میں تشبہ بھی بدعت ہے۔ مثلاً غیر مسلموں کے مختلف طبقات، مخصوص رنگ کے لباس استعمال کرتے ہیں، اب بعض صوفیاء زور نے بھی مخصوص رنگ جیسے سبز یا زرد لباس کے استعمال کا خود کو پابند کر لیا ہے، علماء نے اس کو بھی بدعت قرار دیا ہے۔[5]

یہ چند اصول ذکر کر دیئے گئے، جن سے بدعت کی شناخت میں سہولت ہو۔ تفصیل کے لئے علامہ شاطبی کی مایہ ناز تالیف ''الاعتصام'' اور مولانا محمد سرفراز خاں کی

---

t رد المحتار: ۲۳۵/۲ y بزازیہ علی ہامش الھندیہ: ۳۲۵/۳

q الاعتصام: ۳۹/۱ w الاعتصام: ۳/۲ e دیکھئے: الاعتصام: ۳۲/۲

''راہ سنت'' نیز راقم سطور کی ''مروجہ بدعات فقہاء اسلام کی نظر میں'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے —— تاہم یہ بات واضح رہے کہ بدعات میں حسنہ اور سیۂ کی تقسیم اور کچھ بدعتوں کو جائز قرار دینا محض ایک دھوکہ اور مغالطہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امور دین میں جو بھی بدعت ہو، سب مذموم اور گمراہی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان حق ترجمان کا ارشاد ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے:''کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة'' امام شاطبیؒ کا بیان ہے کہ حسنہ اور سیئہ کی اس تقسیم پر کوئی دلیل شرعی موجود نہیں۔[1] اور مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنا مکاشفہ بیان کیا ہے کہ کسی بدعت میں نور نہیں۔[2] تفصیل کے لئے مذکورہ کتابیں دیکھی جائیں۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مقام

دین جن واسطوں سے ہم تک پہنچا ہے، ان میں سب سے پہلا واسطہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ہے۔ یہ صحابہ اللہ تعالیٰ کے وہ منتخب بندے ہیں جن کو خدا نے اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور رفاقت کے لئے منتخب کیا ہے اور واقعہ ہے کہ جو شخص بھی دیانت و راستی کے ساتھ تاریخ عالم کا مطالعہ کرے گا وہ اس کا اعتراف کرے گا کہ اپنے پیشوا سے والہانہ محبت، ایثار و فدا کاری، مادی قربانی، اطاعت وفرماں برداری اور جاں بازی و جاں نثاری نیز خدا ترسی، احساس جواب دہی، خوف آخرت، اپنے پیغمبر کی زندگی کے ایک ایک حرف کی حفاظت اور دین کی ہر ضرورت پر نصرت و مدد اور اپنی عمومی زندگی میں بے نفسی، نمائش وریا سے دوری اور عہدۂ وجاہ سے بہ رضا ورغبت مہجوری اور اسلام کی دعوت واشاعت کے لئے بے پناہ سرگرمی اور کاوش وسعی، اخلاقی بلندی اور وسیع القلبی، زبان ودل کی رفاقت اور نفاق و ظاہر داری سے اجتناب وغیرہ اوصاف میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی کوئی نظیر ومثال نہیں ملتی۔''رضی اللّٰہ تعالٰی عنھم ورضوا عنه''

---

r الاعتصام: ۱۸/۲ t الاعتصام: ۲۲۹/۲

ان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر بے اعتمادی کا اظہار اور ان کے بارے میں زبان کھولنا، یا ان کے اختلافات و مشاجرات پر بحث کرنا محض اساس دین کو نقصان پہنچانے کے مرادف ہے اور خود اسلام کے نام پر اسلام کی بیخ کنی ہے۔ کیوں کہ جب اس دیوار کی خشت اول ہی کمزور ٹھہرے تو اس بناء ناپائدار پر کون بھروسہ کرے گا۔ اسی لئے سلف صالحین نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں اور ان کے اختلافات پر گفتگو کو منع کیا ہے اور اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ خلفاء اربعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد اسلام میں تقدم و تاخر اور کم وبیش قربانیوں کے اعتبار سے درجات کا تفاوت تو ضرور ہے لیکن پوری جماعت صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تمام امت سے افضل ہے۔[1] اور ان کا اختلاف اصل میں فکر و اجتہاد کا اختلاف ہے، ان میں جو صائب ہو وہ تو ''صائب'' ہی ہے اور جس سے غلطی ہوئی ہو تو وہ بھی محض خطاء اجتہادی ہے، نہ کہ خدانخواستہ ضلالت و گمراہی۔

ادھر گزشتہ نصف صدی میں بعض ایسے لٹریچر اردو زبان میں آئے کہ ان کی وجہ سے کچھ آوارہ خیال لوگوں نے اپنے ہاتھ میں میزان انصاف لے رکھی ہے وہ بزعم خود کچھ صحابہ کو مدعی اور کچھ کو مدعا علیہ بنا کر انصاف کے لئے بیٹھ گئے ہیں اور ان کی زبان صحابہ کے بارے میں نقد و احتساب کے لئے کھل جاتی ہے، یہ ایک شدید قسم کی گمراہی ہے۔ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے بارے میں جس احتیاط کی ہدایت فرمائی ہے اس کی خلاف ورزی ہے اور دین کو نقصان پہنچانے میں دانستہ یا نادانستہ شریک ہونا ہے اللہ ہماری حفاظت فرمائے۔

اسی طرح بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں اہل تشیع کے طریق پر مبالغہ اور غلو سے کام لینا جائز نہیں مثلاً ''مولا علی'' ''المدد یا علی'' یا خود ''یا علی'' کا نعرہ

q [1] الاعتصام: ١٩١/١ w مکتوبات: ٣٣/٢

—— کہ اس طرح کی باتوں میں کفر تک کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح خاص کر حضرت علی یا حضرت حسین کے ساتھ علیہ السلام کا لفظ لکھنا بھی مناسب نہیں۔ خود امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے اس کی ممانعت منقول ہے۔

انکارحدیث

ہمارے زمانہ کے فتنوں میں ایک بڑا فتنہ انکار حدیث بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا حجت ہونا قرآن کی صراحتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے غبار ارشادات وفرمودات سے ثابت ہے۔ کسی حدیث کے سنت یا متن میں ضعف کی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت کو صحیح نہیں ماننا، یا مخلف معانی کے احتمال پائے جانے کی صورت میں کسی خاص قرینہ کی بناء پر ظاہری معنی سے انحراف کرنا اور توجیہ وتاویل کی راہ اختیار کرنا اور بات ہے اور یہ عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے جاری ساری ہے یہ اختلاف صواب وخطا کا اختلاف ہے، ہدایت و ضلالت کا اختلاف نہیں۔

لیکن کسی شخص کا حدیث کی حجیت ہی سے انکار کر دینا، دین میں اس کو مستند یا قابل عمل نہیں ماننا یا استہزاء اور انکار کرنا —— جیسا کہ ہمارے زمانہ کے بعض خدا ناترس اور اباحیت پسند نام نہاد مسلمان دانشوروں اور بزعم خود ترقی پسندوں نے کیا ہے —— شدید گمراہی اور دین میں تحریف وتصحیف کے مترادف ہے۔ حدیث بحیثیت حدیث واجب التعمیل بھی ہے اور واجب التعظیم بھی —— راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایسا کرنے میں یا تو کفر ہے یا کم از کم اندیشۂ کفر۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے خلاصہ الفتاویٰ سے نقل کیا ہے:

"من رد حديثاً قال بعض مشائخنا يكفر وقال المتأخرون ان كان متواتراً كفر۔ اقول هذا هو الصحيح الا اذا كان رد

حدیث الاحاد من الاخبار علی وجہ الاستخفاف والاستحقار والانکار۔" [1]

D: ''جو کسی حدیث کو رد کردے ہمارے مشائخ نے کہا کہ اس کی تکفیر کی جائے گی، متاخرین نے کہا ہے اگر حدیث متواتر کو رد کردے تب تکفیر کی جائے گی، میں کہتا ہوں یہی صحیح ہے سوائے اس کے کہ خبر واحد کو بطور استہزاء اور تحقیر و انکار کے رد کردے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا۔''

اس لئے مسلمانوں کو اس فتنۂ کبریٰ سے آگاہ رہنا چاہئے کہ انکار حدیث دراصل دین کی اساس اور بنیاد پر حملہ اور اسلام کی جڑیں کھودنے کے مترادف ہے۔

ختمِ نبوت کا انکار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں یہ بات داخل ہے کہ سلسلۂ نبوت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم سمجھے، اس پر تمام امت کا اجماع ہے۔ ملا علی قاری کا بیان ہے: ''ودعوی النبوۃ بعد النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کفر بالاجماع''[2] (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعوی نبوت بالاجماع کفر ہے) الاشباہ و النظائر میں لکھا ہے کہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہ جانے وہ مسلمان نہیں۔[3] عالمگیری میں بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔ فقہاء، مفسرین و محدثین اور متکلمین کے یہاں یہ بات اس صراحت سے منقول ہے کہ سلیم الفکر انسان کے لئے مجال انکار نہیں۔

اس لئے کوئی بھی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعوئ نبوت کرے تو بظاہر متقی و پرہیزگار ہی کیوں نہ ہو، صاحب ایمان نہیں ہوسکتا اور اس کا اپنے آپ کو مسلمان کہنا محض فریب اور دھوکہ ہے ـــــ گزشتہ صدی میں پنجاب کے ایک مرد کذاب مرزا

q شرح فقہ اکبر: ص ۱۲۸

q شرح فقہ اکبر: ص ۲۴۲ w شرح فقہ اکبر: ص ۲۰۲

غلام احمد قادیانی نے بہت سے دعاوی کئے اور منجملہ ان کے ایک دعویٰ نبوت بھی ہے ظاہر ہے کہ شخص مذکور مرتد زندیق و بددین تھا اور اس کی نبوت پر ایمان لانے والے اور اس کو نیک و صالح سمجھنے والے دونوں ہی کافر ہیں۔ نہ ان سے شادی بیاہ کا معاملہ جائز ہے اور نہ ان کے ساتھ موالات و ارتباط، کہ ایسے لوگوں سے بے تعلقی خدا سے تعلق کا اظہار ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ موالات و دوستی دینی غیرت وحمیت کے مفقود ہو جانے کا ثبوت اور حب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محرومی کی شہادت ہے۔

بعض لوگ یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ قادیانی بھی اہل قبلہ ہیں اور اہل قبلہ کی تکفیر سے منع کیا گیا ہے مگر یہ محض مغالطہ ہے ـــــ اہل قبلہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروریات دین یعنی دن میں قطعی طور پر ثابت شدہ باتوں کے منکر نہ ہوں۔ ملا علی قاری کا بیان ہے:

"المراد باهل القبلة الذين اتفقوا على ما هو من ضروريات الدين ...... وان المراد بعدم تكفير احد من اهل القبلة عند اهل السنة انه لا يكفر مالم يوجد شيء من امارات الكفر وعلاماته۔"[1]

: "اہل قبلہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروریات دین سے متفق ہوں ...... اہل سنت کے نزدیک اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہ کرنے سے مراد ہے کہ اس وقت تک تکفیر نہیں کی جائے گی جب تک کفر کی علامات اور نشانیاں نہ پائی جائیں۔"

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی لکھا ہے کہ جو ضروریات دین کا منکر ہو، تو گو اہل قبلہ میں سے ہو، اس کی تکفیر کی جائے گی اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں[1] ـــــ اس لئے قادیانی بہرحال کافر، زندیق اور خارج از اسلام ہیں۔ "ھداھم اللّٰہ"

---

[1] الاشباہ والنظائر: ص ۱۳۸

وباللّٰه التوفیق''

تکفیر کے اصول اور افراط وتفریط سے اجتناب

کفر وایمان کا مسئلہ نہایت نازک اور اہم ہے، نہ یہ صحیح ہے کہ کوئی شخص کیسے بھی اعتقادی فساد میں مبتلا ہو، دین اور احکامِ دین کا استہزاء کرتا ہو، شریعت کے بعض مسلمہ حقائق کا منکر ہو اور اپنے قول یا عمل کے ذریعہ کفر کی سرحد میں داخل ہو چکا ہو مگر مسلمان ہوں کہ مصر ہوں کہ ہم ان لوگوں کو بہر حال کافر ہونے نہ دیں گے۔ اس لئے کہ اسلام مخصوص قسم کے نام اور آبائی اور خاندانی روایات کا نام نہیں بلکہ کچھ حقیقتوں سے عبارت ہے، جن پر یقین کرنا ایمان کے لئے شرط اولین ہے۔

اسی طرح یہ افراط بھی صحیح نہیں کہ انسان ہر وقت کفر کی شمشیر برہنہ اپنے ہاتھ میں لئے رہے اور ہر چھوٹے بڑے اختلافات پر مخالف کو کافر قرار دینے سے کم پر راضی نہ ہو، پھر قرآن پاک نے اس بات کو منع کیا ہے کہ تحقیق وتفتیش کے بغیر کسی کے کافر ہونے کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اس کی اس درجہ تاکید کی گئی کہ عین میدان جنگ میں دشمن زیر ہوتے ہوتے دعویٰ ایمان کرے تو گو شبہ اس کے جھوٹے ہونے پر موجود ہے لیکن اب بھی تحقیق کے بغیر قدم نہ اٹھایا جائے[2] اسی لئے فقہاء نے اس پر مستقل بحث کی ہے کہ کون سے الفاظ وافعال کفر کا باعث ہوں گے اور انسان ان کی وجہ سے دائرۂ ایمان سے نکل جائے گا۔

اس لئے کفر کے سلسلہ میں کچھ ضروری اصول درج کئے جاتے ہیں:

1 کوئی بھی ایسا عمل جس کے ذریعہ دین کا استہزاء یا استخفاف ہوتا ہو، کفر کا باعث ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، اللہ نے قرآن میں یہ بات کیوں لکھ دی؟ تو یہ بات باعث کفر ہے[1]

---

q شرح فقہ اکبر: ص ۲۳۰

اسی طرح قرآن مجید کے بے محل اور مزاحاً استعمال سے خوب بچنا چاہئے کہ مبادا قرآن کے ساتھ استہزاء نہ ہو جائے اور ایسی صورت میں اس کا یہ عمل کفر وارتداد نہ قرار پائے، قرآنی آیات کو بطور ہزل ومزاح کے پڑھنا کفر ہے اور کسی آیت قرآنی کو بے محل پڑھنا، مثلاً لوگوں کا ازدحام ہوا اور کہا جائے "فجمعناهم جميعاً" خلاف احتیاط ہے اور اندیشۂ کفر ہے۔[2]

2 کسی جبر واکراہ کے بغیر زبان پر کلمۂ کفر کا اجراء، خواہ دل ایمان پر مطمئن ہو، کفر ہے۔[3] اس لئے کہ صرف جبر واکراہ کی حالت میں جان بچانے ہی کے لئے کراہت خاطر کے ساتھ کفریہ کلمات کا تکلم کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

3 اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت جو آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ غیر اللہ کے لئے اس کو ثابت کرنا بھی کفر کا باعث ہے۔ مثلاً علم غیب کا مسئلہ ہے عالم الغیب ہونا اللہ ہی کا وصف خاص ہے۔ اگر کوئی شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عالم الغیب سمجھے تو سلف نے اس کو کافر قرار دیا ہے۔ ملا علی قاری کا بیان ہے:

"وذكر الحنفية تصريحاً بالتكفير باعتقاد ان النبي صلى اللّٰه عليه وسلم يعلم الغيب لمعارضة قوله ﴿قل لا يعلم من فى السموات والارض الغيب الا اللّٰه﴾ "[4]

D: "حنفیہ نے اس عقیدہ کو صراحۃً باعث کفر قرار دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علم غیب رکھتے تھے، اس لئے کہ یہ آیت ﴿قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللّٰہ﴾ کے خلاف ہے۔"

q ردالمحتار: ۱/۴۱۳ کتاب الصلوٰۃ w نساء، آیت: ۹۴

q شرح فقہ اکبر: ص ۲۶۹، نیز دیکھئے ردالمحتار: ۳/۲۸۴

w شرح فقہ اکبر: ص ۲۵e ردالمحتار علی ھامش: ۳/۲۸۳

اگرکوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کی تاویل کرتا ہوا ورعلم ذاتی اورعلم عطائی کا فرق کرتا ہوتو بھی یہ قرآن کی اطلاع صریح کے خلاف ہونے کی وجہ سے ضلالت وگمراہی ہی ہے اوراگرہم ایسا عقیدہ رکھنے والوں کو کافر نہ بھی کہیں تو اتنا کہنا ہی ہوگا کہ اندیشۂ کفرضرور ہے۔" اعاذنا اللّٰہ منہ"

4 اسی طرح کوئی معصیت خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ ان کو معمولی سمجھنا اور جائز وحلال قرار دینا باعث کفر ہے۔[1] کیوں کہ وہ ایک ایسی بات کا انکار کررہا ہے جودین میں قوی اور بے ریب دلیلوں سے ثابت ہے۔امام سرخسی نے لکھا ہے کوئی شخص حائضہ عورت سے وطی کو جائز قرار دے تو یہ بھی کفر ہے۔[2]

5 کوئی شخص ضروریات دین کا منکر ہو،یعنی ایسے کسی حکم کا منکر ہو جو اجماع یا دلیل قطعی سے ثابت ہو تو کافر سمجھا جائے گا۔علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ نے موجبات کفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:"وکذا مخالفة ما اجمع علیه وانکاره بعد العلم"[3]

اسی طرح ملاعلی قاری کا بیان ہے:

"وفی جواهر الفقه من جحد فرضاً مجمعا علیه کالصوم والصلوة والزکوة والغسل من الجنابة کفر قلت وفی معناه من انکر حرمة محرم مجمع علیه۔" [4]

D:''جواہرالفقہ میں ہے کہ جو کسی اجماعی فرض جیسے روزہ،نماز،زکوۃ، غسل جنابت کا انکار کر جائے وہ کافر ہے، میں کہتا ہوں جو کسی اجماعی حرام کی حرمت کا انکار کر جائے اس کا بھی یہی حکم ہے۔''

خاص طور پر احکام دین کے ساتھ استہزا اور کسی حکم شرعی کے انکار سے خوب ڈرنا

r شرح فقه اکبر: ص ٢٢٥

q شرح فقه اکبر: ص ٢٢٥ w شرح فقه اکبر: ص ٢٢٧

چاہئے کہ باتوں باتوں میں اور ہنسی مذاق کی مجلسوں میں اس طرح کی باتیں نکل جاتی ہیں جو موجب کفر ہیں اور آدمی کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جیسے ڈاڑھی، مسواک وغیرہ کی تضحیک، یا روزہ وغیرہ کے بارے میں یہ کہنا کہ مجھے اشیاء خورد ونوش کی کمی تھوڑا ہی ہے کہ میں روزہ رکھوں وغیرہ کہ ان ساری باتوں میں کفر کا اندیشہ ہے۔

جیسے زبان سے کفریہ باتوں کا کہنا انسان کو دائرۂ ایمان سے خارج کر دیتا ہے اسی طرح کوئی ایسا کام کرنا جو صریحاً کفر کا ہو، یہ بھی موجب کفر ہے، مثلاً ایک شخص زبان سے کچھ نہیں کہتا لیکن بت کو سجدہ کرتا ہے۔ غیر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے تو یہ عمل بھی کفر ہی کا ہوگا[1]

فقہ کی کتابوں میں ایسی جزئیات کثیر تعداد میں موجود ہیں جن کی وجہ سے کسی شخص کے کافر ہونے کا فیصلہ کیا جائے، فقہاء نے ارتداد کے باب میں بالعموم اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے —— یہاں راقم سطور نے ان جزئیات کو ایک ایک کر کے ذکر کرنے کے بجائے بنیادی اصول وقواعد مقرر کر دیئے ہیں جن کی روشنی میں پیش آنے والی جزئیات کے احکام جانے جاسکتے ہیں تاہم چوں کہ تکفیر کا مسئلہ نہایت نازک ہے اور ممکن حد تک اہل قبلہ کی تکفیر سے بچنا ضروری ہے اس لئے عوام کو بطور خود کسی کے کفر و ایمان کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے، بلکہ محتاط اور مستند علماء اور مفتیوں سے رجوع کرنا چاہئے۔

---

e شرح فقہ اکبر: ص ۲۲۶ r شرح فقہ اکبر: ص ۲۵۷

تیسرا باب

صفائی ستھرائی اور امور فطرت

طہارت و پاکیزگی اور صفائی ستھرائی انسانی فطرت ہے اور اس کا اثر نہ صرف جسمانی صحت بلکہ اخلاقی حالت اور فکر وخیال پر بھی پڑتا ہے جس کا اندازہ ان قوموں اور طبقوں کی پستی خیال اور فکری انحطاط سے کیا جا سکتا ہے جو گندی حالت میں رہنے، گندی چیزیں کھانے اور گندے کام کرنے کی خوگر ہیں، اسلام نے قدم قدم پر پاکی اور صفائی کا حکم دیا ہے، ہر دن پانچ وقت کی نماز فرض کی اور ان کے ساتھ وضوء کو ضروری قرار دیا، نفلی عبادت اور قرآن مجید کو چھونے کے لئے بھی وضوء کا حکم دیا، اس طرح جسم کے وہ اعضاء جو کھلے رہتے ہیں اور نسبۃً زیادہ غبار آلود ہوتے ہیں ہاتھ، پاؤں، چہرہ اور سر کے بال، وہ بار بار دھلتے رہتے ہیں۔ سارے کام ہاتھ سے کئے جاتے ہیں اس لئے ہاتھ کی صفائی پر زیادہ توجہ کی ضرورت تھی اس لئے وضوء میں کہنیوں تک دھونے کا تو حکم دیا ہی گیا گٹے تک کا حصہ خاص طور پر مزید تین دفعہ دھلوایا گیا۔ ناک کی صفائی کے لئے ناک میں پانی ڈالنے کا حکم ہوا اور منہ کی صفائی کے لئے کلی کا، دانتوں کی صفائی مسواک کے ذریعہ موکد کی گئی، سو کر اٹھ جائے تو خصوصیت سے تین بار ہاتھ دھویا جائے کہ معلوم نہیں رات میں کہاں کہاں ہاتھ پہنچا[1]

پورے جسم کا دھونا بھی ضروری تھا اس لئے ہفتہ میں ایک بار پورے جسم کے دھونے کی تدبیر کی گئی کہ اس کو جمعہ کے لئے مسنون قرار دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] شرح فقہ اکبر: ص ۲۲۹

نے خاص اہتمام کے ساتھ اس کی تاکید فرمائی[1] جوان اور نوجوان جو زیادہ محنت اور مشقت کرتے ہیں اور ان کے جسم سے زیادہ پسینہ نکلتا ہے اور بدن میں میل جمع ہوتا ہے ان کے لئے ایک ایسی بات کو غسل کا سبب قرار دیا گیا کہ خواہی نہ خواہی بار بار غسل کی نوبت آئے یعنی جماع اور انزال، ان دونوں کی وجہ سے غسل واجب قرار پایا، کپڑے صاف رکھنے کا حکم فرمایا گیا، بال میں کنگھی کرنے کی تلقین کی گئی۔ خوشبو کے استعمال کو پسند فرمایا گیا، موئے زیر ناف اور بغل کے بال کی صفائی کی سنت جاری کی گئی۔ کپڑا یا جسم پر کہیں پیشاب، پائخانہ وغیرہ ناپاک چیزیں لگ جائیں تو ان کا دھونا ایسا لازم قرار دیا گیا کہ اس کے ساتھ نماز ہی صحیح نہ ہو۔ اس طرح اسلام نے صرف صفائی ستھرائی کا حکم ہی نہ دیا بلکہ اس کے لئے ایک مکمل عملی نظام قائم کر دیا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور اسوۂ مبارکہ کے ذریعہ اس کو پوری طرح واضح اور بے غبار نیز سہل و آسان بھی فرما دیا۔

قضاء حاجت اور استنجاء کے آداب

انہیں احکام میں سے ایک استنجاء اور قضاء حاجت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں وہ ہدایات دیں جن میں صفائی ستھرائی کا لحاظ بھی ہے، شرم و حیا کا پاس و خیال بھی اور صحت و تندرستی کی رعایت بھی۔

شرم و حیا کے باب میں عرب اس درجہ پست ہو چکے تھے کہ قضاء حاجت کے وقت ستر کو مضحکہ خیز تصور کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضروری قرار دیا اور فرمایا کہ اگر کچھ اور سامان ستر نہ ہو تو کم سے کم ریت کا ایک ڈھیر ہی بنا کر اس کی اوٹ میں بیٹھے کہ بے پردگی نہ ہو[2] خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ قضاء حاجت کے لئے دور نکل جاتے[1] اور کھجور کے بن وغیرہ میں تشریف لے جانے کو

---

q ترمذی عن ابی ھریرہ باب ماجاء اذا استیقظ من منامہ: ۱۳/۱

q ترمذی عن اوس بن اوس باب فی فضل الغسل یوم الجمعة: ۱۱۱/۱

زیادہ پسند فرماتے۔[2] بیٹھنے کے قریب ہوتے تو کپڑے اٹھاتے۔[3] موجودہ زمانہ کے تعمیر شدہ بیت الخلاء کی طرح مکانی بیت الخلاء میں بھی قضاء حاجت ثابت ہے۔[4] اس بات کو بھی منع فرمایا کہ آدمی قضاء حاجت کرتے ہوئے باہم گفتگو کریں اور فرمایا کہ اس پر اللہ غضب ناک ہوتے ہیں۔[5] آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کر رہے تھے ایک گزرنے والے نے سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب مرحمت نہیں فرمایا۔[6] کہ اس حالت میں گفتگو بھی تقاضاء حیا کے خلاف ہے۔

بیت الخلاء میں داخل ہو اور اس کے پاس کوئی ایسی شئے ہو کہ جس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو تو اس کو نکال کر باہر رکھ دینا مستحب ہے۔[7] حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب ضرورت کو جاتے تو اپنی انگوٹھی رکھ جاتے۔[8] کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی میں ''محمد رسول اللہ'' کندہ تھا۔ اگر باہر چھوڑنے میں حفاظت و دشواری ہو اور اپنے پاس جیب میں رکھ لے تو بھی حرج نہیں، چنانچہ فقہاء نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ انگوٹھی کا نگینہ اندر کی طرف موڑ لے یا اس چیز کو جس پر اللہ کا ذکر ہو اس طرح محفوظ کر لے کہ گرنے کا اندیشہ نہ ہو تو یہ بھی درست ہے۔[9] اسی لئے اگر سکہ وغیرہ پر آیت لکھی ہو تو اس کو ساتھ لے کر بیت الخلاء جا سکتے ہیں۔[1]

---

w ابوداؤد عن ابی هریره، باب الاستتار فی الخلاء: ۱/۶

q ابوداؤد عن مغیره باب التخلی عند قضاء الحاجة: ۱/۲

w ابن ماجه عن عبدالله بن جعفر، باب الارتیاد للغائط والبول: ص۲۸

e ترمذی باب فی الاستتار عند الحاجة: ۱/۱۰

r نسائی شریف: ۱/۱۰

t ابوداؤد عن ابی سعید خدری، باب کراهیة الکلام عندالخلاء: ۱/۳

y ابوداؤد باب فی الرجل یرد السلام وهو یبول: ۱/۳

u المغنی: ۱/۱۰۷

i ابوداؤد: ۱/۵ عن انس باب الخاتم یکون فیه ذکرالله یدخل به الخلاء

پیشاب کرتے ہوئے چھینٹ وغیرہ سے بچنے کی حتی المقدور سعی کی جائے اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر پیشاب کرنے کو پسند فرمایا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کھڑے ہو کر پیشاب کرنا نقل کرے تو اس کی تصدیق نہ کرو۔[2] ہاں کوئی عذر ہو تو حرج نہیں، چنانچہ بعض مواقع پر غالباً کسی عذر کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر بھی پیشاب کیا ہے۔[3] نرم جگہ کا پیشاب کے لئے انتخاب کرے تا کہ چھینٹ نہ پڑے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ہدایت فرمائی ہے۔[4] اسی طرح ہوا کے رخ پر پیشاب نہ کیا جائے کہ اس میں بھی نجاست سے آلودگی کا اندیشہ ہے۔[5] —— آج کل ایسی وضع کے پیشاب خانے عوامی مقامات پر بنائے گئے ہیں کہ کھڑے ہو کر ہی وہاں پیشاب کیا جا سکتا ہے، یہاں چوں کہ مجبوری ہے اس لئے حرج نہیں لیکن عام حالات میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر پیشاب کرنا ہے۔

جہاں قضاء حاجت مکروہ ہے

ایسے مقامات پر بھی قضاء حاجت نہیں کرنی چاہئے جس سے دوسروں کو دقت ہو اور لوگ برا بھلا کہنے پر مجبور ہوں، رہ گزر پر کہ چلنے والوں کو پریشانی ہوگی، سایہ دار جگہ میں کہ مسافرین ٹھہر سکیں، تالاب، چشمے، حوض اور پانی کی جگہ (موارد) پر۔[6] کہ یہ بھی عامۃ الناس کے لئے تکلیف کا باعث ہے، اسی طرح لوگوں کے بیٹھنے اور بیٹھ کر گفتگو

o المغنی: ۱۰۸/۱

q المغنی: ۱۰۸/۱

w رواہ الترمذی وقال ھذا اصح شیء فی الباب: ۹/۱

e ترمذی عن مغیرہ بن شعبہ، باب ماجاء من الرخصۃ: ۹/۱

r ابوداؤد عن ابی موسیٰ: ۲/۱

t المغنی: ۱۰۷/۱

y اتقوا الملاعن الثلاث: البراز فی الموارد وقارعۃ الطریق والظل،

وغیرہ کرنے کے مقامات پر بھی قضاء حاجت مکروہ ہے۔[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ نے صرف انسان ہی کا نہیں دوسری مخلوقات کا بھی لحاظ رکھا ہے، چنانچہ سوراخ میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا[2] کہ اس سے حشرات الارض کو اذیت ہوگی اور ممکن ہے کہ خود انسان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے کہ کوئی کیڑا مکوڑا ڈس لے ـــــ پھلدار درخت کے نیچے بھی اس سے اجتناب کرے۔[3] قبر پر اور قبر کے پاس استنجاء کرنا مکروہ ہے، مسجد میں بھی استنجاء کرنا حرام ہے گو مخصوص برتن میں کیا جائے اور مسجد آلودہ نہ ہو۔[4] ہاں گھر میں استنجاء کے لئے کوئی برتن مخصوص رکھا جائے اور اس میں پیشاب کیا جائے تو ضرورۃً ایسا کیا جا سکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی اس طرح کا ایک برتن رہتا تھا۔[5]

پانی کو نجاست سے بچانے کا اہتمام کیا جائے۔ اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت سے تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں ہرگز پیشاب نہ کیا جائے۔[6] منشا یہ نہیں ہے کہ بہتے ہوئے پانی میں پیشاب کیا جا سکتا ہے بلکہ ٹھہرے ہوئے کم پانی میں پیشاب کرنے سے پانی بہرطور ناپاک ہو جائے گا، اس لئے زیادہ تاکید مقصود ہے، یوں پیشاب زیادہ اور جاری پانی میں بھی کرنا کراہت سے خالی نہیں کہ طبعی نظافت کے خلاف ہے اور کثرت کی وجہ سے اگر پانی کے اوصاف (رنگ، بو، مزا) بدل جائیں تو پانی ناپاک بھی ہو جائے۔[7] اسی طرح غسل خانہ میں بھی استنجاء کرنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ تاکید منع فرمایا۔[1]

ا ابوداؤد عن معاذ: ۵/۱

q فتح العزیز مع شرح مھذب: ۴۹۱/۱

w نھی ان یبال فی الحجر، نیل الاوطار: ۸۴/۱ بحوالہ ابوداؤد عن عبداللّٰہ بن سرجس

e فتح العزیز: ۴۹۵/۱ r الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲۰۹/۱

t المغنی: ۱۱۰/۱ y بخاری: ۳۷/۱

مستحب ہیئت

قضاء حاجت کی حالت میں نشست ایسی ہو کہ آسانی سے اجابت ہو جائے اور پیشاب پوری طرح باہر آ جائے، ایک روایت میں ہے کہ بائیں پہلو پر بیٹھا جائے اور دائیں پہلو کو سیدھا رکھا جائے [2] اور آبدست کرتے ہوئے جسم کو ڈھیلا رکھا جائے اور دونوں ٹانگوں کے درمیانی حصہ کو فراخ۔[3] ضرورت سے زیادہ اس جگہ نہ بیٹھے کہ اس سے بعض بیماریوں کے بھی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اور اس کی وجہ سے دوسرے اہل ضرورت کو زحمت انتظار بھی ہوتی ہے۔[4] فی زمانہ بیت الخلاء کا جو مغربی طرز کا بیسن ایجاد ہوا ہے اس میں قضاء حاجت مسنون طریقہ پر بیٹھ کر نہیں کی جا سکتی اور مجھے تو خیال ہوتا ہے کہ یہ خلاف فطرت بھی ہے اس لئے اس سے بچنا چاہئے جہاں مجبوری ہو وہاں اس سے استفادہ کے سوا چارہ نہیں۔

قضاء حاجت کی حالت میں سر ڈھکنا چاہئے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسا ہی مروی ہے اور جوتا یا چپل وغیرہ بھی پہنے کہ پاؤں آلودہ نہ ہو۔[5] جاتے ہوئے پہلے بایاں پاؤں رکھے اور نکلتے ہوئے پہلے دایاں قدم نکالے [6] کہ دائیں حصہ کو بائیں حصہ پر جو شرف بخشا گیا ہے اس کا یہی تقاضا ہے۔ استنجاء میں دائیں ہاتھ کو شرم گاہ سے نہ لگائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔[7]

دعائیں

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موقع کے لئے دعا بھی منقول ہے، قضاء حاجت سے پہلے یہ دعا پڑھے:

u المغنی: ۱۰۸/۱

q ابوداؤد عن ابن مغفل: ۵/۱

w المغنی: ۱۰۸/۱ بحوالہ طبرانی عن سراقہ بن مالک

e خلاصۃ الفتاوی: ۲۴/۱ r المغنی: ۱۰۹/۱ t المغنی: ۱۰۹/۱

" اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ

D: ''میں نر و مادہ جنات سے خدا کی پناہ میں آتا ہوں۔''

اس میں "خبث" کے سکون کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور پیش کے ساتھ "خُبُث" بھی، دونوں طرح روایت کیا گیا ہے۔[1] اور معنی میں بھی فرق نہیں ہے۔ "خبث" سے شیطان ذکور اور ''خبائث'' سے شیاطین اناث مراد ہیں۔[2]

دراصل گندگی کے ایسے مقامات شیاطین کی خاص قیام گاہیں ہیں اس لئے اس موقعہ پر ان سے پناہ چاہی گئی۔

اگر صحرا اور میدان میں قضاء حاجت کرے تو کپڑے کھولنے اور اٹھانے سے پہلے دعا پڑھ لے۔ تعمیر شدہ بیت الخلاء میں جائے تو داخل ہونے سے پہلے پہلے نہ پڑھ سکا اور بیٹھنے یا داخل ہونے کے بعد یاد آیا تو دل ہی دل میں پڑھ لے، زبان سے تلفظ نہ کرے کہ ایسی حالت میں اللہ کا نام لینا مکروہ ہے چھینک بھی آئے تو دل ہی دل میں الحمدللہ کہے، زبان سے نہ بولے۔[3]

ضرورت سے فراغت اور بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو دعائیں منقول ہیں:

" غُفْرَانَکَ " [4]

D: ''اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مغفرت کا طلب گار ہوں۔''

اور:

" اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِی۔ "

D: ''تمام تعریف خدا کے لئے جس نے مجھ سے ایک تکلیف دہ شئی

y المغنی: ۱/۱۰۹ u ترمذی، باب کراھیة الاستنجاء بالیمین عن ابی قتادة: ۱/۱۰

q ترمذی: ۱/۷ باب ما یقول اذا دخل الخلاء

w حاشیہ ابی داؤد: ص ۲ e المغنی: ۱/۱۰۹

کو دور فرمایا اور عافیت عطا فرمائی۔''

دونوں میں سے ایک دعا بھی کافی ہے، دونوں کو جمع کر لینا بہتر ہے۔ مغفرت اس لئے طلب کی گئی کہ اتنا وقت خدا کے ذکر سے خالی گزرا اور شکر تو ظاہر ہے کہ غذا کا فاسد حصہ اگر جسم سے باہر نہ نکلے تو ایسی اذیت ہے کہ شاید اس سے بڑھ کر اذیت کا تصور بھی مشکل ہے، یہ خدا ہی کی قدرت اور اس کا بے پایاں احسان ہے کہ اس نے کسی انسانی محنت کے بغیر از خود اس کو اس تکلیف سے نجات بخشی ہے اور صحت و عافیت اور سکون و راحت سے سرفراز فرمایا ہے۔

قبلہ کا استقبال واستدبار

جو چیزیں فی الجملہ کسی خاص نسبت کی وجہ سے قابل احترام ہیں، شریعت نے استنجاء کی حالت میں ان کی طرف رخ کرنے سے منع فرمایا ہے اور خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے بہ نفس نفیس ان کی تعیین بھی فرمادی ہے ان میں سب سے اہم قبلہ کا استقبال اور استدبار ہے۔ استقبال سے مراد قبلہ کی طرف چہرہ کرنا ہے اور استدبار سے اس کی طرف پشت کرنا مراد ہے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ جب تم ضرورت کو جاؤ تو پیشاب پائخانہ کرتے ہوئے نہ قبلہ کی طرف رخ کرو اور نہ پشت۔[1]

بعض فقہاء نے استقبال اور استدبار میں فرق کیا ہے اور بعضوں نے عمارت کے اندر استقبال اور استدبار کی اجازت دی ہے، صحرا میں منع کیا ہے۔[2] مگر صحیح یہی ہے کہ ہر حال میں مکروہ ہے کہ ایک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق منع فرمایا ہے اور کوئی فرق اپنے ارشادات میں ظاہر نہیں فرمایا، دوسرے مقصود احترام قبلہ ہے اور وہ بہر

---

r ترمذی: ۷/۱ باب ما یقول اذا خرج من الخلاء

t ابن ماجہ: ص۲٦ باب ما یقول اذا خرج من الخلاء

q اس کو سوائے ابن ماجہ کے صحاح ستہ کے تمام مصنّفین اور امام مالک نے روایت کیا ہے، ملاحظہ ہو: جـــامــع

صورت قابل احترام ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بعض روایات میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل استقبال و استدبار کا نقل کیا گیا ہے مگر اول تو وہ روایات اس درجہ قوی نہیں ہیں۔ دوسرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل ممکن ہے کہ کسی عذر کی بنا پر ہو اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات اور زبانی ارشادات سے کہیں اس کا جائز ہونا معلوم نہیں ہوتا۔

حدیث میں تو ذکر نہیں لیکن فقہاء نے چانداور سورج کی طرف بلا پردہ شرمگاہ کا رخ کر کے استنجاء کرنے سے بھی منع کیا ہے، ہاں اگر سامنے دیوار یا کوئی سا تر شئی موجود ہو تو مضائقہ نہیں۔[1]

استنجاء کے ذرائع

استنجاء بائیں ہاتھ سے کرے، صرف پانی یا صرف پتھر کا استعمال بھی کر سکتے ہیں، پانی سے کرنا بہ مقابلہ پتھر وغیرہ کے بہتر ہے اور اس سے بھی بہتر ہے کہ پہلے پتھر یا ڈھیلوں کا استعمال کیا جائے پھر پانی کا۔[2] فی زمانہٖ کاغذ کا استعمال جو خاص اسی مقصد کے لئے بنایا جاتا ہے، پتھر کے حکم میں ہے، آبدست میں کم سے کم حصہ کا استعمال ہو۔ تین انگلیوں سے کام چل جائے تو زیادہ بہتر ہے۔[3] پتھر ہوں تو تین بار استعمال کرنا زیادہ بہتر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ہدایت فرمائی ہے۔[4] لیکن اصل مقصود یہ ہے کہ نجاست زائل ہو جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو پتھروں پر بھی اکتفا فرمایا ہے۔[5] یہی اصول پانی میں بھی ہے، جتنی بار دھونے میں پوری طرح صاف ہونے کا گمان ہو جائے، اتنی بار دھوئے، تعداد کی کوئی قید نہیں۔[1] استنجاء سے پہلے اور استنجاء کے

الاصول الباب الثالث من کتاب الطھارۃ: ۱۲۰/۷

w ترمذی فی النھی عن استقبال القبلۃ بغائط اوبول: ۸/۱

q المغنی: ۱۰۷/۱ w خلاصۃ الفتاوی: ۲۸/۱ e خلاصۃ الفتاوی: ۲۸/۱

r ترمذی باب الاستنجاء بالحجارۃ عن عبدالرحمن بن یزید: ۱۰/۱

بعد ہاتھ دھونا مستحب ہے۔[2]

ناپاک چیزوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجاء کرنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ نے خاص طور پر جانور کے فضلہ (لید) کا ذکر کیا ہے، ہڈی سے بھی استنجاء کرنے سے روکا ہے کہ جنوں کی غذا کا کام دیتی ہے۔[3] چکنے قابل تحریر کاغذ سے بھی استنجاء نہیں کرنا چاہئے۔[4]

استبراء

استنجاء کے بعد بعض اوقات پیشاب کے قطرات پوری طرح نکل نہیں پاتے، ان قطرات کے اخراج کے لئے جو بھی تدبیر کی جائے، فقہاء کی زبان میں استبراء کہلاتا ہے، استبراء کی مختلف لوگوں کے لئے ان کی عادت کے مطابق مختلف طریقے ہو سکتے ہیں، کھانسنا، کھڑا ہونا، چند قدم چلنا وغیرہ۔[5] ابن قدمہ نے یہ طریقہ بھی لکھا ہے کہ فوطوں کے نیچے کے حصہ پر ہاتھ رکھے اور اوپر کی طرف لے جائے اور تین بار عضو تناسل کو حرکت دے۔[6] خواتین اپنے ہاتھ کی انگلیاں مثانہ کے حصہ پر رکھیں۔[7]

استبراء کے سلسلہ میں ایک خاص بات کی طرف توجہ دلانی مناسب ہوگی جس میں عام طور پر دیندار حضرات بھی مبتلا ہیں اور جو بظاہر ناشائستہ طریقہ محسوس ہوتا ہے یعنی پیشاب کے بعد جسم سے ڈھیلے لگا کر اور پائجامہ میں ہاتھ رکھ کر ٹہلنا، علامہ مرتضٰی زبیدی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

”واذا قام ليستبرئ فلا يخرج بين الناس وذكره في يده وان كان تحت ثوبه فان ذلك مثلة وشوه، فكثيرا ما يفعل

---

t ترمذي باب الاستنجاء بالحجرين: ۱۰/۱ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک کم سے کم تین پتھر ضروری ہیں۔

q خلاصة الفتاوى: ۲۸/۱ w خلاصة الفتاوى: ۲۸/۱

e ترمذي باب كراهية ما يستنجى به: ۱۱/۱

بعض الناس هذا. وقد نهى عنه فان كانت له ضرورة في الاجتماع بالناس اذ ذاك فليجعل على فرجه خرقة ليشدها عليه ثم يخرج الناس فاذا فرغ من ضرورته ينظف اذا ذاك“

D: ”استبراء کے لئے کھڑا ہوتو لوگوں کے درمیان اس طرح نہ نکلے کہ اس کا عضو مخصوص اس کے ہاتھ میں ہو، گو کپڑے کے اندر ہو کہ یہ ایک طرح کا مثلہ اور مجموعی ہیئت کا بگاڑ ہے، بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، اگر لوگوں کی موجودگی میں استبراء کی ضرورت پڑ جائے تو اپنے عضو پر کوئی کپڑا باندھ لے پھر جب لوگ چلے جائیں تو اپنی ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد اس جگہ کو صاف کر لے۔“

موجودہ زمانہ میں جانگیہ اس کپڑے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

استنجاء کے بعد اگر وسوسہ پیدا ہوتا ہو اور یہ شبہ عادۃً ستاتا رہتا ہو کہ شاید پیشاب کے قطرات نکل گئے ہوں تو مستحب ہے کہ شرم گاہ اور پائجامہ پر پانی کی چھینٹ مار دیں کہ خود حدیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔[2]

استنجاء کا حکم

اگر نجاست اپنے مخرج پر محدود رہے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک استنجاء واجب نہیں صرف سنت ہے...... ایک درہم کی مقدار سے بڑھ جائے تو واجب ہے، مقدار درہم سے ہتھیلی کا گہرا حصہ مراد ہے، دوسرے فقہاء کے ہاں کم ہو تب بھی واجب ہے۔[1] اگر نجاست مخرج سے بڑھ جائے تو اکثر فقہاء کے نزدیک پتھر اور ڈھیلوں کا استعمال

r ردالمحتار: ۲۲۷/۱ t درمختار: ۲۳۰/۱ y المغنی: ۱۰۳/۱
u الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۱۹۵/۱

کافی نہیں، پانی ہی کا استعمال ضروری ہے۔[2]

مسواک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم تین سنتوں میں سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غایت درجہ تاکید فرمائی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مجھے اپنی امت پر دشواری کا خیال نہ ہوتا تو میں ان کو مسواک کا حکم دیتا۔[3] یعنی واجب قرار دیتا خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول کثرت سے مسواک کرنے کا تھا۔ وفات سے چند ساعت قبل جب اتنی قوت بھی نہ تھی کہ خود مسواک کرسکیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ شوق کا اشارہ بھانپ کر ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مسواک نرم کر کے دندان مبارک پر پھیر دی۔[4] اسی لئے مسواک کے مسنون ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔[5]

مسواک کے مواقع

یوں تو جس قدر مسواک کی جائے باعث اجر ہے لیکن پانچ مواقع پر مسواک کی اہمیت زیادہ ہے، نماز سے پہلے فرض ہو یا نفل اور وضو کر کے نماز ادا کی جائے یا تیمّم کر کے۔ دوسرے جب دانت زرد ہو جائیں، تیسرے وضوء سے پہلے، چوتھے قرآن مجید کی تلاوت کے وقت، پانچویں جب منہ میں خلو معدہ، کسی خاص چیز کے کھانے یا کسی اور وجہ سے بو پیدا ہو جائے۔[6] اذرعی نے دو اور صورتوں کا اضافہ کیا ہے۔ سونے سے پہلے اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد۔[1] زبیدی نے دو اور صورتیں بڑھائی ہیں، ہم

q الاتحاف علی الحیاء: ۵۴۴/۲

w ترمذی باب فی النضح بعد الوضوء: ۱۲/۱

q فتح العزیز مع المجموع: ۴۵۶/۱

w دیکھئے: المغنی: ۱۰۵/۱، خلاصۃ الفتاوی: ۲۴/۱

e ترمذی باب ماجاء فی السواک: ۱۲/۱

بستری سے پہلے اور باہر سے گھر واپس آنے کے بعد[2] تاہم نماز اور وضوء کے موقعوں پر مسواک کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص ہدایت فرمائی ہے۔ وضوء سے پہلے مسواک کا مطلب یہ ہے کہ وضوء شروع کرنے سے پہلے مسواک کی جائے بلکہ مسواک ہی سے وضوء شروع کیا جائے۔[3]

مسواک کیسی ہو؟

مسواک کی لکڑی نرم ہونی چاہئے جس سے دانت وغیرہ صاف ہوسکیں اور مسوڑھوں پر خراش نہ آئے۔[4] پیلو (اراک) کی مسواک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ پسند تھی۔[5] مسواک کے نہ ہونے یا کسی وجہ سے نہ کرنے کی صورت میں انگلیاں بھی کافی ہیں، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ وضوء کے وقت تمہاری انگلیاں بھی مسواک کے قائم مقام ہیں "اصبعیک سواک عند وضوءک۔"[6]

موجودہ زمانہ کے برش وغیرہ کا حکم یہ ہے کہ فعل مسواک کے اعتبار سے ان کے ذریعہ سنت ادا ہوجائے گی البتہ خود مسواک کی سنت اس کے ذریعہ ادا نہ ہوسکے گی، اسی طرح مسواک نہ کرنے کی وجہ سے جو کراہیت پیدا ہوتی ہے اس سے بچنے کے لئے یہ برش وغیرہ کافی ہوجائیں گے۔ واللہ اعلم۔

---

r بخاری باب مرض النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن عائشہ: ۶۴۰/۲

t المغنی: ۶۹/۱ y شرح مھذب: ۲۷۲/۱، ۲۷۳

q حاشیہ اذرعی علی ھامش المجموع: ۲۷۲/۱

w الاتحاف: ۵۵۹/۲، کان اذا دخل بیتہ بدا بالسواک، مسلم عن عائشہ رضی اللّٰہ عنھا

e احیاء العلوم مع الاتحاف: ۵۵۸/۲

طریقے اور آداب

مسواک کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو طولاً اور عرضاً دونوں طرح کیا جائے گا۔[1] بہتر یہ ہے کہ زبان پر طولاً کرے اور دانتوں پر عرضاً۔ (شرح مہذب جلدا صفحہ ۲۸۰) دانتوں پر عرضاً مسواک کرنے کے سلسلہ میں ایک روایت بھی ہے۔[2] مسواک دانت کے اندرونی، بیرونی اور داڑھوں پر کی جائے، حلق کے بالائی حصہ پر بھی آہستہ ملی جائے۔[3] دائیں طرف سے شروع کی جائے، دوبارہ مسواک کرنے سے پہلے دھولی جائے، بچوں کو بھی اس کی عادت ڈالی جائے، مسواک کرتے ہوئے اداء سنت کی نیت رکھی جائے۔[4] —— حدیث میں مسواک کی کوئی خاص دعا منقول نہیں مگر سلف سے بعض معمولات منقول ہیں مثلاً مسواک سے پہلے یہ دعا:

”اللّٰھم بیض بہ اسنانی وشد بہ لثاتی وثبت بہ لھاتی وثبت بہ لھاتی وبارک لی فیہ یا ارحم الراحمین[5]“

D: ”اے اللہ اس کے ذریعہ میرے دانتوں کو صاف وسفید بنا، میرے داڑھوں کو مضبوطی عطا کر اور میرے حلق کے کوے کو قائم رکھ اور اے ارحم الراحمین! اس میں مجھے برکت مرحمت فرما۔“

وضع قطع

وضع قطع اور انسانی شکل وصورت کے معاملہ میں بھی اسلام نے اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کی ہے، بعض مذاہب (جو انبیاء کی حقیقی تعلیمات اور الہامی

r المغنی: ۷۰/۱
t مجمع الزوائد باب با ی شیء یستاک: ۱۰۰/۲
y المغنی: ۷۰/۱
q المغنی: ۶۹/۱، احیاء العلوم مع الاتحاف: ۵۵۸/۲
w الاتحاف: ۵۵۸/۲

ہدایات سے دور ہو چکے تھے) نے ظاہری تجمل اور زیبائش و آرائش کو خدا تک رسائی کے لئے رکاوٹ، مذہبیت اور دینداری کے خلاف اور دین کی بے رغبتی کے یکسر مغائر سمجھ رکھا تھا، ایران اور ہندوستانی مذاہب میں تو اس تصور کی بہتات ہے ہی، خود عیسائیت نے جس دور میں رہبانیت کا پیرہن پہنا اس میں بھی ٹھیک یہی کیفیت پیدا ہوئی، انہوں نے بال کی تراش وخراش، چہرے کے خدوخال کی اصلاح، غسل اور صفائی ستھرائی، اچھے کپڑوں کا استعمال ان سب کو شجر ممنوعہ جانا ـــــ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جو دین فطرت کے داعی تھی اور جن کی تعلیمات نے ایک طرف خدا طلبی کا ذوق پیدا کیا اور دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ یہ کائنات رنگ و بو خدا نے انسان ہی کی خدمت کے لئے پیدا کی ہے، نے وضع قطع، صفائی ستھرائی، لباس و پوشاک، اور طور و طریق میں ہر جگہ ان دونوں تصورات کو دوش بدوش جگہ دی ہے، نہ انسان کے نفس کو آزاد چھوڑا کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش کا غلام بنے اور نہ ایسی قدغنیں عائد کیں جو انسانی فطرت اور جبلت کے خلاف ہوں، قارئین آئندہ سطور میں اس کی عملی تصویر دیکھ سکیں گے۔

سر کے بال

اس کا آغاز ہم سر کے بال سے کرتے ہیں۔ سر پر بال خدا کی ایک نعمت ہے جو ایک طرف گرمی اور سردی سے اس کی حفاظت کرتی ہے دوسری طرف اس کے سراپا کو تجمل و خوبصورتی اور ایک خاص قسم کی جاذبیت اور کشش عطا کرتی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ عام حالات میں بال رکھے، کبھی بتقاضاء صحت اور بہ تفاوت مذاق و مزاج بال کی کثرت سے گرانی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اسلام نے دونوں کی رعایت کی، بال مونڈانے کی بھی اجازت دی اور بال رکھنے کو بھی پسند کیا، خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر اوقات بال رکھے ہیں لیکن زندگی میں چند بار مونڈایا بھی ہے جس کا ذکر

آ گے آ تا ہے۔ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے صاحبزادوں کے بال بنفس نفیس مونڈوائے ہیں۔[1]

لیکن اس میں بھی تہذیب وشائستگی کے اصول مقرر فرمائے، ارشاد فرمایا کہ بال رکھوتو اس کا حق بھی ادا کرو۔"من کان له شعر فلیکرمه"[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گو کنگھی اور بال کی آرائش میں مبالغہ کو پسند نہیں فرمایا لیکن مناسب وقفہ کے ساتھ کنگھی کرنے کو کہا"نهی عن الترجل الا غبا"[3] حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بال بڑے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روزانہ کنگھی کرنے کی تلقین فرمائی۔[4] حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سر مبارک میں تیل بھی بہ کثرت رکھتے تھے۔[5] بعض اوقات ازواج مطہرات بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کنگھی کیا کرتی تھیں۔[6] آپ صلی اللہ علیہ وسلم سر میں خوشبو کا بھی استعمال فرماتے۔[7] جس سے خوشبودار تیل کا سر میں استعمال کرنا سنت سے قریب معلوم ہوتا ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں میں بال رکھنے کا ایک عجیب طریقہ رائج تھا جس کو قزع کہتے تھے، پیشانی اور دونوں کناروں کے بال چھوڑ دیتے اور باقی پورا سر مونڈ دیتے، کبھی صرف پیشانی ہی کا بال باقی رکھتے۔[8] بعض روایات میں مطلق سر کے کچھ حصہ کے

---

e شرح مهذب: ۲۸۱/۱

r ملخصاً شرح مهذب: ۲۸۲/۱، ۲۸۳

t ملخصاً شرح مهذب، الاتحاف: ۵۶۰/۲

q ابوداؤد عن حسن بن سعد باب فی حلق الرأس: ۵۷۷/۲

w ابوداؤد عن ابی هریره باب فی اصلاح الشعر: ۵۷۳/۲

e ابوداؤد اول کتاب الرجل: ۵۷۳/۲

r نسائی کتاب الزینة من السنن الفطرة: ۲۹۱/۲

t ترمذی فی الشمائل عن انس باب ماجاء فی تقنع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه

مونڈنے اور کچھ حصہ چھوڑ دینے کا ذکر آتا ہے[1] اس سے انسان کی صورت جیسی کچھ مضحکہ خیز اور وحشت انگیز بن جاتی ہوگی وہ محتاج اظہار نہیں۔ اس کا کچھ اندازہ ان ہندو بھائیوں کی ہیئت سے لگایا جاسکتا ہے جو شمال ہند میں پورا مونڈ کر سر کے وسط میں چند بال چھوڑ دیتے ہیں ـــــ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل اسلام کی اس رسم کو منع فرمایا، اسی لئے امام نووی نے قزع کے مکروہ ہونے پر امت کا اجماع نقل کیا ہے بشرطیکہ علاج و بیماری کے لئے نہ ہو، ہاں البتہ یہ کراہت تنزیہی ہے۔[2]

یہ بات تو ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مقدار میں بال رکھا ہے اس مقدار میں بال رکھنا مسنون اور سب سے بہتر ہے کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کسی کی سنت قابل اعتناء ہے اور نہ کوئی رائے قابل توجہ، رہ گیا یہ کہ مطلق بال رکھنا بہتر ہے یا بال کا مونڈانا۔ فقہاء احناف کا رجحان اس طرف ہے کہ اگر زلف نہ رکھ رہا ہو تو حلق و بال کا مونڈانا بہتر ہے، امام طحاوی نے اس کو سنت قرار دیا ہے اور اس کی نسبت امام ابوحنیفہ اور آپ کے دونوں شاگرد قاضی ابو یوسف اور امام محمد کی طرف کی ہے بلکہ فقہاء احناف کی کتابوں میں یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ہر جمعہ کو بال مونڈانا مستحب ہے۔[3]

جب کہ امام احمد کے نزدیک بال کو استرے سے مونڈانا مکروہ ہے۔ خود امام احمد کا معمول یہ تھا کہ بال ترشوایا کرتے تھے اور متوسط انداز کا بال رکھتے تھے۔ امام احمد کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قینچی سے بال تراشنا خواہ جڑ تک تراشا جائے، مکروہ نہیں۔[4]

خیال ہوتا ہے کہ امام احمد کا نقطۂ نظر حدیث اور سنت کے زیادہ قریب ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے حج و عمرہ کے ہمیشہ بال رکھا ہے، بال رکھنا

وسلم

y بخاری عن عائشه باب ترجيل الحائض زوجها: ۱/۴۳

u بخاری عن عائشه باب الطيب فی الرأس واللحية: ۲/۸۷۸

i بخاری عن ابن عمر باب القزع: ۲/۸۷۸

مستقل آپ کی ایک سنت ہے اور بال کی مقدار ماثور مستقل سنت ہے۔ مشہور حنفی محدث ملاعلی قاری کا رجحان بھی اسی طرف محسوس ہوتا ہے کہ بال کا رکھنا بال کے مونڈانے سے بہتر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر کے صاحبزادوں کا بال کیوں مونڈایا؟ حالانکہ بال کا رکھنا افضل ہے بمقابلہ بال مونڈانے کے، اس کا ذکر کرتے ہوئے علامہ عینی لکھتے ہیں: ”وانما حلق رؤسھم مع ان ابقاء الشعر افضل الا بعد فراغ احد النسکین[1]۔“

سر کے بال میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول زلف رکھنے کا تھا، زلف مبارک کبھی کانوں کے لوتک ہوتی کبھی اس سے نیچے گردن تک اور کبھی کاندھے تک[2] پہلی صورت کو ”وفرہ“ دوسری کو ”لمہ“ تیسری کو ”جمہ“ کہا جاتا ہے۔

حضرت انس کی ایک روایت میں نصف کان تک موئے مبارک کا ذکر ہے[3] لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر موئے مبارک کانوں سے نیچے اور مونڈھوں سے اوپر ہوتا تھا ”فوق الجمعہ ودون الوفرۃ۔“ [4]

اور جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ تیل، خوشبو اور کنگھے کے استعمال کا بھی معمول تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء سیدھے بال رکھا کرتے تھے پھر بعد کو مانگ نکالنے لگے[5] جو سر کے بیچ میں ہوتی[6]

q ابوداؤد عن ابن عمر باب فی الصبی لہ ذوابۃ: ۵۷۷/۲

w عمدۃ القاری: ۵۸/۲۲

e عالمگیری: ۳۵۷/۵ الباب التاسع عشر فی الختان الخ

r المغنی: ۶۵/۱

q مرقاۃ: ۴۷۲/۴ باب الترجل الفصل الثانی w مرقاۃ المفاتیح: ۴۷۰/۴

e ابوداؤد، باب ماجاء فی الشعر: ۵۷۶/۲

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سر اور داڑھی میں خضاب کا استعمال کرتے تھے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب لگایا ہے حضرت ابو رمثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت میں بھی ایسا ہی منقول ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک اور روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خضاب نہیں استعمال کرنا منقول ہے اور اس کو اس سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ سر مبارک میں چند ہی بال پکے ہوئے تھے، غالباً تیل کی کثرت اور خوشبو کے استعمال کی وجہ سے یہ پکے ہوئے بال لال نظر آتے تھے اور اسی کو بعض حاضرین خضاب خیال کرتے تھے۔[1]

مونچھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مونچھ کے تراشنے کو امور فطرت میں سے قرار دیا ہے۔[2] حدیث میں مونچھ کے تراشنے کے سلسلہ میں مختلف تعبیرات ذکر کی گئی ہیں "قص الشوارب، احفوا الشوارب، جزوا الشوارب، انھک الشوارب"

قص کے علاوہ یہ تمام الفاظ مبالغہ کے ساتھ بال تراشنے کو بتلاتے ہیں۔[3] انہی تعبیرات کو سامنے رکھ کر احناف، شوافع اور حنابلہ مطلقاً تراشنے کو مسنون اور اس میں مبالغہ کو بہتر سمجھتے ہیں۔[4] امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ مونچھ کے کاٹنے میں مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے بلکہ قرطبی کے بیان کے مطابق اتنا تراشے کہ کھانے میں تکلیف نہ ہو اور میل جمع نہ ہو پائے، امام مالک کے یہاں اس بارے میں اتنی شدت تھی کہ مبالغہ کے

---

1 ترمذی عن عائشہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنها: ص ۳، باب ماجاء فی اشعر رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم

2 ابوداؤد، باب ماجاء فی الفرق عن ابن عباس: ۵۷۶/۲

3 ھو قسمته فی المفرق وھو وسط الرأس، عون المعبود: ۹۱/۱۱

ساتھ مونچھ تراشنے والے کو مستحق سرزنش تصور کرتے اور مونچھ مونڈانے کو بدعت قرار دیتے۔[1] ہاں مجاہدین رعب پیدا کرنے کے لئے بڑی مونچھ رکھیں تو بہتر ہے۔[2] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مونچھ کے دونوں کنارے بڑے رکھتے تھے۔[3] بہرحال مونچھ کو معمولی طور سے تراشنا بہتر ہے یا مبالغہ کے ساتھ تراشنا؟ اس سلسلہ میں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں اور ان کے پاس اپنی رائے کے لئے مناسب بنیادیں بھی موجود ہیں لیکن حدیث کے مجموعی الفاظ سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ معمولی طور پر مونچھیں تراشی جائیں۔ اور ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ معمول مبارک بھی یہی تھا۔[4] ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم چالیس دنوں میں ایک بار مونچھیں ضرور تراش لی جائیں۔[5] ــــــ امام نووی نے مونچھ تراشنے میں مستحب قرار دیا ہے کہ دائیں جانب سے شروع کرے اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر کام دائیں سے شروع کرنے کو پسند فرماتے تھے۔[6]

داڑھی

داڑھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ترین سنت اور شعائر میں سے ہے۔ موجودہ دور میں بعض اہل علم کا یہ خیال کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ک سنت طبعی تھی اور عربوں کے رواج کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی رکھ لی تھی، نری گمراہی اور کھلا ہوا مغالطہ ہے، داڑھی کے تاکید کے سلسلہ میں کثرت سے روایات موجود ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی رکھنے کی تاکید فرمائی ہے مثلاً ابن عمر رضی اللہ

---

q دیکھئے زاد المعاد: ۶۲/۱ فصل فی ھدیہ فی الفطرۃ وتوابعھا
w بخاری، عن ابن عمر باب قص الشارب: ۸۷۴/۲
e فتح الباری: ۴۲۵/۱۰
r دیکھئے شرح مھذب: ۲۸۷/۱۰، فتح الباری: ۴۲۵/۱
q فتح الباری: ۴۲۵/۱۰ w عالمگیری: ۵۵۷/۵

تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ "وفروا اللحی واحفوا الشوارب" داڑھی رکھو اور مونچھیں خوب پست کرو۔[1] ظاہر ہے کہ اگر داڑھی کی شرعی حیثیت نہ ہوتی تو اس درجہ تاکید واہتمام کی ضرورت نہ ہوتی، پس داڑھی کا مونڈانا حرام اور داڑھی کا رکھنا واجب ہے۔

مقدار

ایک مشت داڑھی رکھنی مسنون ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی کے عرض وطول سے تراشا کرتے تھے۔[2] ـــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کی مقدار کیا ہوتی تھی؟ اس کی تفسیر و وضاحت حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عمل سے ہوتی ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ حج وعمرہ کے موقعہ پر ایک مشت سے زیادہ داڑھی تراش لیا کرتے تھے۔[3] تاہم حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کا خیال ہے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ عمل کچھ حج وعمرہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ جب بھی داڑھی کی لمبائی یا چوڑائی کی وجہ سے صورت غیر متوازن ہوتی تھی، بال تراشا کرتے تھے۔[4] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک شخص کی بڑی داڑھی دیکھی تو ایک مشت سے زیادہ کو کاٹ دیا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح کا عمل منقول ہے۔[5]

انہی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے فقہاء نے ایک مشت داڑھی کو

---

e شرح مہذب: ۲۸۸/۱

r زاد المعاد: ۶۲/۱، فصل فی ھدیہ فی قص الشارب

t ابوداؤد، عن انس باب فی اخذ الشارب: ۵۷۷/۲

y شرح مہذب: ۲۸۸/۱

q بخاری باب تقلیم الاظفار: ۸۷۵/۲

w ترمذی بسند ضعیف باب ماجاء فی الاخذ من اللحیة، عن عمرو بن شعیب

مسنون قرار دیا ہے۔[1]

دین میں سنت کی اہمیت وعظمت کس درجہ ہے؟ اس سلسلہ میں علامہ حصفکی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی بات لکھی ہے جو ہر مسلمان کو لرزا دینے کے لئے کافی ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ''سنت کے ترک سے گو انسان دوزخی نہیں ہوتا مگر وہ شفاعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم ہوگا[2] اور کون مسلمان اس محرومی پر خود کو آمادہ کرسکتا ہے؟؟؟''

داڑھی کے بعض اور احکام

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی چڑھانے کو بھی منع فرمایا ہے یہاں تک ارشاد فرمایا کہ جس نے داڑھی چڑھائی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے بری ہیں ''مــــن عقد لحيته فان محمد[3] خطابی نے اس کی شرح میں داڑھی چڑھانے اور گرہ لگانے کے علاوہ بہ تکلف داڑھی کے بال میں شکن پیدا کرنے کو بھی شامل کیا ہے۔[4] اسی طرح داڑھی کے سفید بال نکالنا بھی مکروہ ہے۔[5] تاکہ مصنوعی طور پر اپنی جوانی کو بچائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بال نہ نکالو کہ یہ قیامت کے دن مسلمانوں کے لئے نور ہوگا۔[6] داڑھی کو بالکل چھوڑ دینا یا پراگندہ رکھنا کہ لوگ اس کو زاہد اور دنیا سے بے رغبت سمجھیں، بھی مکروہ ہے بلکہ مشہور بشر حافی نے ریا کی وجہ سے

عن ابيه عن جده: ۱۰۵/۲

e بخاری باب تقليم الاظفار: ۸۷۵/۲

r فتح الباری: ۶۲۹/۱۰

t عمدة القاری: ۶۷/۲۲

q فتاوی هنديه: ۵۵۸/۵

w ردالمحتار، كتاب الحظر والاباحة، اوائل باب

ان دونوں باتوں کو شرک (خفی) قرار دیا ہے۔[1]

نچلے ہونٹ کے نیچے جو بال ہیں، ان کو بھی اکھاڑنا مکروہ ہے۔[2] بلکہ عالمگیری میں تو بدعت قرار دیا گیا ہے۔[3] امام احمد اور امام ابو یوسف حلق کا بال صاف کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ عام فقہاء احناف مکروہ کہتے ہیں۔[4] چہرہ یعنی رخساروں کا بال کاٹنے میں بھی مضائقہ نہیں۔[5]

خضاب کا استعمال

بال کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ خضاب کے استعمال کا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چوں کہ یہود و نصاریٰ خضاب کا استعمال نہیں کرتے ہیں اس لئے تم کیا کرو۔[6] فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوبکر کے والد حضرت ابوقحافہ اس حال میں لائے گئے کہ سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید تھے، ارشاد ہوا کہ سیاہ رنگ سے بچتے ہوئے کسی رنگ کا خضاب استعمال کیا جائے۔[7] خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب استعمال کرنے اور نہ کرنے کی بابت گو راویوں کی رائیں مختلف ہیں لیکن یہ بہرحال ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے خضاب کا استعمال فرمایا ہے۔[8]

"وکفی بھما قدوۃ" لئے خضاب کا استعمال بہتر ہے۔[9]

لیکن اصل قابل توجہ بات یہ ہے کہ کس رنگ کا خضاب استعمال کیا جائے؟ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زعفرانی رنگ کا استعمال ثابت ہے۔[0] ابن عباس

e ابوداؤد عن رویفع: ۶/۱

r شرح مہذب: ۲۹۲/۱

t احیاء علوم الدین مع الاتحاف: ۶۷۸/۲

y ابوداؤد: ۵۷۸/۲

q احیاء العلوم مع الاتحاف: ۶۸۲/۲

w شرح مہذب: ۲۹۱/۱ — e عالمگیری: ۳۵۸/۵

r عالمگیری: ۳۵۸/۵ — t عالمگیری: ۳۵۸/۵

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنا اور کسم نیز زرد خضاب کے استعمال کو پسند فرمایا ہے اور اس پر تحسین کی ہے۔[1] طبرانی کی ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو سرخ رنگ کے خضاب استعمال کرنے کی تلقین فرمائی ہے[2] ـــــ البتہ سیاہ خضاب کے استعمال کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ ایک روایت میں سیاہ خضاب لگانے والوں کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہیں گے "لا یریحون رائحۃ الجنۃ"[3] ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف نگاہ (توجہ) نہیں فرمائیں گے، طبرانی کی ایک روایت میں زبان حق ترجمان سے بددعائیہ کلمات بھی منقول ہیں کہ خدا اس کے چہرہ کو سیاہ کردے۔[4]

تاہم بعض سلف صالحین سے سیاہ خضاب کا استعمال بھی ثابت ہے حضرت حسن و حسین، تابعین میں خود ابن شہاب زہری، ابن سیرین، عروہ بن زبیر اور عبداللہ بن عباس کے صاحبزادہ کے بارے سیاہ خضاب لگانا منقول ہے۔ حضرت عثمان غنی کی طرف بھی اس کی نسبت کی گئی ہے، اور حضرت عقبہ بن عامر کی طرف بھی۔ حضرت عمر کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ سیاہ خضاب کو بیوی کی تسکین اور دشمن کی مرعوبیت کا ذریعہ بتاتے تھے۔[5] لیکن ظاہر ہے کہ اوپر خود جناب رسالت مآب کے جو ارشادات سیاہ خضاب کی مذمت میں گزر چکے ہیں وہ ایک صاحب ایمان کو لرزا دینے کے لئے کافی ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ سیاہ خضاب کا استعمال مکروہ ہے، نووی نے لکھا ہے کہ

---

y بخاری، باب الخضاب: ۸۷۵/۲، ابوداؤد، باب فی الخضاب: ۵۷۸/۲

u ابوداؤد، عن جابر باب فی الخضاب: ۵۷۸/۲

i ابوداؤد، عن انس   o المغنی: ۶۶/۱

p ابوداؤد، باب فی خضاب الصفرۃ: ۵۷۸/۲

q ابوداؤد، باب فی خضاب الصفرۃ: ۵۷۸/۲   w فتح الباری: ۴۳۹/۱۰

e ابوداؤد، باب ماجاء فی خضاب السواد: ۵۷۸/۲

فقہاءاس پر متفق ہیں۔[1] البتہ بعض فقہاء نے مجاہدین کے لئے اجازت دی ہے۔[2] امام اسحاق نے عورت کو اجازت دی ہے کہ شوہر کے لئے آراستہ ہونے کی غرض سے استعمال کرسکتی ہے۔[3] امام زہری غالباً ان جوانوں کو اجازت دیتے تھے جن کے بال طبعی وقت سے پہلے سفید ہوجائیں۔[4]

قاضی ابویوسف کی طرف منسوب ہے کہ اس وقت اجازت دیتے جب بیوی نوجوان ہوں۔[5] ـــــ لیکن غور کیا جائے تو ان میں سے کوئی بھی عذر ایسا نہیں جو صریح ارشادات نبوی کے مقابلہ میں قابل توجہ ہو، سوائے جہاد والی صورت کے کہ یہ ایک دینی ضرورت ہے۔ رہ گئے صحابہ کے آثار تو ایسی واضح حدیثوں کی موجودگی میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو ان نسبتوں کو مشکوک سمجھا جائے یا عذر جہاد پر محمول کیا جائے۔ واللہ اعلم۔

پس خضاب کے سلسلہ میں احکام کا خلاصہ اس طرح ہے:

1. سیاہ کے علاوہ دوسرے رنگ کا خضاب استعمال کرنا مستحب ہے۔
2. خضاب استعمال نہ کیا جائے تو بھی مضائقہ نہیں کہ حضرت علی، ابی ابن کعب، انس، سلمہ بن اکوع وغیرہ بہت سے فقہاء صحابہ سے بال کا رکھنا ثابت ہے۔[6]
3. بلکہ جن علاقوں میں خضاب کا رواج نہ ہو اور خضاب استعمال کرنے کی وجہ سے اس پر انگشت نمائی ہونے لگے تو اس کے لئے خضاب سے گریز ہی بہتر ہے۔[7]
4. حناء (مہدی) اور کسم کے رنگ کا خضاب مستحب ہے۔[1]

---

r عمدۃ القاری: ۵۱/۲۲ گو ابوداؤد کی اول الذکر روایت کے علاوہ عام روایات کی صحت محدثین کے ہاں متفق علیہ نہیں، خود آخر الذکر روایت کے بارے میں ابن حجر کا بیان ہے "اسنادہ لین" فتح الباری: ۴۳۴/۱۰

t عمدۃ القاری: ۵۱/۲۲

q شرح مہذب: ۲۹۴/۱ w شرح مہذب: ۲۹۴/۱ e المغنی: ۹۷/۱

r چنانچہ اس عبارت پر غور کیا جائے: "کنا نخضب بالسواد اذ کان الوجہ جدیدا فلما

5 سیاہ خضاب مکروہ ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ خضاب پوڈر کی صورت ہو یا سیال کی صورت میں۔ پیسٹ ہو یا اس کی کوئی خاص قسم کی کنگھی، حکم بہرصورت یکساں ہے۔

اپنے بال میں دوسروں کے بال کی آمیزش

زینت و آرائش میں غلو عورتوں کے لئے بھی شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اسی غلو کی ایک صورت فطری ساخت کو چھپانا اور مصنوعی طریقہ پر خود کو زیادہ حسین بنا کر پیش کرنا ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال کے ساتھ دوسرے کے بال جوڑنے کو شدت سے منع فرمایا ہے بلکہ لعنت بھی بھیجی ہے "لعن الواصلة والمستوصلة"[2] یہاں تک کہ مرض کی بنا پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی، اسی لئے بعض فقہاء نے تو بال کے ساتھ کسی بھی شئے کے جوڑنے کو منع کیا ہے، بال ہو یا کپڑا۔[3] لیکن عام رائے یہی ہے کہ بجائے بال کے کوئی اور شئے مثلاً ریشمی یا اونی دھاگے وغیرہ کی چوٹی لگائی جائے تو حرج نہیں۔[4] یہ علاوہ ابن عباس اور دوسرے صحابہ کے امہات المؤمنین حضرت ام سلمہ اور حضرت عائشہ[5] سے بھی مروی ہے کہ ان سے بڑھ کر خواتین کے شرعی احکام سے اور کون آگاہ ہوسکتا ہے؟ امام طحاوی کا بیان ہے کہ بال کے ساتھ جوڑنے کی ممانعت حضرت عائشہ سے مروی ہے اور خود آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے یہ بھی ثابت ہے کہ دلہن کے بالوں کے ساتھ اونی دھاگے گوندھنے پر انکار نہیں فرمایا۔[6] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ منشا اپنے بال کے ساتھ کسی اور کے بال جوڑنے کی ممانعت ہے، چنانچہ فقہاء احناف کی بھی یہی رائے ہے:

"واذا صلت شعرها بشعر غيرها فهو مكروه واختلفوا

نغص الوجه والاسنان تركناه" فتح الباري: ۱۰/۴۳۹

t عالمگیری: ۵/۳۷ نیز: ۵/۳۹۵ باب العشرون فی الزینة واتخاذ الخضاب

y فتح الباري: ۱۰/۴۳۵

فی جواز الصلوۃ منھا فی ھذہ والمختار انہ یجوز[1]"

D: ''دوسرے کا بال اپنے بال کے ساتھ ملائے تو مکروہ ہے، ہاں ان بالوں کے ساتھ نماز کے جائز ہونے میں اختلاف ہے اور صحیح یہی ہے کہ جائز ہے۔''

آدمی کا بال نہ ہو، کسی اور جانور کا بال ہو جو بال کے ساتھ لگایا گیا ہو یا بال کے جوڑے میں رکھ دیا گیا ہو تو بھی حرج نہیں۔[2]

خواتین کے لئے بال کے بعض ضروری احکام

اگر عورت کی داڑھی یا مونچھ وغیرہ نکل آئے تو ایسے بال کا اکھاڑ لینا مستحب ہے۔[3] لیکن اس کے علاوہ چہرے سے بال کا اکھاڑنا مثلاً بھوؤں کو باریک کرنے یا ان کے درمیان فصل پیدا کرنے کی غرض سے ایسا کرنا مکروہ ہے۔ حدیث میں ایسی عورتوں کو ''متنمصات'' کہا گیا ہے اور ان پر لعنت کی گئی ہے۔[4] امام ابوداؤد نے اس کی تشریح یہی کی ہے کہ بال اکھاڑ کر بھووں کو باریک وخوبصورت بنایا جائے۔[5] ہاں خلاف عادت چہرہ پر ایک دو بال نکل آئے تو اس کے دور کر لینے میں مضائقہ نہیں۔[6]

احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بال کے معاملہ میں بھی شریعت نے غیر مسلموں کی مشابہت کو ناپسند کیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء مانگ نکالنے کو کفار مکہ کے تشبہ کی وجہ سے اور بعد میں سیدھا بال رکھنا (سدل) یہود

---

u فتح الباری: ۴۳۵/۱۰

q المغنی: ۶۶/۱

w بخاری عن عائشه و عمر، باب وصل الشعر: ۸۷۸/۲

e فتح الباری: ۴۵۸/۱۰

r فتح الباری: ۴۵۸/۱۰

t عمدۃ القاری: ۶۴/۲۲

y دیکھئے، المعتصر من المختصر: ۳۸۸/۲ فی صلة الشعر

q البحر الرائق: ۲۰۵/۸

w عالمگیری: ۳۵۸/۵ بحوالہ قاضی خاں

کے مشابہت کی وجہ سے ترک کر دیا تھا ــــــ عورتوں کے بال کے سلسلہ میں ملک میں جو فیشن نکل رہے ہیں اور جن میں عموماً فلمی اداکاراؤں اور مغربی تہذیب کی نمائندوں کی وضع کو اسوہ بنایا جاتا ہے، کا اس پہلو سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مردوں کی مشابہت سے بھی منع فرمایا ہے۔ پس عورتوں کے بال اس طرح سے کاٹنا کہ وہ مردوں کی طرح ہو جائیں، کراہت سے خالی نہیں، درمختار میں ہے کہ عورت اگر اپنے سر کا بال کٹائے تو گنہ گار اور مستحق لعنت ہوگی۔[1] یہی رائے ماضی قریب کے مشہور صاحب علم مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی بھی ہے۔[2]

اسی حکم میں عورتوں کا ٹیڑھی مانگ نکالنا اور بالوں کی کوئی بھی ایسی ساخت داخل ہے جس سے مردوں یا فاسق وفاجر عورتوں سے مشابہت ہوتی ہو۔

بغل کا بال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغل کا بال اکھاڑنے (نتف الاب ــــــ کو امور ــــــ ط) فطرت میں سے قرار دیا ہے۔[3] چنانچہ اس کے مسنون ہونے پر اتفاق ہے۔[4] اگر اکھاڑنے میں اذیت ہو تو بال کا مونڈ لینا یا تراشنا یا کسی اور طریقہ پر بال صاف کر لینا بھی کافی ہے۔[5] اکھاڑنا اس لئے بہتر ہے کہ اس کی وجہ سے بال کم اگ سکے گا اور گندگی کم جمع ہو سکے گی۔ بال مونڈنے کی شکل میں بال کی پیدائش بڑھ جائے گی اور اس کی وجہ سے بدبو میں بھی اضافہ ہوگا۔ چالیس روز میں کم از کم ایک بار بغل کی صفائی مستحب ہے۔[1] بغل صاف کرتے ہوئے مستحب ہے کہ دائیں بغل سے شروع کیا جائے۔[2]

سینے اور پیٹھ کا بال بلا عذر نہیں کاٹنا چاہئے۔ فقہاء نے ان کے مونڈنے کو خلاف ادب قرار دیا ہے۔[3] علامہ ابن نجیم مصری نے لکھا ہے کہ معمولی طور پر بھوں کے بال

e فتح الباری: ۱۰/۳۴۲

r بخاری باب المتنمصات: ۲/۸۷۹

t ابوداؤد، التی تنقش الحاجب حتی ترقہ، باب فی صلۃ الشعر: ۲/۵۷۴

کاٹے جاسکتے ہیں۔[4] لیکن یہ غالبًا صرف اس صورت میں ہے جب کہ بھوں کے بال غیر معمولی طور پر بڑے ہوجائیں یا بھوں کے بال سے آنکھ میں تکلیف ہو، اس لئے کہ گزر چکا ہے کہ محض آرائش اور زینت کے لئے عورتوں کو بھی بھوں کے بال اکھاڑنے سے منع کیا گیا تو اس جذبہ کے ساتھ بال کا تراشنا اور کاٹنا بھی ممنوع ہونا چاہئے اور مردوں کے لئے بدرجۂ اولیٰ اس کی کراہت ہونی چاہئے۔

موئے زیرِ ناف

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چھوٹے بڑے اور خلوت وجلوت کے مسائل میں انسانیت کی رہنمائی فرمائی ہے، یہ جامعیت اور ہمہ گیری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنت ہے کہ کسی پیشوائے مذہب کی زندگی میں اس کو تلاش کرنا محض اپنی محنت کے ضائع کرنے کے مترادف ہے چنانچہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زوجین کے حقوق کو واضح فرمایا اور ازدواجی زندگی کے داخلی مسائل کے بارے میں بھی روشنی عطا فرمائی وہیں ایک باپ کی طرح استنجاء اور قضاء حاجت کے اصول بھی بتائے اور صفائی ستھرائی کے طریقے بھی واضح فرمائے۔

انہی تعلیمات میں سے ایک یہ ہے کہ مرد وعورت کے اعضاء تناسل کے اردگرد جو بال نکل آئے انہیں صاف کیا جائے، چنانچہ اس کے لئے بعض روایات میں "حلق العانة" بعض میں "استحداد" یعنی لوہے کی چیز سے بال کی صفائی کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، اس کے مستحب ہونے پر امت کا اجماع ہے۔[1] اور اگر شوہر بیوی سے تقاضہ کرے تو پھر بیوی کے لئے واجب ہوتا ہے۔[2] چالیس دن سے زیادہ تاخیر مکروہ ہے، کم سے کم کوئی وقت متعین نہیں بلکہ افزائش بال کے اعتبار سے مختلف لوگوں کے لئے الگ الگ مدت ہوسکتی ہے۔[3] مقصود بال کو صاف کرنا ہے چاہے اس کے

---

1 ویجوز للمرأة ان تلقی الاذی عن وجهها، البحر الرائق: ۸/۲۰۵

2 درمختار: ۵/۲۶۱ 3 امداد الفتاوی: ۴/۲۹۸

لئے استرے کا استعمال کیا جائے یا چونے کا۔[4] لیکن عورتوں کے لئے بال کا اکھاڑنا زیادہ بہتر ہے۔[5] بہتر ہے کہ اس کام کو خود انجام دے کہ یہی تقاضۂ حیا ہے دوسرے سے یہ کام لینا حرام ہے، ہاں زوجین ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں، گو کراہت سے یہ بھی خالی نہیں۔[6] موئے زیر ناف کی صفائی میں بہتر ہے کہ اوپر یعنی ناف کی جانب سے ابتداء کرے۔[7] ـــــ پچھلے حصہ میں جو بال نکل آئیں ان کی صفائی بھی مستحب ہے۔[8] البتہ چوں کہ حدیث میں اس کا ذکر نہیں اس لئے اگر چالیس دنوں سے زیادہ بھی ہو جائے تو کراہت پیدا نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم۔

ناخن تراشنا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امور فطرت میں شمار کرتے ہوئے جن باتوں کا حکم فرمایا ان میں سے ایک ناخن کا تراشنا بھی ہے۔[9] اس لئے کہ ناخن کے بڑھ جانے کی صورت میں میل پیدا ہو جانے اور اس سے انسانی صحت کو نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے۔ چوں کہ مختلف لوگوں میں اجزاء جسمانی کے نشو و نما کی الگ الگ صلاحیت ہوتی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ کوئی ایک قطعی مدت نہیں بیان کی جا سکتی۔ تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چالیس دن سے یہ مدت بڑھ نہ جائے اور اس کے اندر ناخن تراش لیا جائے۔[1] امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ کم سے کم ہر جمعہ کو ناخن کاٹ لینا چاہئے۔[2] ناخن قینچی وغیرہ سے کاٹنا چاہئے۔[3] اس میں مرد و عورت کا حکم یکساں ہے۔ البتہ فقہاء نے دانت سے ناخن تراشنے کو منع کیا ہے۔[4] ناخن کاٹنے سے پہلے

e ابوداؤد، باب فی اخذ الشارب: ۵۷۷/۲
r شرح مھذب: ۸۸/۱ t الاتحاف للزبیدی: ۶۵۱/۲
q احیاء العلوم مع الاتحاف: ۶۵۱/۲ w اتحاف: ۶۵۲/۲
e بحر: ۲۰۴/۸ r ولا بأس بان یاخذ حاجبین بحر: ۲۰۴/۸
q الاتحاف للزبیدی: ۶۵۲/۲ w شرح مھذب: ۲۸۹/۱

ہاتھ دھولیا جائے تا کہ ناخن نرم ہو اور بسہولت کاٹ لیا جائے۔[5] اور ناخن کاٹنے کے بعد بھی اس حصہ کو دھولیا جائے۔[6] مختلف دنوں میں ناخن تراشنے پر ثواب اجر والی روایت جو مشہور ہے وہ ضعیف محض اور نا قابل اعتبار ہے۔[7]

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ناخن تراشنے میں مسنون ترکیب یہ بتائی ہے کہ پہلے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت، پھر وسطیٰ، بنصر اور خنصر (چھوٹی انگلی) کے ناخن تراشے اس کے بعد بائیں ہاتھ میں خنصر سے شروع کر کے بالترتیب ابہام تک پہنچے پھر اخیر میں دائیں ہاتھ کے ابہام کا ناخن تراشا جائے۔[8] لیکن فقہ و کلام کے مشہور امام ابوعبداللہ مالکی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ دائیں ہاتھ کے ابہام کا ناخن کاٹنے کے بعد ہی بائیں ہاتھ کا ناخن تراشا جائے۔[9] تاہم علامہ زبیدی نے نقل کیا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی قوی روایت موجود نہیں۔[0] پاؤں کے ناخن تراشنے کے سلسلہ میں سنت یوں ہے کہ دائیں پاؤں کے خنصر سے شروع کیا جائے اور بائیں پاؤں کے خنصر پر ختم کیا جائے۔ غرض پہلے دائیں پھر بائیں ہاتھ، اس کے بعد دائیں پھر بائیں پاؤں کی ترتیب رکھی جائے۔[!]

چار چیزیں ہیں کہ ان کو دفن کیا جانا چاہئے، ناخن، بال (چاہے جہاں کا ہو) حیض کا کرسف اور خون ـــــ خاص طور پر گندی جگہ پر ان کو ڈالنا مکروہ بھی ہے اور طبی اعتبار سے نقصان دہ بھی۔[1] ـــــ حالت جنابت میں بال کا تراشنا یا ناخن کاٹنا مکروہ ہے۔[2]

e شرح مھذب: ۲۸۹/۱ | r عالمگیری: ۳۵۸/۵
t الاتحاف: ۶۵۲/۲ | y شرح مھذب: ۲۸۹/۱
u عالمگیری: ۳۵۸/۵ | i شرح مھذب: ۲۸۹/۱
o ابوداؤد، باب فی اخذ الشارب: ۵۷۷/۲
q مسلم عن انس: ۱۲۹/۱ | w شرح مھذب: ۲۸۷/۱
e الاتحاف: ۶۵۲/۲ | r ھندیہ: ۳۵۸/۵، الاتحاف: ۶۵۷/۲

%

t اتحاف: ۹۵۸/۲

y المغنی: ۹۶/۱

B

چوتھا باب

خورد ونوش

انسان اس کائنات میں ضرورتوں اور حاجتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اس کے وجود کا کوئی حصہ نہیں جو اپنی حیات و بقا اور حفظ وصیانت میں احتیاج سے فارغ ہو ـــــ لیکن سانس کے لئے ہوا اور پیاس کے لئے پانی کے بعد اس کی سب سے بڑی ضرورت خوراک ہے اور یہی احتیاج وضرورت ہے جس نے زندگی کو متحرک اور رواں دواں رکھا ہے، صبح دم دہقان کا اٹھنا اور زمین کی چھاتی میں دانے بونا۔ مہر نیم روز کی تپش میں عرق آلود مزدوروں کا کھیت کی خدمت میں مصروف رہنا، تجارت وکاروبار اور تمام ہنگامہ ہائے حیات کا حاصل سوائے غذائی ضرورت کی تکمیل کے اور کیا ہے؟

شریعت اسلامی جو انسانی فطرت کے خالق اور انسانی جذبات سے آگاہ خدا کی نازل کی ہوئی ہے، ممکن نہیں ہے کہ وہ فطرت انسانی کے کسی تقاضہ سے صرف نظر کرے چنانچہ اس باب میں بھی اس کی تعلیمات نہایت متوازن اور معتدل ہیں۔ احادیث نبوی میں اس سلسلہ میں واضح ہدایات موجود ہیں اور فقہاء نے انہی کو سامنے رکھ کر آداب واحکام کی وضاحت فرمائی ہے۔

کھانے کی مقدار

انسانی جسم چوں کہ اللہ کی امانت ہے اور اس کی حفاظت وصیانت اور جائز حدود میں اس کی راحت و عافیت کا سامان بہم پہنچانا انسان کے واجبات میں سے ہے، دوسری طرف خورد ونوش میں اس درجہ کا مبالغہ کہ گویا یہی انسان کا مقصد وجود ہے، شرعاً

ناپسندیدہ اور قبیح ہے اس لئے فقہاء نے کھانے کے درجات مقرر کئے ہیں اور ان کے الگ الگ احکام ذکر کئے ہیں۔

کھانے کی اتنی مقدار کہ جس کے ذریعہ انسان خود کو ہلاکت سے بچا سکے اور اس کو ترک کرنے میں ہلاکت کا اندیشہ ہو، فرض ہے، کیوں کہ انسان اس کے ذریعہ فرائض واحکام خداوندی کی تعمیل پر قادر ہو سکے گا اور اپنا فرض ادا کر کے عنداللہ اجر کا مستحق ہوگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر اجر عطا فرمائیں گے یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی جس کو بندہ اپنے منہ میں رکھتا ہے۔ "ان اللّٰہ لیوجر فی کل شیء حتی اللقمة یرفعها العبد الی فیه"

اس سے زیادہ کھانا تاکہ کھڑے ہو کر نماز ادا کر سکے اور بہ سہولت روزہ رکھ سکے، مستحب ہے اس لئے کہ ایسے افعال جن کے ذریعہ طاعت خداوندی کی قوت میسر ہو، بجائے خود طاعت ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ تمام اعمال میں افضل کونسا عمل ہے، فرمایا نماز پڑھنا اور روٹی کھانا۔

قوت جسمانی میں اضافہ کے لئے آسودہ ہونے تک کھانا مباح ہے اس سے زیادہ کھانا جائز نہیں کہ اس میں مال کا ضیاع بھی ہے، اسراف اور فضول خرچی بھی اور یہ صحت جسمانی کے لئے ضرر رساں بھی ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ خوب کھانے میں خیر ہے نہ بھوکے رہنے میں بلکہ اعتدال ومیانہ روی بہتر ہے ہاں اگر آئندہ دن روزہ رکھنے کا ارادہ ہو یا مہمان شریک طعام ہو کہ رک جائے تو اس کو خجالت ہوگی تو ایسی صورت میں حسب ضرورت آسودگی سے زیادہ بھی کھائے تو مضائقہ نہیں، بھوکے رہنے کی ایسی ریاضت کہ عبادات وفرائض کی انجام دہی میں بھی دقت پیدا ہو جائے، جائز نہیں۔[1]

فقہاء کے یہاں خوراک کے سلسلہ میں ان تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ انسان کا

u المقاصد الحسنه   i احیاء العلوم مع الاتحاف: ۶۵۵/۲

بالکل نہ کھانا جو انسان کی ہلاکت کا باعث بن جائے یا اتنا کم کھانا کہ انسان عبادت اور اپنے فرائض کی ادائیگی کے لائق بھی نہ رہے، خدا کی ایک امانت کے ساتھ بے پرواہی اور تغافل ہے، آسودگی سے بھی زیادہ کھانے میں کہ صحت جسمانی کے لئے مضر ہو، بعینہ یہی بات پائی جاتی ہے، کھانا اعتدال کے ساتھ کھایا جائے اور نیت عبادت میں سہولت اور فرائض وحقوق کے ادا کرنے میں آسانی کی ہو تو یہی عمل دنیا عین عمل دین اور یہی عادت عین عبادت بن جاتی ہے۔ شریعت اسلامی میں انسانی جان کی اہمیت اس درجہ ہے کہ اگر فاقہ مستی سے جان جانے کا اندیشہ ہو اور خورد ونوش سے گریزاں رہے، یہاں تک کہ موت آ جائے تو گنہگار ہوگا۔[1]

کھانے کی نوعیت

حلال وطیب غذاؤں میں جو بھی میسر ہو، کھائی جا سکتی ہے، انسانی طبائع اور اذواق کے اختلاف اور حالات و مقامات نیز موسموں کے فرق کی وجہ سے غذا کی نوعیت میں فرق ایک فطری چیز ہے اور اس سلسلہ میں کوئی تعیین وتحدید بالکل خلاف فطرت ہوگی، اسی لئے شریعت نے اس سلسلہ میں کوئی تحدید نہیں کی ہے اور اس کو ذوق ومزاج پر رکھا ہے۔ چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں کہ تفکہاً مختلف قسم کے میوہ جات کے کھانے میں قباحت نہیں کہ یہ بھی "کلوا من طیبات ما رزقناکم" میں داخل ہے۔[2] اسی طرح لذیذ غذاؤں اور فالودہ کھانے میں مضائقہ نہیں "ولا بأس بأكل الفالوذج وانواع الاطعمة الشهية۔[3]"

ہاں یہ ضرور ہے کہ شریعت بحیثیت مجموعی غذا میں سادگی کو پسند کرتی ہے اور مسرفانہ تکلّفات اور تفاخر آمیز جذبات وخواہشات کو پسند نہیں کرتی، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ جو کے آٹے کی روٹی اس طرح پکائی جاتی کہ

o شرح مهذب: ۲۸۹/1 p اتحاف: ۶۵۸/۲

Q هندیه: ۳۵۸/۵

پینے کے بعد چھانا بھی نہ جاتا بلکہ محض پھونکنے پر اکتفاء کیا جاتا جو چھلکا نکل جاتا نکل جاتا اور جو رہ جاتا، رہ جاتا[1] سرکہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بہترین سالن ہے "نعم الادام الخل"[2] کھر چن کو مزے لے کر تناول فرماتے[3] اس طرح کی اور روایات ہیں جو سریر آرائے عرب وعجم بلکہ تاجدار دنیا و عقبٰی کی کمال بندگی اور غایت سادگی کا مظہر ہے۔"صلی اللّٰہ علیہ وسلم"

ہاتھ دھونا اور دھلانا

اسلام جہاں انسانیت کو آخرت کی سعادت سے بہرہ مند کرتا ہے وہیں دنیا کے معاملات اور مقتضیات وعادات میں بھی تہذیب وشائستگی دکھاتا ہے۔خورد ونوش کے باب میں بھی اس کی یہ روشنی موجود ہے، ان میں پہلی چیز کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا ہے جس کو حدیث میں "وضوء طعام" سے تعبیر کیا گیا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے کھانے میں برکت پیدا ہوتی ہے "برکة الطعام الوضوء قبله والوضوء بعده"[4] صفائی ونظافت کے علاوہ اس کا بڑا نفع انسانی صحت کا تحفظ ہے۔ہاتھ ہی جسم کا وہ حصہ ہے جو مختلف افعال میں براہ راست مشغول کیا جاتا ہے، اس سے غیر محسوس طور پر گندگی اور مضر صحت چیزوں کے ہاتھ میں لگے رہنے کا غالب امکان ہے جو کھانے کے ساتھ انسان کے جسم میں داخل ہوسکتی ہیں، ہاتھ دھوکر انسان ایسی چیزوں سے اپنی حفاظت کرتا ہے، کھانے کے بعد ایسی اشیاء کا ہاتھ میں لگا رہنا یوں بھی طبعی نظافت کے خلاف ہے، نیز پہلی صورت سے بھی زیادہ

---

q ھندیہ: ٥/٣٥٨ w ھندیہ: ٥/٣٥٨

q مجمع الانھر: ٢/٥٢٤

q مجمع الانھر: ٢/٥٢٥ w مجمع الانھر: ٢/٥٢٥

e ھندیہ: ٥/٣٤١

q شمائل ترمذی عن سھل بن سعد۔ باب فی صفة خبز رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ

صحت جسمانی کے لئے نقصان دہ۔

ہاتھ دونوں ہی دھوئے جائیں صرف ایک ہاتھ یا چند انگلیوں کے دھونے سے سنت ادا نہ ہوگی اور پہنچوں تک دھوئے جائیں[1] کھانے سے پہلے ہاتھ دھوکر تولیہ کا استعمال نہ کیا جائے، کھانے کے بعد ہاتھ دھوکر تولیہ کا استعمال کرنا چاہئے تا کہ کھانے کا اثر بالکلیہ جاتا رہے[2] صابون وغیرہ کا استعمال کیا جائے تو قباحت نہیں، بلکہ فقہاء نے اجازت دی ہے کہ کوئی خوردنی شئے تنظیف اور صفائی ستھرائی کے لئے استعمال کی جاتی ہو تو اس سے بھی ہاتھ دھوئے جا سکتے ہیں[3] امام خطابی نے اس پر اس سے استدلال کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاتون کو خون حیض دھونے کے لئے نمک کے استعمال کی اجازت دی تھی[4]

بہتر ہے کہ ہاتھ خود دھوئے دوسروں سے مدد نہ لے کیوں کہ یہ بھی ایک طرح کا وضوء ہے، "ھذا کالوضوء ونحن لا نستعین بغیرنا فی وضوئنا[5]" افراد کو ہاتھ دھونا ہو تو ادب یہ ہے کہ پہلے نوجوان پھر عمر رسیدہ لوگ ہاتھ دھوئیں البتہ نوجوان کھانا شروع کرنے میں عمر رسیدہ لوگوں کے شروع کرنے کا انتظام کریں، کھانے کے بعد پہلے عمر رسیدہ پھر نوجوان ہاتھ دھوئیں[6] کہ بڑوں کے پہلے ہاتھ دھونے میں ان کو زیادہ انتظار کرنا ہوگا۔ اس قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ میر مجلس سب سے آخر میں ہاتھ دھوئے، لیکن لوگوں میں اس کے احترام واکرام کی رعایت کرتے ہوئے بہتر سمجھا گیا ہے کہ میر مجلس ہی سے ہاتھ دھلانے کا آغاز ہو[7] فقہاء نے لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے صرف ہاتھ دھویا جائے کلی کی ضرورت نہیں[8]

دُعائیں

علیہ وسلم: ص۹
w شمائل ترمذی عن عائشہ: ص۱۰
e شمائل ترمذی عن انس بن مالک: ص۱۲

کھانا قریب میں رکھ دیا جائے تو یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْ مَارَزَقْتَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، بِسْمِ اللّٰہِ[1]

کھانے کے شروع میں بسم اللہ کہنا چاہئے۔ اگر شروع میں بسم اللہ کہنا بھول گیا، بعد کو یاد آئے تو "بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ" کہا جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے:

"اِذَا اَکَلَ اَحَدُکُمْ فَلْیَذْکُرِ اسْمَ اللّٰہِ فَاِنْ نَسِیَ اَنْ یَّذْکُرَ اسْمَ اللّٰہِ فِیْ اَوَّلِہٖ فَلْیَقُلْ بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ۔[2]

D: "جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اسم باری تعالیٰ کا ذکر کرے اگر شروع میں بھول جائے تو "بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ" کہے۔"

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بسم اللہ ان الفاظ میں کہے، "بِسْمِ اللّٰہِ وَعَلٰی بَرَکَۃِ اللّٰہِ" کھانے سے پہلے یہ دعا بھی پڑھی جائے:

"اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْہِ وَاَطْعِمْنَا خَیْرًا مِّنْہُ۔[3]"

D: "خدایا! جو رزق عطا فرمائی ہے اس میں برکت دے اور اس سے بہتر رزق عطا فرما۔"

اگر مختلف لوگ ساتھ کھا رہے ہوں تو بلند آواز سے بسم اللہ کہنا بہتر ہے تا کہ دوسروں کے لئے بھی تلقین ہو سکے۔[4] کھانا ختم ہو تو اللہ کا شکر ادا کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جب آپ کھانا کھاتے تو فرماتے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ[1]

D: "تمام تعریف خدا کے لئے ہے جس نے کھلایا پلایا اور مسلمان

r شمائل ترمذی عن سلمان فارسی: ص ۱۲

q ھندیہ: ۳۳۷/۵ w ھندیہ: ۳۳۷/۵ e ھندیہ: ۳۳۷/۵

r المغنی: ۲۲۲/۷ t ھندیہ: ۳۳۷/۵ y ھندیہ: ۳۳۷/۵

بنایا۔‘‘

بعض روایات میں یہ دعاء بھی نقل کی گئی ہے:

”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَ وَاَرْوٰی وَاَنْعَمَ وَاَفْضَلَ[2]“

D: ’’خدا کی تعریف جس نے کھلایا، سیراب کیا اور انعام وفضل فرمایا۔‘‘

ایک اور روایت میں ہے:

”اَللّٰهُمَّ اَطْعَمْتَ وَسَقَیْتَ وَاَغْنَیْتَ وَاَقْنَیْتَ وَهَدَیْتَ وَاَحْیَیْتَ، فَلَكَ الْحَمْدُ عَلٰی مَا اَعْطَیْتَ[3]۔“

D: ’’الٰہا! تو نے کھلایا پلایا، کھانے کی چیزوں کو میرے تابع کیا اور بے نیازی عطا فرمائی، رہنمائی بھی کی اور زندگی بھی بخشی، پس تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے عطا فرمایا۔‘‘

یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ مَنَّ عَلَیْنَا وَهَدَانَا وَاَشْبَعَنَا وَاَرْوَانَا وَكُلَّ الْاِحْسَانِ آتَانَا۔“ [4]

D: ’’خدا کی تعریف جس نے ہم پر احسان کیا، ہدایت دی آسودہ وسیراب کیا اور تمام احسانات وبھلائی فرمائی۔‘‘

حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے:

”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَ وَسَقٰی وَسَوَّغَهٗ وَجَعَلَ لَهٗ مَخْرَجًا۔“ [1]

---

u هنديه: ۳۶۵/۵ i البحر الرائق

q عمل اليوم والليلة: ص۲۱۷ w عمل اليوم والليلة: ص۱۱۸

e ترمذی، عن ابن عباس باب ما يقول اذا كل اطعاما: ۱۸۳/۲

r هنديه: ۳۳۷/۵

D: ''خدا کی تعریف جس نے مجھے کھلایا، پلایا، اسے نگلنے کے قابل بنایا اور اس کے نکلنے کے لئے راہ بنائی۔''

البتہ اگر ابھی دسترخوان کے کچھ شرکاء کا کھانا تمام نہ ہوا ہو تو زور سے تحمیدی کلمہ نہ کہے۔[2] دسترخوان اٹھانے کے بعد یہ دعا مروی ہے:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا مُبَارَكًا فِيْهِ غَيْرَ مَكْفِيٍّ وَّلَا مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ رَبُّنَا''

D: ''تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں بہت ساری تعریفیں پاکیزہ اور مبارک۔ پروردگارا! ہم اس کھانے کو کافی سمجھ کر یا اس سے بے رغبت ہو کر یا خود کو مستغنی سمجھ کر نہیں اٹھا رہے ہیں۔''

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دسترخوان بچھاتے ہوئے بسم اللہ اور اٹھاتے ہوئے الحمد للہ کہے۔ اگر کسی متعدی مرض میں مبتلا شخص کے ساتھ کھائے تو یہ کہے:

''بِسْمِ اللّٰهِ، ثِقَةً بِاللّٰهِ وَتَوَكُّلًا عَلَيْهِ''

D: ''خدا کے نام سے اس پر بھروسہ اور توکل کرتے ہوئے۔''

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجذوم شخص کے ساتھ کھانا تناول فرمایا تو یہی ارشاد فرمایا۔[3]

دعاؤں کا اصل مقصود

یہ دعائیں دراصل شریعت اسلامی کی ذہنی تربیت و پرداخت کے اس مزاج کے عین مطابق ہیں جو قدم قدم پر انسان کو خدا سے تعلق کی یاد دلاتی ہے اور متوجہ کرتی ہیں، اس سے خدا کی شان ربوبیت اور کمال قدرت کا اظہار ہوتا ہے، ایک مسلمان جب

q ترمذی، عن ابی سعید باب ما یقول اذا فرغ من الطعام: ۱۸۹/۲

w المغنی: ۲۲۲/۲

کھانے سے پہلے خدا کا نام لیتا ہے، کھانے کے درمیان خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور کھانے کے بعد بھی اس کی زبان حمد باری سے زمزمہ سنج ہوتی ہے دستر خوان بچھاتا ہے تو اسی کے نام سے اور اٹھاتا ہے تو اسی کے ذکر سے۔ تو یہ توحید ہی کا مکرر و مؤکد اقرار و اعتراف ہوتا ہے جو اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ یہ غذا محض خدا ہی کی قدرت سے اس کو عطا ہوئی ہے، ہر دانہ جو انسان کے حلق سے اترتا ہے، خدا کی قدرت کی کتنی ہی جلوہ فرمائیوں کے بعد وجود میں آیا ہے، سورج نے اس کے لئے خود کو جلایا ہے، چاند نے اپنی ٹھنڈک پہنچائی ہے، شبنم کی پھوار اس پر نثار ہوئی ہے، زمین نے اپنے سینہ و جگر کا چاک ہونا قبول کیا ہے، بادلوں نے سمندر سے خراج آب وصول کیا ہے۔ ہواؤں نے ان بادلوں کی بار برداری کی ہے، پھر یہ خدا ہی کی قدرت ہے کہ ایک ہی طرح کے عناصر سے مرکب ہونے والی ان اشیاء میں کہیں حلاوت ہے کہیں ملاحت کہیں کھٹاس ہے کہیں تلخی، رنگ و بو کے فرق نے بھی ان کو ایک گلدستہ سا بنا دیا ہے، پھر خود انسان کے جسم میں نظام ہضم کا ایک عالم وعبرت و موعظت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، آفاق و انفس کی یہ ساری داستانیں چشم ہائے عبرت و نگاہان بصیرت کے سامنے چاول کے ایک ایک دانہ اور پانی کے ایک ایک قطرہ کے ساتھ اس طرح رونق افزا ہوتی ہیں کہ خدا کے ذکر و ستائش کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ "سبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم"

کس طرح کھایا جائے؟

کھانے کے لئے دایاں ہاتھ استعمال کیا جائے، بائیں ہاتھ کے استعمال کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا ہے، "اِذَا اَکَلَ اَحَدُکُمْ فَلْیَاْکُلْ بِیَمِیْنِہٖ" کیوں کہ بائیں ہاتھ کا استعمال نجاست کی تطہیر کے لئے ہے، اس کا کھانے کے لئے استعمال کرنا نظافت سے بعید ہے، ہاں دائیں ہاتھ کے استعمال میں کوئی عذر ہو تو بایاں

e عمل الیوم واللیلۃ: ص ۲۲۰، باب ما یقول اذا اکل

ہاتھ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مسنون طریقہ یہ ہے کہ تین انگلیوں سے کھایا جائے، کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے "كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ يَاْكُلُ بِثَلَاثِ اَصَابِعَ"[1] یہ ہے کہ بلاضرورت ہاتھ کا زیادہ حصہ کھانے میں آلودہ نہ ہو، اسی قدر انگلیاں استعمال کی جائیں جن سے بہ سہولت کھایا جاسکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چوں کہ کھجور اور روٹی ہی عام غذا تھی اس لئے تین انگلیوں سے بہ سہولت کھایا جاسکتا تھا فی زمانہ چاول وغیرہ کھانے میں چوں کہ چار انگلیاں استعمال کرنی ہوتی ہیں اس لئے اس میں بھی کوئی حرج نہیں ـــــ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی بھی خاص ہدایت فرمائی ہے کہ کھانے کے بعد پلیٹ انگلیوں کے ذریعہ چاٹ لی جائے۔ انگلیاں چاٹے بغیر ان کو پونچھ لینے سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا "وَلَا يَمْسَحُ يَدَهٗ بِالْمِنْدِيْلِ"[2] اس سے معلوم ہوا کہ انگلیاں چاٹے بغیر ہاتھ دھویا نہ جائے، یہ بھی مسنون ہے، اس کی ایک طبی مصلحت بھی ہے، کھانے کے درمیان انگلیوں پر لعاب لگ جاتا ہے اور چاٹنے کی وجہ سے منہ میں مزید لعاب پیدا ہوتا ہے، یہ لعاب نظام ہضم میں نہایت معاون ہوتا ہے، کھانے کے بعد برتن میں بھی ہاتھ دھویا جاسکتا ہے[3] علامہ سخاوی نے بھی لکھا ہے کہ اس کی ممانعت پر کوئی حدیث نہیں[4] ہاں اس کا تعلق رہائش، عرف وعادت اور آداب سے ہے۔ جہاں اس طرح برتن میں ہاتھ دھونے کو ناپسندیدہ تصور کیا جاتا ہے وہاں برتن میں ہاتھ دھونا خلاف مروت ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کا آغاز بھی نمکین شئے سے کرتے اور اسی طرح کھانا ختم بھی کرتے[1] کھانے میں کوئی بھی ایسا عمل جو انسانی صحت کے لئے مضر ہو مکروہ

---

r عمل الیوم واللیلۃ: ص۲۲۱

q عمل الیوم واللیلۃ: ص۲۲۲، باب ما یقول اذا شرب

w ھندیہ: ۳۳۷/۵ e عمل الیوم واللیلۃ: ص۲۱۹، باب ما یقول اذا

ہے، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے میں پھونکنے سے منع فرمایا۔[2] فقہاء نے کھانے کو سونگھنے اور گرم گرم کھانا کھانے کو ناپسند کیا ہے۔[3] یہ بھی مسنون ہے کہ کھانا کنارہ سے لیا جائے پلیٹ کے وسط سے کھانے کا آغاز مکروہ ہے[4] کہ یہ شائستگی کے خلاف ہے، راستہ چلتے کھانا مکروہ اور خلاف مروت ہے۔[5] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے کھڑے کھانے سے بھی منع فرمایا ہے۔[6] البتہ کھلے سر کھانے میں مضائقہ نہیں، "وَلَا بَأسَ بِالْاَکْلِ مَکْشُوفَ الرَّأسِ وَھُوَ الْمُفَضَّلُ"[7] کی خامی اور عیب کا اظہار بھی روا نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ کھانا پسند آتا تو تناول فرماتے، پسند نہ ہوتا تو نہ کھاتے لیکن عیب نہ لگاتے۔[8]

کھانے کی مسنون نشست

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خورد ونوش کے طریقوں میں بھی بندگی وفروتنی نمایاں تھی، خود ارشاد ہوا "اَنَا آکُلُ کَمَا یَأکُلُ الْعَبْدُ" پیچھے آگے کی جانب ٹیک لگا کر کھانا یا بائیں ہاتھ کا سہارا لے کر کھانا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔[9] آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طریقوں سے کھانا ثابت ہے۔ اکڑوں، ایک پاؤں بچھا کر اور دوسرا اٹھا کر کھانا۔ تورک کے ساتھ بیٹھنا۔[1]

اسی طرح کھانے کے طور وطریق میں بے جا تکلّفات (جو سادگی کے تقاضوں کے خلاف ہوں) کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اکل

q مسلم عن ابن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ

q مسلم، کتاب الاطعمۃ: ۲/۱۷۵

w مسلم، ترمذی عن جابر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ: ۲/۱۷۵

e المغنی: ۷/۲۲۲ r المقاصد الحسنہ

q کذا فی الخلاصہ، ھندیہ: ۵/۳۳۷

چاقوں سے کاٹ کر گوشت کھانے کو منع فرمایا اور فرمایا کہ یہ اہل عجم کا طریقہ ہے "لَا تَقْطَعُوا اللَّحْمَ بِالسِّكِّيْنِ فَاِنَّهٗ مِنْ صُنْعِ الْاَعَاجِمِ"[2] لیکن کوئی حرمت کے درجہ کی نہیں ہے، کبھی آسانی کے لئے چھری کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بخاری کی روایت ہے کہ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بکرے کا دست کاٹ کر کھایا کرتے تھے "كان يحتز من كتف شاة في يده"[3] اسی روایت کی روشنی میں ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ چھری سے گوشت کے ٹکڑے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[4] صاحب مجمع الانہر کا بیان ہے کہ: "لَا يُكْرَهُ قَطْعُ اللَّحْمِ وَالْخُبْزِ بِالسِّكِّيْنِ"[5]

روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی میز پر کھانا نہیں کھایا۔[6] ہاں دستر خوان کا استعمال کیا ہے۔[7] اسی طرح طشتری بھی استعمال نہیں فرمائی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی کھانے پینے کے طور وطریق میں سادگی شریعت میں مطلوب ہے۔ میز وکرسی کا استعمال ناجائز تو نہیں لیکن سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے۔

کچھ اور آداب

اللہ کی طرف سے عطا کردہ رزق کا احترام ضروری ہے اور کوئی بھی عمل جس سے

---

w ترمذی عن ابن عباس، باب کراهية النفخ في الاناء: ٢/١١
e هندیه: ٥/٣٣٨ r هندیه: ٥/٣٣٨ t هندیه: ٥/٣٣٨
y ترمذی عن انس بن مالک، باب نهی عن الشرب قائما: ٢/١٠
u هندیه: ٥/٣٣٨ i بخاری عن ابی هریره: ٢/٨١٤
o بخاری باب الاکل متکئا: ٢/٨١٢ عن ابی جحیفة رضی اللّٰه تعالٰی عنه
q زاد المعاد: ٣/١٦١، فصل فی هدیه فی هیئة الجلوس للاکل
w ابوداؤد عن عائشه، باب فی اکل اللحم: ٢/٥٣٠

اس کی بے احترامی کا اظہار ہوتا ہو، مکروہ ہے۔ چنانچہ روٹی سے ہاتھ یا چھری کو پونچھنے سے فقہاء نے منع فرمایا ہے۔[1] اس بات سے بھی منع کیا گیا ہے کہ روٹی کے بیچ کا حصہ کھا لیا جائے اور کنارے چھوڑ دیئے جائیں۔[2] روٹی کے ٹکڑے جمع ہو جائیں تو بجائے پھینک دینے کے مرغی بکری وغیرہ کو کھلا دے۔[3] دستر خوان بچھائے جانے کے بعد جب تک اٹھا نہ دیا جائے کھانے والوں کو اٹھنے سے منع فرمایا، "اِذَا وُضِعَتِ الْمَائِدَةُ فَلَا يَقُوْمُ رَجُلٌ حَتّٰى تُرْفَعَ الْمَائِدَةُ۔"[4]

پینے کے آداب

پینے کے آداب بھی وہی ہیں جو کھانے کے آداب ہیں، عام طور پر کھڑے ہو کر پینا مناسب نہیں۔[5] البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھڑے ہو کر پینا بھی ثابت ہے، اس لئے کبھی کھڑے ہو کر پی لیا جائے تو مباح ہے۔ پانی تین سانس میں پیا جائے کہ ایک سانس میں پینے میں صحت کے لئے مضرت کا اندیشہ ہے۔[6] کھانے ہی کی طرح پانی میں بھی پھونک مارنے سے منع فرمایا گیا۔[7] شروع میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد للہ پڑھے۔[8] دودھ پینے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی دعا منقول ہے: "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَزِدْنَا مِنْهُ۔[9]"

عمرو بن حمق خزاعی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء دی: "اَللّٰهُمَّ اَمْتِعْهُ بِشَبَابِهٖ" یوں ہوا کہ ان کی عمر ۸۰ سال

---

[1] بخاری باب قطع اللحم بالسکین: ۲/۸۱۴ عن عمرو بن امية
[2] المغنی: ۷/۲۲۱
[3] مجمع الانهر: ۲/۵۲۵
[4] بخاری باب الخبز المرقق والاكل على الخوان: ۲/۸۱۱
[5] بخاری، عن قتادہ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ
[6] مجمع الانهر: ۲/۵۲۵ [7] مجمع الانهر: ۲/۵۲۵

ہوگئی اور اس وقت تک ایک بال بھی سفید نہ ہوا[1]

مسلمان کی دعوت

مسلمانوں کی دعوت قبول کی جانی چاہئے، حدیث میں خصوصیت سے دعوت ولیمہ کے بارے میں منقول ہے کہ دعوت ولیمہ ضرور قبول کی جائے، حافظ ابن عبدالبر نے نقل کیا ہے کہ دعوت ولیمہ کی قبولیت کے واجب ہونے پر فقہاء کا اجماع ہے، بشرطیکہ کوئی عذر نہ ہو[2] اس کے علاوہ دوسری دعوتوں کا قبول کرنا مستحب ہے اور اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے[3] عالمگیری میں ولیمہ کو بھی سنت قرار دیا گیا ہے۔[4] اور یہی صحیح ہے۔ اور کسی وجہ سے دعوت قبول نہ کر سکے تو دعاء دینے پر اکتفا کرے، ارشاد نبوی ہے:

"اِذَا دُعِیَ اَحَدُکُمْ فَلْیُجِبْ فَاِنْ کَانَ صَائِمًا فَلْیَدْعُ وَاِنْ کَانَ مُفْطِرً فَلْیَطْعَمْ۔"[5]

D: ''تم میں سے کسی کو دعوت دی جائے تو قبول کرے۔ روزہ سے ہو تو دعا دینے پر اکتفا کرے اور روزہ نہ ہو تو کھالے۔''

جس دعوت میں منکر ہو!

لیکن اگر دعوت کسی منکر اور خلاف شرع بات پر مشتمل ہو تو حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں شرکت کو ناپسند فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس دسترخوان پر شراب پی جائے اس پر نہ بیٹھا جائے۔ "نَھٰی عَنِ الْجُلُوْسِ عَلٰی مَائِدَۃٍ یُشْرَبُ الْخَمْرُ عَلَیْھَا۔"[۴]

e غیاثیہ: ص ۱۰۹ r جمع الفوائد: ۲۹۸/۱

t ترمذی عن انس بن مالک وجابر، باب نھی عن الشرب قائما: ۱۰/۲

y ترمذی عن انس بن مالک باب فی التنفس فی الاناء: ۱۰/۲

فقہاء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت نہی عن المنکر کے متعلق اسلام کا خاص اعتناء اور حالات وحیثیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ کس قسم کی دعوتوں میں شرکت مباح ہے اور کس میں شرکت مکروہ؟

دعوت کے ساتھ اگر منکرات ہوں تو فقہاء احناف کے نقطۂ نظر کا حاصل یہ ہے کہ اگر پہلے سے دعوت میں منکرات کے شامل ہونے کا علم ہو تب تو اس میں شرکت جائز نہیں۔ ایسی دعوت قبول نہ کرنی چاہئے۔ "وَلَوْ عَلِمَ قَبْلَ الْحُضُوْرِ لَا يَقْبَلُهُ"[2]

گو بعض فقہاء نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور اس کو نماز جنازہ کے ساتھ نوحہ پر قیاس کیا ہے۔[3] مگر یہ قیاس درست نہیں معلوم ہوتا کہ نماز جنازہ فرض ہے اور قبول دعوت، سنت ـــــ اگر پہلے سے علم نہ ہو اور آ گیا اور منکرات عین دسترخوان پر رہی ہوں تو اب بھی نہ بیٹھے "ولو كان ذلك على المائدة لا ينبغي أن يقعد"[4] دسترخوان پر نہ ہو رہی ہوں لیکن اس کو مقتدیٰ کی حیثیت حاصل ہو عام لوگ اس کے طریق وعمل کو قابل اتباع باور کرتے ہوں تو اس کے لئے اب بھی اس دعوت میں رکنا جائز نہیں۔ پہلے اس منکر کو دور کرنے کی سعی کرے اور اگر اس پر قدرت نہ ہو تو خود چلا جائے "فان كان مقتدى ولم يقدر على منعهم يخرج ولا يقعد"[5] اگر اس کو یہ حیثیت حاصل نہ ہو تو اول تو اس برائی کو رفع کرنے کی سعی کرے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو بہ کراہت خاطر کھانے میں شرکت کر سکتا ہے، "فان قدر على المنع منعهم وان لم يقدر يصبر، وهذا اذا لم يكن مقتدى به"

حنابلہ اور شوافع کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر پہلے سے دعوت کے ساتھ منکر کی موجودگی کا علم تھا تو اگر وہ اس منکر کے ازالہ پر قادر ہو تو واجب ہے کہ دعوت میں

---

u عن ابن عباس بسند ضعيف، جمع الفوائد: ۲۹۸/۱

i عن ابن مسعود، كتاب عمل اليوم والليلة: ص۲۲۳

o عمل اليوم والليلة: ص۲۲۴، باب ما يقول اذا شرب اللبن

شریک ہو اور اس منکر کو دور کرے اور اگر اس منکر سے نہ روک سکتا ہو تو شریک نہ ہو، یہی حکم اس وقت بھی ہے جب کہ پہلے سے دعوت میں منکر کی موجودگی کی اطلاع نہ ہو، آنے کے بعد اطلاع ہوئی، اس صورت میں بھی یا تو معصیت سے روک دے ورنہ واپس چلا جائے۔[2] مالکیہ کا نقطۂ نظر بھی قریب قریب یہی ہے البتہ امام مالک کے مشہور شاگرد ابن قاسم کا خیال ہے کہ معمولی قسم کے لہو جیسے ''دف'' ہو تو لوٹنا ضروری نہیں۔ اصبغ کہتے ہیں کہ بہر طور لوٹنا ضروری ہے۔[3]

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ان تمام فقہاء کے سامنے جو بات ہے وہ یہ کہ ایک طرف منکر سے روکنا اور کم سے کم اس پر ناگواری کا اظہار ہر مسلمان پر واجب ہے دوسری طرف یہ بات بھی ضروری ہے کہ کسی برائی سے روکنے کے لئے شدت سے بچنے کی راہ اختیار کی جائے اور ایسا عمل نہ کیا جائے جس سے رشتہ و تعلق اور محبت کی وہ آخری سوت بھی کٹ جائے جس کو بنیاد بنا کر آئندہ اصلاح حال کی جا سکتی تھی، احناف کا نقطۂ نظر اسی دوہرے اصول کے درمیان تطبیق پر مبنی ہے کہ جہاں پر روکنے کی قدرت ہے وہاں روکنے کی سعی میں کوتاہی نہ کرے، جہاں روکنے پر قادر نہ ہو اور پہلے سے خبر ہو وہاں ناگواری کے اظہار اور شرکت میں اجتناب سے تکلف نہ کرے، آ گیا ہو اور کسی منکر کا ابتلاء ہو اور سماج میں اس کو مقام اقتداء حاصل ہو تو اب بھی پائے ثبات میں تزلزل نہ آنے دے اور واپس چلا جائے لیکن وہ سماج کا اتنا اہم شخص نہ ہو، پہنچ چکا ہو اور منکرات عین دستر خوان پر نہ ہوں تو کراہت خاطر کے ساتھ رک جانے کی گنجائش ہے اور مصلحت وہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی یہ واپسی رشتہ اور تعلق کی آخری سوت کو بھی کاٹ کر رکھ دے اور آئندہ اصلاح حال اور نہی عن المنکر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اب جب کہ معاشرہ میں بعض منکرات

---

q عمل اليوم والليلة: ص۲۲۴، باب ما يقول لمن سقاه

w المغني: ۲۱۳/۷   e المغني: ۲۱۸/۷

لزوم کا درجہ اختیار کرتی جارہی ہیں اور ابتلاء اس طرح عام ہوتا جارہا ہے کہ کیا عوام اور کیا خواص، اور کیا اہل دین اور کیا بے دین؟ کوئی طبقہ محفوظ نہیں۔ ان میں نہی وانکار میں کمال مصلحت وحکمت اور تدریج سے کام لیا جائے، ایسا طرز عمل اختیار نہ کیا جائے جس سے اصلاح کا دروازہ ہی ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے اور نہ یہ ہو کہ مباحات و مکروہات اور محرمات ومحظورات کو ایک ہی صف میں جگہ دے دی جائے اور سب کے ساتھ ایک ہی رویہ روا رکھا جائے، یا وہ منکرات جن کا ناجائز ہونا فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہو اور ان پر نص وارد ہو اور وہ جو اجتہادی ہوں اور ان میں اختلاف کی گنجائش ہو، کو ایک ہی درجہ دے دیا جائے کہ اس سے خیر زیادہ شر اور نفع سے زیادہ ضرر کا اندیشہ ہے۔ ایسا شخص جو فسق وفجور میں مبتلا ہو اس کی دعوت مناسب ہے کہ نہ قبول کی جائے تاکہ اس کے فسق وفجور پر ناراضگی کا اظہار ہو" **لا یجیب دعوۃ الفاسق المعلن لیعلم انہ غیر راض**"[1] تاہم ضروری ہے کہ اس کا استعمال مصالح و حالات کی رعایت کے ساتھ کیا جائے، اگر اس بات کا امکان ہو کہ اس کی دعوت قبول کر کے اس کی اصلاح کی جا سکتی ہے تو اس اہم تر مصلحت کی بنیاد پر دعوت قبول کی جا سکتی ہے۔

غیر مسلموں کی دعوت

فقہاء نے غیر مسلموں کی دعوت قبول کرنے کو جائز قرار دیا ہے کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی کی دعوت قبول فرمائی تھی[2] دراصل اسلام نے عام انسانی سلوک اور اکرام میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا، ہاں اگر اس کی دعوت اس کے مذہبی عقیدہ وعمل سے متعلق ہو تو اس میں شرکت جائز نہ ہوگی کہ یہ کفر میں تعاون یا کم سے کم اس پر رضا کا اظہار ہوگا۔ ہندوؤں کے یہاں تیوہاروں اور

[1] ھندیہ: ۳۴۳/۵ [2] ابوداؤد عن ابی ھریرہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ

دیوی دیوتاؤں کے پرشاد کا یہی حکم ہے کہ ان کا قبول کرنا جائز نہیں۔ اگر کسی فتنہ کے اندیشہ سے قبول کرنے کے سوا چارہ نہ ہو تو کھانا جائز نہیں، اسی طرح غیر مسلموں کو دعوت دینا بھی جائز ہے۔ خود آپ نے بعض کفار کی میزبانی کی ہے۔[1]

مسلمان کی دعوت کے متعلق ایک ضروری ہدایت

دعوت، ہدایا اور تحائف کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ کسی مسلمان شخص کے یہاں کھانا کھایا جائے تو اس حسن ظن پر کہ یہ آمدنی اس کو حلال طریقہ ہی سے حاصل ہوئی ہوگی، اس کے بارے میں تحقیق و تفتیش نہ کرے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے:

"اذا دخل احدکم علی اخیہ المسلم فاطعمہ طعاماً فلیأکل من طعام ولا یسال عنہ، وان سقاہ شرابا فلیشرب من شرابہ ولا یسال عنہ۔"[2]

D: "تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کے ہاں جائے اور وہ اسے کھانا کھلائے تو کھالے۔ اس کے بارے میں تفحص نہ کرے، کچھ پلائے تو پی لے اور تفحص نہ کرے۔"

اس لئے کہ یہ ایک مسلمان سے سوءظن اور بدگمانی ہے، اسی لئے فقہاء کے یہاں قاعدہ ہے:

"الیقین لا یزول بالشک۔"[3]

D: "یقین شک سے دور نہیں ہوتا۔"

پس جب تک کسی کی آمدنی کے حرام ہونے کا یقین یا گمان غالب نہ ہو اور اس سلسلہ میں کوئی قرینہ یا شہادت موجود نہ ہو ایک مسلمان کے ساتھ حسن ظن کے تحت

q جمع الفوائد: ۲۹۳/۱ w البحر الرائق: ۱۸۸/۸

اسے حلال ومباح سمجھا جائے گا۔

ان اصول کے تحت ایسا شخص کہ جس کے پاس حلال وحرام دونوں طرح کی آمدنی ہو، کب اس کے ہدایا کا قبول کرنا جائز ہوگا اور کب نہیں؟ اس بارے میں فقہاء نے رہنمائی کی ہے کہ اگر کسی کی آمدنی کا غالب حصہ حرام آمدنی پر مشتمل ہو تو اس کے تحائف قبول کرنا یا اس کے یہاں کھانا جائز نہ ہوگا اور غالب حصہ حلال کا ہو تو ضیافت نیز تحائف کا قبول کرنا جائز ہوگا۔ البتہ اگر غالب آمدنی حرام ہو اور ہدایا کی رقم کے بارے میں دینے والا صراحت کرے کہ یہ حلال کی آمدی سے ہے تو قبول کرسکتا ہے۔ اسی طرح آمدنی کا غالب حصہ حرام پر مشمل ہو لیکن ہدیہ دینے والا کسی ایسے ذریعہ آمد کی اطلاع دے جو حلال ہو جیسے قرض یا وراثت تو قبول کیا جاسکتا ہے۔[1]

مہمان اور میزبان کے آداب

اسلام میں مہمان نوازی کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے مہمان نواز تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم مہمانوں کی بھی ضیافت پورے اہتمام سے فرمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین دنوں مہمان نوازی حق ہے، پہلے دن اہتمام کے ساتھ اور بعد کے دنوں میں جو بے تکلف میسر آجائے، کھلا دیا جائے، اس میں مہمان کی رعایت بھی ہے اور میزبان کی بھی، بلکہ بعض صورتوں میں تو میزبانی کو واجب قرار دیا گیا ہے۔[2]

مہمان کے لئے مستحب ہے کہ میزبان جہاں بیٹھانے کا نظم کریں، وہاں بیٹھے، جو کچھ کھانے کے لئے پیش کیا جائے اسی پر راضی رہے، صاحب خانہ کی اجازت ہی سے نکلے اور واپس ہوتے ہوئے دعاء دے۔[1] مدعوئین ایک دوسرے کو کھانا لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ بعضوں نے اجازت دی ہے اور بعضوں نے منع کیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس کا

[1] فتح القدیر: ۸/۴۴ [2] ھندیہ: ۵/۳۴۳

انحصار عرف پر ہے۔ جہاں کے عرف میں مہمانوں کا اس طرح ایک دوسرے کو کھانا لگانا مروج ہو اور اس پر میزبان کو ناگواری نہ ہوتی ہو وہاں ایک دوسرے کو کھانا لگانا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔" الصحيح في هذا انه ينظر الى العرف والعادة دون التردد۔[2]"

میزبان کے لئے مستحب ہے کہ کھانے کے درمیان اصرار شدید (الحاح) کے بغیر مہمان سے مزید کھانے کی خواہش کرے، مہمانوں سے گفتگو کرے، مہمان کے پاس سے غائب نہ رہے، اس کی موجودگی میں اپنے خدام پر برہم نہ ہو، مہمانوں کے یہاں ایسے شخص کو نہ بیٹھانا چاہئے جس سے اس کو گرانی ہو۔[3] حضرت ابراہیم کی سنت کے مطابق مہمان نوازی اور میزبانی کا فریضہ بذات خود انجام دینا چاہئے۔[4] کھانا پیش کرنے سے پہلے ہاتھ دھونے کے لئے پانی پیش کرنا چاہئے۔[5]

میزبان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا منقول ہے:

"اللهم بارك لهم في مارزقتهم واغفر لهم وارحمهم"

D: ''خدایا! ان کی رزق میں برکت دے ان کو معاف فرما اور رحم کر۔''

اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شخص کے یہاں روزہ افطار کرتے، یہ دعا پڑھتے:

"افطر عندكم الصائمون واكل طعامكم الابرار وصلت عليكم الملائكة۔[۴]"

D: ''تمہارے پاس روزہ داروں نے افطار کیا، نیکو کار تمہارا کھانا کھائیں اور فرشتے دعاء رحمت کریں۔''

t فتح القدير: ۴۴۸/۸

q فتح القدير، نیز ملاحظہ ہو بحر: ۱۸۸/۸

w المغني: ۲۱۴/۷ e المغني: ۲۱۵/۷

q ھندیہ: ۳۴۳/۵ w المغني: ۲۱۳/۷

حیوانات میں حلال وحرام

دنیا کے مختلف مذاہب اور اقوام میں حیوانات کے بارے میں ایک خاص قسم کا افراط وتفریط ہے، ایک طرف وہ لوگ ہیں جو حیوانی اجزاء کے غذائی استعمال کو بے رحمی تصور کرتے ہیں اوراس کو مطلق منع کرتے ہیں، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ہر جانور کو انسانی خوراک قرار دیتے ہیں اور اس باب میں کوئی امتیاز وتفریق روانہیں رکھتے ـــــ یہ دونوں ہی اعتدال سے دور اور قانون فطرت کے باغی ہیں۔ خدا نے اس کائنات میں جو نظام ربوبیت قائم کیا ہے وہ اسی پر مبنی ہے کہ اعلیٰ مخلوق اپنے سے کمتر مخلوق کے لئے سامان بقا بنے۔ غور کرو کہ درندے اپنے سے کمزور حیوان سے پیٹ بھرتے ہیں، چوپائے نباتات کھاتے ہیں اور اسی پر ان کی حیات کا دارومدار ہے حالاں کہ نباتات میں بھی ایک نوع کی حیات موجود ہے بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو غذا بناتی ہیں اور چھوٹی مچھلیاں آبی حشرات کو، زمین پر رہنے والے جانوروں کی خوراک زمین پر چلنے والے حشرات الارض ہیں، چھوٹے پرندے بڑے پرندوں کی خوراک ہیں اور کیڑے مکوڑے چھوٹے پرندوں کے۔ خدا کی کائنات پر جس قدر غور کیا جائے اس کے نظام وانتظام کی اساس یہی ہے جولوگ اس اصول کے بغیر دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں ان کے لئے کم سے کم خدا کی اس بستی میں رہنے کا کوئی جواز نہیں کہ پانی کا کوئی قطرہ اور ہوا کی کوئی سانس اس وقت تک حلق سے اتر نہیں سکتی جب تک کہ سیکڑوں نادیدہ جراثیم اپنے لئے پیغام اجل نہ سن لیں۔

یہی بے اعتدالی اس سمت میں بھی ہے کہ ہر حیوان کو غذا کے لئے درست سمجھا جائے۔ یہ مسلمات اور ثابت شدہ حقائق میں سے ہے کہ انسان پر غذا کا اثر پڑتا ہے۔ یہ اثر جسمانی بھی ہوتا ہے اور اخلاقی بھی۔ جانوروں میں شیر و ببر درندے ہیں۔

q جمع الفوائد: ۲۹۹/۱ w جمع الفوائد: ۲۹۸/۱ e الاشباہ: ص ۵۹

سانپ وبچھو کی کینہ پروری وریشہ زنی کی خو معروف ہے، گدھے میں حمق ضرب المثل ہے۔خنزیر میں جنسی بے اعتدالی وہوسنا کی کا اثر ان قوموں میں آفتاب نصف النہار کی طرح نمایاں ہے جو اس کا استعمال کرتی ہیں، کتے کی حرص وآز اور قناعت واستغناء سے محرومی نوک زباں ہے۔چھپکلی اور بعض حشرات الارض بیماریوں کا سرچشمہ ہیں۔ بندر کی بے شرمی، لومڑی کی چال بازی گیدڑ کی بزدلی محتاج اظہار نہیں۔مقام فکر ہے کہ اگر انسان کو ان جانوروں کے خوراک بنانے کی اجازت دے دی جائے تو کیا یہی اوصاف اس کے وجود میں بھی رچ بس نہ جائیں گے؟

اسی لئے اسلام نے ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ نکالی، ایک طرف بہت سے جانوروں کو حلال قرار دیا، دوسری طرف وہ حیوانات جن کا گوشت انسان کی اخلاقی کیفیت، طبعی افتاد اور جسمانی صحت کے لئے مضر ہوسکتا تھا ان کو حرام قرار دیا۔ اب یہ کہ کونسے جانور حرام ہیں اور کونسے حلال؟ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے ایک قاعدہ مقرر کردیا کہ ''طیبات'' اور پاک مویشی حلال ہیں اور ناپاک وبدخو جانور جن کو قرآن کی زبان میں ''خبائث'' کہا گیا ہے، حرام ہیں، "یُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ"[1] فطرت سلیمہ جسے پاکباز وطیب سمجھے اسے کھائے اور جس کو خبیث سمجھے اسے نہ کھائے، لیکن ظاہر ہے کہ اس فیصلہ کو ہر انسان کے ذوق ومزاج پر منحصر کردیا جانا نہ ممکن تھا اور نہ مناسب، چنانچہ شریعت نے اس کی جزوی تفصیلات بھی متعین کردی کہ کن کا شمار طیبات میں ہے اور کن کا خبائث میں؟ —— چنانچہ اس کی تفصیل یوں ہے کہ حیوانات تین طرح کے ہیں، دریائی، زمینی اور پرندے۔

دریائی جانور

q عالمگیری: ۳۶۲/۵ w ترمذی: ۱۸/۲

دریائی جانوروں میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک صرف مچھلی حلال ہے بقیہ کوئی بھی جانور حلال نہیں۔ مردار ہو تو "حرمت علیکم المیتة" میں داخل ہے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے صرف مچھلی اور ٹڈی کا استثناء فرمایا ہے اور زندہ ہو تو خبائث میں داخل ہے —— نیز مچھلی بھی اگر طبعی موت مر جائے اور اس طرح اوپر آ جائے کہ پیٹ کا حصہ اوپر ہو اور پشت کا حصہ نیچے تو یہ حرام ہے، اسی کو حدیث میں سمک طافی قرار دیا گیا ہے اگر اس کے برعکس پشت کا حصہ اوپر ہو تو اس مچھلی کو کھانا حلال ہے۔[1] کیوں کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر مذکورہ مچھلی کے کھانے سے منع فرمایا ہے۔[2]

دوسرے فقہاء کے یہاں اس باب میں بڑی وسعت ہے اور اختلاف اقوال بھی، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے تین طرح کی رائیں منقول ہیں۔ 1 تمام دریائی جانور حلال ہیں 2 مچھلی کے علاوہ سب حرام ہیں، 3 تیسرے یہ کہ خشکی کے جو جانور حلال ہیں اسی نوع کے دریائی جانور بھی حلال ہیں اور خشکی کے جو جانور حرام ہیں اس نوع کے دریائی جانور بھی حرام ہیں —— پہلا قول فقہاء شوافع کے یہاں زیادہ صحیح ہے۔[3] امام احمد کے یہاں مینڈک کے سوا تمام دریائی جانور حلال ہیں۔[4] امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی تمام دریائی جانور مباح ہیں مگر دریائی سور مکروہ ہے۔[1]

ان فقہاء کے پیش نظر وہ روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندر کے پانی کو پاک اور اس کے مردار کو حلال قرار دیا ہے "الطهور ماؤه والحل میتته"[2] اس حدیث میں عموم ہے اور تمام سمندری جانوروں کو حلال قرار دیا گیا ہے،

---

q ھندیہ: ۳۴۴/۵   w ھندیہ: ۳۴۴/۵   e ھندیہ: ۳۴۵/۵

r ھندیہ: ۳۴۵/۵   t ھندیہ: ۳۴۵/۵

y عمل الیوم واللیلة: ص۲۲۵، باب ما یقول اذا اکل عند المؤمن، مسلم عن عبدالبر بن بسر

احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہاں ''میتۃ'' سے تمام مردار مراد نہیں بلکہ صرف مچھلی مراد ہے اس لئے کہ قرآن نے سمندر اور خشکی کے جانوروں کے فرق کے بغیر تمام ہی مردار کو حرام قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے صرف ایک دریائی جانور مچھلی اور ایک خشکی کے جانور ٹڈی کو مستثنٰی فرمایا ہے "احلت لنا میتتان الحوت والجراد"[3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں یہاں ''میتۃ'' سے تمام جانور مراد نہیں ہے، صرف مچھلی کی حلت بیان کرنا مقصود ہے، خیال ہوتا ہے کہ احناف کی رائے زیادہ قوی اور شریعت کے مزاج و مذاق سے زیادہ قریب ہے کیوں کہ باوجود اس کے کہ عرب کا خطہ ساحل سمندر پر واقع ہے، خود پیغمبر اسلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب عالی مقام سے سوائے مچھلی کے کسی اور دریائی جانور کا کھانا ثابت نہیں ـــــــ واللہ اعلم۔

خشکی کے جانور

جانوروں کی دوسری قسم وہ ہے جو خشکی کے جانور کہلاتے ہیں، یہ تین طرح کے ہیں، ایک وہ جن میں خون بالکل نہیں پایا جاتا جیسے ٹڈی، بھڑ، مکھی، مکڑا وغیرہ، ایسے حیوانات میں ٹڈی کے سوا سب کے حرام ہونے پر اتفاق ہے، دوسرے وہ جن میں خون ہے لیکن بہتا ہوا خون نہیں ہے جیسے سانپ چھپکلی اور تمام حشرات الارض ان کے حرام ہونے پر بھی اتفاق ہے سوائے گوہ (ضب) کے جو امام شافعی اور بعض فقہاء کے نزدیک حلال اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرام ہے[1] تیسرے وہ جن میں بہتا ہوا خون موجود ہے، یہ بھی دو طرح کے ہیں، ایک پالتو جانور اور دوسرے جنگلی اور وحشی ـــــــ پالتو جانوروں میں اونٹ، گائے، بیل، بکری اور وحشی جانوروں میں ہرن، نیل

ابوداؤد عن انس

الاعراف، آیت: ۱۵۷

در علی ھامش الرد: ۵/۱۹۴، ۱۹۵

گائے، جنگلی اونٹ اور جنگلی گدھے کا کھانا بالاتفاق جائز ہے۔ اسی طرح پالتو جانوروں میں کتا اور بلی بالاتفاق حرام ہیں۔ نیز وحشی جانوروں میں درندے جانور، شیر، بھیڑیا، چیتا، جنگلی بلی، بندر وغیرہ بالاتفاق حرام ہیں۔[2] البتہ گیدڑ اور لومڑی شوافع اور حنابلہ کے یہاں جائز اور احناف و مالکیہ کے یہاں حرام ہیں۔[3]

منجملہ ان جانوروں کے جن کی حلت اور حرمت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے گھوڑا ہے، جو امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک مکروہ اور امام شافعی و صاحبین کے یہاں حلال ہے۔[4] پالتو گدھے اور خچر کا کھانا بالاتفاق حرام ہے۔[5] اور خرگوش کا کھانا حلال ہے۔[6]

اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درندہ جانوروں کو کھانے سے منع فرمایا اور اس کی علامت یہ بتائی کہ وہ سامنے کے دانتوں سے کھاتا اور شکار کرتا ہو، "كل ذي ناب من السباع فاكله حرام"[7] چنانچہ ایسے تمام جانور جن کی یہ کیفیت ہو، درندہ ہونے کی وجہ سے اصولی طور پر تمام فقہاء کے نزدیک حرام ہیں۔ "ولا يحل ما يتقوى بنابه ويعدو على الناس وعلى البهائم"[1]

امام مالک کے بارے میں گو مختلف روایتیں منقول ہیں مگر صحیح یہی ہے کہ وہ بھی اس کو حرام قرار دیتے تھے، چنانچہ امام صاحب نے اپنی ''مؤطا'' میں حضرت ابوثعلبہ خشنی اور حضرت ابوہریرہ کی وہ روایت نقل کی ہے جو درندہ جانوروں کی حرمت کے

---

w ابوداؤد عن جابر: ۸/۲ باب في اكل الطافي من السمك، ابن ماجه عن جابر: ۲۳۸/۲، باب الطافي في صيد البحر

e المجموع شرح مهذب: ۹/۳۸ r المغني: ۹/۳۳۸

q الميزان الكبرى: ۲/۹۹

w ابوداؤد عن ابي هريره: ۱/۱۱، باب الوضوء بماء البحر

e ابن ماجه: ص۲۳۲ باب صيد الحيتان والجراد

q المغني: ۹/۳۳۹، شرح مهذب: ۹/۱۲ بدائع: ۵/۳۹

بارے میں ہے پھر لکھا ہے کہ یہی رائے ہے "وھو الامر عندنا۔"[2]

پرندوں کے سلسلہ میں حدیث میں بنیادی اصول یہ بتایا گیا ہے کہ پرندوں میں بھی درندے حرام ہوں گے۔ اور درندوں سے مراد وہ پرندے ہیں جو پنجوں سے اپنا شکار کرتے ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے "نھی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن کل ذی ناب من السبع وعن کل ذی مخلب من الطیر"[3] اسی لئے فقہاء "پنجے سے شکار کرنے والے اور دوسرے پرندوں پر حملہ آور ہونے والے پرندوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔[4] فقہاء شوافع نے اس سلسلہ میں کچھ زیادہ منضبط اصول مقرر کئے ہیں اور وہ یہ کہ تین طرح کے پرندوں کا کھانا حرام ہے۔ اول وہ جو خود درندہ ہو جیسے باز، شاہین، عقاب وغیرہ، دوسرے وہ کہ جن کو شریعت نے مارنے سے منع کیا ہے جیسے کہ مکھی، ہدہد وغیرہ۔ تیسرے وہ جن کو مارنے کا حکم دیا ہے جیسے چیل۔[5]

پرندوں میں کوے کی بعض قسموں کے سلسلہ میں اختلاف ہے، کوئل بالاتفاق حرام ہے۔ اسی طرح نجاست خور کوا۔ لیکن وہ کوا جو دانے اور کھیتوں سے کھاتا ہے اکثر فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔[1] بلکہ ملک العلماء علامہ کاسانی نے تو اس کے حلال ہونے پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے "والغراب الذی یاکل الحب والزرع والعقعق ونحوھا حلال بالاجماع" [2] اس سے مراد وہ کوا ہے جس کو "زاغ" کہا جاتا ہے۔[3]
—— ان کے علاوہ عام پرندے مرغی، بط، فاختہ، کبوتر، گوریئے وغیرہ بالاتفاق حلال ہیں۔

---

w ملخص از: بدائع الصنائع: ۳۶/۵ الفتاوی الھندیہ: ۲۸۹/۵

e مھذب مع الشرح: ۹/۹

r ھدایۃ المجتھد: ۴۶۹/۱، بدائع: ۳۸/۵

t شرح مھذب: ۶/۹، ۸

نجاست خور حلال جانور

البتہ حلال جانور بھی نجاست خور ہو جائیں جن کو عربی میں "جلالۃ" کہا جاتا ہے تو اس کے کھانے میں کراہت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جانور کا گوشت کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا[4] بلکہ ایک روایت میں اس پر سوار ہونے سے بھی منع فرمایا ہے۔[5] اسی روایت کو سامنے رکھ کر فقہاء نے احکام مقرر کئے ہیں اور وہ یہ کہ اگر کثرت نجاست خوری کی وجہ سے بھی جانور گائے، اونٹ، مرغی کے اندر بدبو پیدا ہو جائے اور اس کے گوشت سے بو آنے لگے تو اس کو ایک مخصوص وقفہ کے بغیر ذبح کرنا جس میں یہ بو جاتی رہے مکروہ ہے۔[6] کتنے دنوں روک رکھنے میں اس کے گوشت کی کراہت ختم ہوگی۔ اس سلسلہ میں بعض فقہاء نے اندازہ قائم کیا ہے اور دنوں کی تعیین کی ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ اس کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی جاسکتی بلکہ جتنے دنوں میں بو کے ازالہ کا غالب گمان ہو جائے کراہت ختم ہو جائے گی "کان ابو حنفیۃ لا یوقت فی حبسھا وقال تحبس حتی تطیب وھو قولھما ایضاً۔"[1]

ذبح کی بنیادی شرط

حلال جانوروں کو بھی شریعت اس وقت کھانے کی اجازت دیتی ہے جبکہ اس کو شرعی طور پر ذبح بھی کر لیا گیا ہو، اسلام کے اس حکم کا رشتہ ایک طرف صحت انسانی اور

---

y شرح مھذب: ۹/۹، ۸

u مسلم عن ابی ھریرہ: ۱۴۷/۲ باب تحریم اکل کل ذی ناب من السباع

q شرح مھذب: ۱۲/۹، نیز دیکھئے المغنی: ۳۲۵/۹

w موطا لمالک: ص۱۸۹، باب تحریم اکل ذی ناب من السباع

e مسلم عن ابن عباس: ۱۴۷/۲ باب اکل کل ذی ناب من السباع

دوسری طرف اصلاح عقیدہ دونوں سے ہے۔ جانور کو صحیح طور پر ذبح نہ کیا جائے کہ اس کے جسم کا بہتا ہوا خون پوری طرح خارج نہ ہو جائے اور جسم کے اندر ہی منجمد ہو جائے تو اس میں ایک طرح کی سمت پیدا ہوتی ہے اور یہ صحت کے لئے سخت مضر ہو جاتا ہے۔ دوسرے اقوام عالم اپنے اپنے عقیدہ وتصور کے مطابق جانوروں کی قربانی اور دیویوں دیوتاؤں پر چڑھاوے دیتے رہے ہیں دنیا کا شاید کوئی مذہب ہو جہاں کسی نہ کسی طور اپنے مذہبی تصورات کے ساتھ جانوروں کے بھینٹ چڑھانے کا عمل نہ پایا جاتا ہو۔ اسلام کہ سراپا توحید کا داعی ہے اس نے ہر اس عمل کو جو شرک کا مظہر تھا، توحید کے سانچہ میں ڈھالا ہے، اس نے نماز جیسی روزانہ پانچ وقت پڑھی جانے والی عبادت رکھی مگر اس کے لئے نہ سورج کو قبلہ بنایا نہ دوسرے مذہب کی طرح کسی خاص سمت کو، بلکہ علامتی طور پر خود کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا گیا جس کی بناء ہی توحید کے لئے ہوئی تھی۔ اسلام کے پہلے بعض قومیں پانسوں اور فال کے ذریعہ قسمت کا حال معلوم کرتی تھیں، شریعت نے اس کے لئے استخارہ کی نماز رکھی، بارش کے لئے مشرکانہ اعمال ورسوم کئے جاتے تھے، اس کی جگہ صلوۃ استسقاء مقرر ہوئی، ٹھیک اسی طرح قربانی باقی رکھی گئی۔ نذر و نیاز کا دروازہ بند نہیں کیا گیا اور جانوروں کے ذبح کئے جانے کی ایک فطری ضرورت سے پہلو تہی نہیں برتی گئی مگر اس طور کہ اسی مشرکانہ عمل کو عین توحید وایمان کا اظہار بنا دیا گیا کہ جانور خدا ہی کے نام سے ذبح کئے جائیں گے اور اس کے سوا کسی اور کا نام لینا تک اسے حرام کر دے گا اور نام بھی ان قوموں کا لینا معتبر ہوگا جو خدا کے وجود کا تسلیم واقرار کرتے ہوں اور فی الجملہ اس کی توحید کے قائل ومعترف ہوں۔

اسی لئے ذبح کے احکام کو شریعت نے خاص تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کے بنیادی نکات یہ ہیں:

1 ذبح کی حقیقت اور ذبح کے لئے استعمال کئے جانے والے آلات۔

r بدائع الصنائع: ۵/۳۹ t شرح مھذب: ۹/۲۲

C9

2 ذبح کرنے والوں میں مطلوبہ اوصاف۔

3 خود ذبیحہ جانور ذبح کے وقت کس حال میں ہو؟

4 ذبح کے وقت کس طرح اللہ کا ذکر کیا جائے؟

5 ذبح کے مستحبات و مکروہات۔

قابو یافتہ جانور کا ذبح

فقہاء نے ذبح کے دو طریقے رکھے ہیں۔ اختیاری اور اضطراری، اضطراری سے مراد شکار کو حلال کرنے کے ہیں، اور ان کا ذکر آگے آتا ہے، ذبح اختیاری ان جانوروں کے لئے ہے جو قابو اور اختیار میں ہوں، ان کے لئے دو طریقے منقول ہیں، ذبح اور نحر —— ذبح کا تعلق حلق سے اور نحر کا تعلق سینہ سے ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الا ان الزكاة في الحلق واللبة"[1] نیز اس سلسلہ میں بعض صحابہ کے آثار بھی نقل کئے ہیں[2] اونٹ میں نحر بہتر ہے اور اونٹ کے علاوہ دوسرے جانوروں میں ذبح۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو نحر کا حکم دیا۔ "فصل لربك وانحر"[3] اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک ایسی قوم میں ہوئی جو اونٹ کی پرورش کے لئے مشہور تھی اور بنی اسرائیل کو ذبح کا حکم دیا گیا کیوں کہ وہ گائے بیل وغیرہ سے غذائی ضرورت پوری کیا کرتے تھے "ان الله يأمركم ان تذبحوا بقرة"[1] نیز فقہاء کا بھی اتفاق ہے کہ اگر گائے وغیرہ کا نحر کر دیا اور اونٹ کو ذبح کر دیا تب بھی ذبیحہ جائز ہوگا[2] البتہ امام مالک کے نزدیک کسی مجبوری کے بغیر ایسا کرنا مکروہ تنزیہی ہے[3]

ذبح میں کن رگوں کا کاٹنا ضروری ہے، اس سلسلہ میں حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جانوروں کی "اوداج" کاٹ دی جائیں "ما افرى الاوداج"[4] احناف کے

---

[1] المغني: ۹/۳۳۳، شرح مهذب: ۹/۲۳

[2] بدائع: ۵/۳۹ [3] شامي: ۵/۳۰۰

یہاں اوداج سے مراد غذا کی نالی (مری) سان کی نلی (حلقوم) اور خون کی دونوں شہ رگ (ودجین) ہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ یہ چاروں نالیاں کٹ جائیں۔[5] کہ اس طرح جان بھی بسہولت نکل سکے گی اور خون بھی پوری طرح بہہ جائے گا۔ تاہم ان چار میں سے کوئی تین رگیں بھی کٹ جائیں تو کافی ہے۔[6] امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک غذا اور سانس کی نالی کا کٹ جانا ذبح شرعی کے لئے کافی ہے اور خون کی دونوں شہ رگ کا کاٹنا بہتر ہے۔[7] یہی رائے حنابلہ کی ہے۔[8] حقیقت یہ ہے کہ احناف ہی کی رائے اس باب میں قرین عقل بھی ہے اور نص سے قریب بھی۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ گائے بکری وغیرہ کو لٹا کر ذبح کیا جائے اور اونٹ کو کھڑا کر کے۔ اس طرح کہ اس کا بایاں ہاتھ بندھا ہوا ہو۔[9] حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اونٹ کو لٹا کر ذبح کر رہا ہے تو فرمایا کہ کھڑا کر کے ذبح کرو کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور مینڈھے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لٹا کر ذبح فرمایا ہے۔[1]

آلات ذبح

آلات ذبح دو طرح کے ہو سکتے ہیں، آلۂ قاطعہ اور آلۂ فاسخہ۔

آلۂ فاسخہ سے مراد ایسا ہتھیار ہے جو اپنی چوٹ اور دباؤ کے ذریعہ جسم کو پھاڑ دے، جیسے ہاتھ سے لگا ہوا ناخن اور منہ سے لگے ہوئے دانت، ان کے ذریعہ گو جانور کی مطلوبہ نالیاں کٹ جائیں پھر بھی ان کا کھانا جائز نہیں، وہ مردار کے حکم میں ہیں،

---

r ترمذی عن ابن عمر: ۴/۲

t نسائی عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ: ۲۰۹/۲

y شرح مہذب: ۲۸/۹، رد المحتار: ۳۳۳/۵

q بدائع الصنائع: ۴۰/۵

q دار قطنی: ۵۴۴، وفیہ سعد بن سلام ضعیف جداً

w دیکھئے نصب الرایہ: ۲۶۲/۲ e کوثر، آیت: ۲

آلات قاطعہ سے وہ آلات مراد ہیں جن میں کاٹنے کی صلاحیت ہو اگر یہ لوہے کی ہوں تب تو ان سے جانور ذبح کرنا جائز ہے ہی اور اگر کوئی اور چیز ہو تو اس کا تیز اور دھار دار ہونا ضروری ہے جیسے لکڑی، بانس، نوکدار پتھر وغیرہ بقول امام نووی کے "حصوله بكل محدد"[2] ناخن، ہڈیوں اور دانتوں سے ذبح کے جائز ہونے اور نہ ہونے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ کے یہاں اگر یہ جسم سے علیحدہ ہوں اور رگیں کاٹ سکتے ہوں تو جائز ہے امام مالک کے ہاں ہڈی سے جائز ہے ناخن اور دانتوں سے نہیں، اور امام شافعی اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان تینوں سے ذبح کا عمل کافی نہیں، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس کو حبشیوں کا طریقہ قرار دیا ہے، تاہم اس پر سبھوں کا اتفاق ہے کہ تیز دھار دار چھری سے ذبح کرنا بہتر ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وليحد احدكم شفرته وليرح ذبيحته"[3] سے خون بہتر طور نکل سکتا ہے، جان جلدی نکلتی ہے اور جانور کو بھی اذیت کم ہوتی ہے۔

ذابح کے اوصاف

ذبح کرنے والے کو عاقل ہونا چاہئے، پاگل، مبتلائے نشہ اور ایسا بچہ جس میں عقل وتمیز نہ پیدا ہوئی ہو ان کا ذبیحہ حلال نہیں ہوگا، اس لئے کہ ذبح کرنے والے کو ایسا ہونا چاہئے جو ذبح کا مفہوم سمجھتا ہو، اس پر قادر ہو اور بالارادہ بسم اللہ کہتا ہو[1] ایسا بچہ جو بسم اللہ اور ذبح کے مفہوم کو سمجھتا ہو اس کا ذبیحہ حلال ہوگا، یہی حکم کم عقل (معتوہ) آدمی کا بھی ہے، ذبح کے معاملہ میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں، گونگا جو قوت گویائی سے محرومی کی بناء پر بسم اللہ کہنے سے معذور ہو اس کا ذبیحہ بھی حلال ہوگا[2] یہی رائے امام مالک اور امام احمد کی بھی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجنوں اور نشہ میں

---

1 المغنی: ۹/۳۱۲ 2 المجموع شرح مهذب: ۹/۹۰

مدہوش کا ذبیحہ بھی حلال ہوتا ہے۔[3]

ذبح کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمان یا اہل کتاب میں سے ہوں، ارشاد خداوندی ہے ﴿وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم﴾ ظاہر ہے کہ یہاں طعام سے ذبیحہ مراد ہے اس لئے کہ دوسرے احکام میں تمام اہل کتاب یکساں ہیں۔[5] لہٰذا مشرک، مجوسی، مرتد خواہ اس نے کوئی بھی مذہب قبول کیا ہو، ان سب کا ذبیحہ حرام ہوگا، فقہاء نے جنوں کے ذبیحہ کو بھی حرام قرار دیا ہے۔[6] اور مسلمانوں کے ایسے فرقے جن پر بعض لوگوں نے کفر کا فتویٰ لگایا ہے جیسے معتزلہ، روافض، گو بعض علماء نے ان کے ذبیحہ کو بھی مرتدین کے ذبیحہ کے حکم میں لکھا ہے اور حرام قرار دیا ہے لیکن محقق علماء علامہ ابن ہمام وغیرہ کی رائے یہی ہے کہ ان کا ذبیحہ بھی حلال ہوگا کہ ان کا درجہ کم از کم اہل کتاب سے کم نہیں، یہی رائے علامہ شامی کی ہے۔[7] البتہ قادیانی چوں کہ مرتد اور زندیق کے حکم میں ہیں اور ان کا کفر وشک واحتمال سے ماوراء ہے اس لئے ان کا ذبیحہ حرام اور مردار کے حکم میں ہوگا۔[8] اس پر بھی اتفاق ہے کہ جو لوگ دائرۂ اسلام میں ہو گو وہ فاسق ہوں، زانی اور نشہ خوار ہوں، چور اور ڈاکو ہوں، بہر حال ان کا ذبیحہ حلال ہوگا۔[1]

اہلِ کتاب سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں، قرآن کی تصدیق کے بغیر اقوام عالم میں کسی کے بارے میں ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا وہ کسی کتاب آسمانی کے حامل ہیں اور ان کے پاس موجود صحیفہ الہامی ہے جو محرف شکل میں ان کے پاس موجود ہے، ایک ایسا مسئلہ جس سے نکاح وغذا اور عصمت وذبیحہ کی حلت متعلق ہو، محض

e المجموع شرح مھذب: ۹۰/۹

r الدرایة علی الھدایه: ۴۲۱/۴، کتاب الذبائح

t بدائع: ۴۱/۵ y بدائع: ۴۱/۵

u شرح مھذب: ۹۰/۹ i الفقه علی المذاھب الاربعه: ۷۲۵/۱

o شرح مھذب: ۹۲/۹

ظن وتخمین وقیاس اور گمان کے تحت فیصلہ کیا جانا کسی طور قرین انصاف نظر نہیں آ تا، اس لئے بعض اہل علم نے ہندوؤں کی اور بدھشٹوں وغیرہ کو جو اہل کتاب کے زمرہ میں لانے کی کوشش کی ہے وہ اس گنہ گار کے خیال میں صحیح نہیں ہے۔

ذبیحہ میں حیات کی شرط

جس جانور کو ذبح کیا جارہا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ موت کے وقت اس میں حیات موجود ہو۔ مختلف فقہاء نے اپنے اپنے تجربات کی بنا پر موت وحیات کی علامتیں مقرر کی ہیں، حرکت کرنا، خون کا نکلنا[2] شدید حرکت اور شدت کے ساتھ خون کا بہاؤ وغیرہ[3] علامہ حصکفی نے ان علامات کا زیادہ احاطہ کیا ہے مثلاً منہ کا بند ہونا زندگی کی علامت ہے، آنکھ کا بالکل کھلا ہوا ہونا موت کی علامت ہے، پاؤں کا سمیٹنا زندگی کی علامت ہے، بال کا کھڑا ہونا زندگی اور گر جانا موت کی پہچان ہے۔[4]

لیکن مختلف فقہاء کی عبارتوں سے جو بات منقح ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ حیات دو قسم کی ہے۔ ایک حیات مستقرہ جو کسی زندہ حیوان میں ہوتی ہے اور ایک وہ خاص حیات جو دماغ اور قلب کی موت کے بعد جدید تحقیق کے مطابق اعضاء میں باقی رہتی ہے اور اس کی وجہ سے مضطربانہ حرکت کا صدور ہوتا ہے جس کو عرف میں ''حرکت مذبوحی'' کہا جاتا ہے، تو جانور اس وقت حلال ہوگا جب کہ اس میں حیات مستقرہ کی رمق باقی رہ گئی ہو، اور ذبح کر دیا جائے اور اس حیات کا اندازہ علامات، تجربات، قرائن اور جدید دور میں طبی اور سائنسی آلات کے ذریعہ لگایا جاتا ہے، اسی لئے فقہاء نے مسئلہ کی بنیاد کسی خاص علامت پر نہیں رکھی بلکہ ذبیحہ کی موت وحیات کے بارے میں علم و واقفیت پر رکھی ہے "ذبح شاة مریضة فتحرکت او خرج الدم حلت والا لا، ان لم تدر حیاته عند الذبح وان علم حیاته حلت مطلقاً۔"

q شرح مهذب: ۸۳/۹ w بدائع: ۶۲/۵، شرح مهذب: ۸۲/۹ e المغنی: ۳۱۷/۹

q بدائع الصنائع: ۶۶/۵ w درمختار وردالمحتار: ۸۸/۵، ۸۹

ذبیحہ پر بسم اللہ

جانور کو ذبح کرتے وقت ضروری ہے کہ اس پر بسم اللہ کہا جائے ، ارشاد خداوندی ہے:﴿ # $ % & ' ( ) ﴾اس لئے جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ کہنا واجب ہے، متعدد حدیثیں بھی اس سلسلہ میں منقول ہیں، البتہ اگر بسم اللہ کہنا بھول جائے تو شریعت اسے معذور قرار دیتی ہے اور شریعت اس کے ذبیحہ کو جائز رکھتی ہے، خود قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، اس لئے کہ بسم اللہ کے ترک کو قرآن فسق قرار دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ فسق اسی عمل میں ہوتا ہے جس میں کسب وارادہ کو دخل ہو، بھول کی وجہ سے کوئی کام چھوٹ جائے تو ایسے شخص کو فاسق نہیں کہا جا سکتا، اس لئے جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ دیا جائے تو ذبیحہ مردار کے حکم میں ہوگا لیکن بھول کر بسم اللہ نہ کہا تو ذبیحہ جائز ہوگا یہی رائے امام ابوحنیفہ اور امام احمد کی ہے[3] مالکیہ کے نزدیک بھول کر بسم اللہ نہ کہہ سکا تب بھی ذبح درست نہ ہوگا اور ذبیحہ مردار قرار پائے گا، شوافع کا خیال ہے کہ بسم اللہ کہنا سنت ہے، جان بوجھ کر بسم اللہ نہ کہے پھر بھی ذبیحہ حلال ہوگا اصل مقصود صرف یہ ہے کہ ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام نہ لیا جائے تاہم آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رائے وہی صحیح ہے جو فقہاء احناف کی ہے۔

بسم اللہ کہنے کا یہ حکم مسلمان اور اہل کتاب دونوں کے لئے برابر ہے یعنی یہودی اور عیسائی کا ذبیحہ بھی اسی وقت حلال ہوگا جب کہ وہ ذبیحہ پر اللہ کا نام لے " لا تحل الذبيحة من تعمد ترك التسمية مسلما كان او كتابيا"[1] اسی طرح اگر کتابی بھی اپنے عقیدہ کے مطابق جانور پر غیر اللہ مثلاً حضرت مسیح وغیرہ کا نام لے لے تو ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ اس کا کھانا حرام ہوگا[2]

---

e شرح مهذب: ۹/۲۲ r آل عمران، آیت: ۹۳
t بدائع: ۵/۱۴۵ y در علی هامش: ۵/۱۸۹

بسم اللہ کہنے کا طریقہ

جانور پر بسم اللہ کہنے کا جو معروف طریقہ سلف کے یہاں رہا ہے وہ یہی ہے کہ "بِسم اللّٰه وَاللّٰه اکبر" کہا جائے[3] تاہم اس کے لئے کوئی خاص کلمہ مقرر نہیں ہے، حدیثوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہی کہ اللہ کا نام لیا جانا چاہئے اور بس۔ اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی اور نہ کسی خاص لفظ کی تحدید۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا اسم ذاتی یا اسم صفاتی رحمٰن، رحیم وغیرہ تنہا لے لیا جائے یا تسبیح، تحمید کا کلمہ پڑھ لیا جائے، لا الہ الا اللہ کہا جائے، خدا کا نام عربی زبان میں لیا جائے یا کسی اور زبان میں، تمام صورتیں جائز اور درست ہیں۔[4]

ہاں یہ ضروری ہے کہ خود ذبح کرنے والا اللہ کا نام لے، اگر اس کی طرف سے کوئی دوسرا بسم اللہ کہہ دے یا دو آدمی ذبح کرے، ایک کہے اور دوسرا چھوڑ دے تو یہ کافی نہیں۔ ایسے ذبیحہ کا کھانا حرام ہوگا۔[5]

یہ بھی ضروری ہے کہ خاص فعل ذبح کو انجام دینے ہی کی نیت سے اللہ کا نام لے، اگر بطور شکر کے "الحمد للّٰه"، چھینک کا جواب دے یا یوں ہی تسبیح وغیرہ کے کلمات پڑھے، ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا مقصود نہ ہو تو یہ ذبیحہ حلال نہ ہوگا۔[1]

یہ بات بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر اللہ کا نام نہ لیا جائے، یہاں تک کہ اگر ذبح کے وقت اللہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے لے تب بھی ذبیحہ حرام ہو جائے گا، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دو مواقع پر میرا ذکر نہ کیا جائے۔ چھینک کے وقت اور ذبح کے وقت۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ذبح کے وقت تنہا اللہ کا نام لو۔ "جوزوا التسمية عند

---

u دیکھئے رد المحتار علی الدر المختار: ۱۸۹/۵

i تفصیل کے لئے دیکھئے قاموس الفقہ: ج۱، مادہ اہل کتاب

q المغنی: ۳۱۱/۹ w بدائع: ۵۲/۵

الذبح۔[4]

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کی اجازت ہے لیکن عام فقہاء اس کو بھی منع کرتے ہیں۔[3] جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا ہے۔ ذبح حیوانات میں شریعت نے توحید کے اظہار کی خاص رعایت رکھی ہے اس لئے واقعہ ہے کہ اس موقعہ سے تسمیہ میں رسول کے نام کو شریک کرنا شرک ہی ہے۔ صلوۃ وسلام بھی مناسب نہیں۔ عبادت، دعا اور اظہار عقیدہ کے مواقع پر شریعت میں ہمیشہ تنہا خدا کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ تکبیر تحریمہ صرف اللہ کے ذکر سے ہوتا ہے۔ حج کا تلبیہ بھی محض ذکر خداوندی سے عبارت ہے، اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، آتے جاتے اور عبادتوں کی ابتداء وانتہاء ہر موقع ومحل کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نہ کوئی ذکر منقول ہے لیکن ان تمام اذکار میں خدا کی عظمت وبلندی اور امتنان کے سوا اور کسی بات کا ذکر نہیں، نہ وہاں انبیاء ورسل کے ذکر اور صلوۃ وسلام کے لئے کوئی جگہ رکھی گئی ہے، اس لئے صحیح وہی ہے جو عام فقہاء کا مسلک ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ذبح کرتے ہوئے اللہ کا ذکر کرے یا ذکر کے فوراً بعد جانور کو ذبح کرے، اگر اللہ کا نام لینے کے بعد معمولی فصل ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن زیادہ فصل ہو جائے، کسی دوسرے کام میں لگ جائے، مجلس بدل جائے پھر جانور ذبح کرے تو اس کا کھانا حلال نہ ہوگا[1] رہ گئی یہ بات کہ بسم اللہ اور ذبح کے درمیان کتنے وقفہ کو وقفہ طویل سمجھا جائے؟ تو یہ ناظرین کی سوچ پر موقوف ہے، جس کو وہ طویل سمجھے وہ طویل ہے "وحد الطول ما يتكثره الناظر۔[2]"

---

e شرح مھذب: ۸۹/۹ r درمختار علی الرد: ۱۹٦/۵

q در علی ھامش الرد: ۱۹٦/۵

w الانعام، آیت: ۱۱۹ e بدائع: ۴۸/۵، المغنی: ۳۲۰/۹

یہ بات بھی واضح رہے کہ ذبح اختیاری میں بسم اللہ کا تعلق فعل ذبح سے ہے، اگر ایک ہی دفعہ میں دو جانور کو ذبح کر دیا تو ایک ہی بسم اللہ دونوں کے لئے کافی ہے اور اگر یکے بعد دیگرے جانور کو ذبح کیا تو ہر ایک کے لئے الگ الگ بسم اللہ کہا جانا ضروری ہے۔[3]

مشینی ذبیحہ

فقہاء کے اسی نکتہ سے مشینی ذبیحہ کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے، راقم سطور نے مشینی ذبیحہ سے متعلق امریکہ کے ایک سوالنامہ کا جواب لکھا تھا، ذیل میں وہی سوال و جواب درج کیا جاتا ہے:

سوال نامہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین مسئلہ ذیل میں کہ:

کناڈا میں کچھ مسلمانوں نے مرغیوں کے مشینی ذبیحہ کے لئے ایک خاص نظم کیا ہے، اس کی نوعیت یہ ہے کہ بٹن دبانے کے ساتھ ہی آلۂ ضرب جو دھار دار چھرے کی شکل میں ہوتا ہے حرکت کرنے لگتا ہے۔ مشینوں کے ذریعہ مرغیوں کو اس طرح پکڑا جاتا ہے کہ اس کے پاؤں بندھ جاتے ہیں اور نیچے کی جانب سے اس کی گردن عین اس آلہ کی دھار پر آ جاتی ہے اور جانور ذبح ہو جاتا ہے —— واضح ہو کہ ایک دفعہ بٹن آن (On) کرنے کے بعد پھر دوبارہ جب تک بٹن (Off) نہ کیا جائے، مشین اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اور مرغیاں ذبح ہوتی رہتی ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح برقی پنکھا ایک دفعہ چلائے جانے کے بعد از خود چلتا ہے تا آنکہ پنکھا بند کر دیا جائے۔

ہاں اس موقعہ سے ذبح سے پہلے مرغیوں کو معمولی صدمات بھی پہنچائے جاتے

q شامی: ۱۹۰/۵ w المغنی: ۳۲۱/۹

e ابوداؤد: ۳۸۸/۲ باب فی الشاۃ یضحی بھا جماعۃ

ہیں، البتہ اس کے باوجود مرغی کو کامل ہوش وحواس باقی رہتا ہے۔ عام طور پر سر کا حصہ جسم سے بالکل منقطع نہیں ہوتا، ہاں ایسا ضرور ہوتا ہے کہ بعض مرغیاں اس طرح چھرے کے سامنے آتی ہیں کہ بجائے گردن کے ان کی چونچ کٹ جاتی ہے اور وہ مرغیوں کے ساتھ نیچے دب کر مر جاتی ہے۔

یہ بات بھی طے کی گئی ہے کہ ایسی مرغیوں کو جن پر ذبح کا عمل مکمل نہ ہوسکا ہو ان کو الگ کر دیا جائے اور مذبح کا یہودی مالک جو ان مرغیوں کا بھی مالک ہوگا اسے غیر مسلموں سے فروخت کر دے ـــــ بٹن دبانے والا مسلمان ہوگا اور بسم اللہ کہہ کر بٹن دبائے گا۔

پس کیا مشینی ذبیحہ کی یہ صورت امریکہ جیسے ملک میں جہاں کچھ رواجی اور کچھ قانونی محرکات کی وجہ سے مشینی ذبیحہ ہی عام ہے اور اسی کا گوشت کھایا جاتا ہے، درست ہوگا اور ذبیحہ کے سلسلہ میں وارد احکام شرعیہ کی اس کے ذریعہ تکمیل ہو سکے گی یا نہیں؟ ـــــ فقط۔

الجواب "وباللّٰہ لتوفیق"

ذبیحہ کے سلسلے میں شریعت نے چند بنیادی ہدایات دی ہیں اور وہ کسی بھی ذبیحہ کی حلت وحرمت کے لئے مدار اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔

اول یہ کہ ذبح کرنے والا مسلمان یا کتابی ہو ـــــ کتابی سے مراد وہ شخص ہے جو خدا، نبوت اور وحی وغیرہ پر ایمان رکھتا ہو۔ چنانچہ خود ارشاد خداوندی ہے ﴿**وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم**﴾

دوسرے یہ کہ وہ جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ کہے اور بسم اللہ کا مفہوم بھی سمجھتا ہو، چنانچہ قرآن مجید نے کہا ﴿**ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللّٰہ علیہ**﴾ بسم اللہ کا مفہوم سمجھنا کیوں ضروری ہے؟ یہ ظاہر ہے، کیوں کہ جو شخص اس کا مفہوم ہی نہ

سمجھتا ہواس کے بسم اللہ کہنے کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔مشہور فقیہ صاحب ہدایہ کہتے ہیں"ویحل اذا کان یعقل التسمیة[1]"

تیسرے بعض روایات کی روشنی میں فقہاء نے ان رگوں اور نالیوں کی تعیین کی ہے جن کا ذبح کے دوران کٹنا ضروری ہے۔ یہ کل چار ہیں 1 مرئی یعنی سانس کی نالی 2 حلقوم یعنی غذا کی نالی 3، 4 ودجین یعنی دونوں شہ رگ کا جن کا ذریعہ اچھی طرح خون کا اخراج ہوسکتا ہے۔ان چاروں رگوں اور نالیوں کو کاٹا جانا چاہئے۔فقہاء اسلام میں امام مالک کے نزدیک چاروں ہی کو کاٹا جانا ضروری ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالی کے نزدیک تین رگیں بھی کاٹ دی جائیں تو کافی ہے۔[2]

چوتھے مختلف جانوروں کے ذبح کرنے کے لئے الگ الگ چھرے اور آلۂ ذبح کا استعمال ضروری نہیں، اس کا اندازہ حصکفی کی اس عبارت سے ہوتا ہے"حتی لواضجع شاتین احداھما فوق الاخری فذبحھما ذبحة واحدة بتسمیة واحدة حلا۔"[3]

پانچویں ذبح کے لئے جو آلہ استعمال کیا جائے وہ کاٹنے اور قطع کرنے والا ہو، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اس کو تیز کرنے کا بھی حکم فرمایا ہے "ولیحد احدکم شفرته۔[4]"

ایسے آلات جس میں اس بات کا اندیشہ ہو کہ جانور کی موت کٹنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس آلہ کے وزنی ہونے اور اس کی وجہ سے گلا دب جانے کی وجہ سے ہوئی ہے تو ذبیحہ حلال نہیں ہوگا۔

مذکورہ صورت میں اوپر ذکر کی گئی تفصیل کے مطابق ذبح کرنے والا مسلمان ہے، بٹن دباتے وقت بسم اللہ کہتا ہے جن رگوں اور نالیوں کا کاٹا جانا مطلوب ہے وہ

---

r بدائع: ۴۸/۵ t شامی: ۱۹۲/۵

q بدائع: ۴۸/۵ w بدائع: ۴۸/۵

کٹ جاتی ہیں اور جن کی نہ کٹ پاتی ہو ان کو ممتاز کرنا اور علیحدہ رکھنا بھی ممکن ہے، ایک ہی آلۂ ذبح سے بیک وقت کئی جانور ذبح ہو رہے ہیں، یہ ساری باتیں جائز ہیں۔

برقی صدمات کی وجہ سے مرغی کی موت ہو جائے یا اس درجہ کا صدمہ ہو کہ موت کا احتمال ہو تب مردار ہی کہلائیں گی اور ان کا کھانا حلال نہ ہوگا البتہ اگر برقی کے معمولی صدمات کی وجہ سے جانور کے دوران خون میں کوئی کمی نہ واقع ہوتی ہو، نہ خون میں انجماد پیدا ہوتا ہو، نیز امریکہ کے ماحول میں قانونی اور سماجی اسباب کے تحت ایسا کرنے کی حاجت ہو تو اس کو گوارہ کیا جا سکتا ہے اور یہ ذبیحہ بہرحال حلال ہوگا" اذا علم حیاۃ لشاۃ وقت الذبح حلت بالذکاۃ تحرکت اولا خرج منھا دم اولا۔"[2]

البتہ ذبح کی یہ شکل کہ ایک شخص نے بٹن دبایا اور مشین چلنے لگی اور جب تک مشین چلتی رہے گی، جانور کٹتے رہیں گے، دو پہلوؤں سے قابل غور ہیں:

اول یہ کہ ذابح کا مسلمان ہونا ضروری ہے——سوال یہ ہے کہ ایک شخص بٹن دبانے کے بعد الگ ہو جائے اور مشین چلتی رہے اور اپنا کام کرتی رہے تو کیا مشین کے ذریعہ ذبح ہونے والے تمام ذبیحوں کی نسبت اسی ذابح کی طرف ہوگی، اس کو یوں سمجھئے کہ مشین بلا واسطہ فعل ذبح انجام دے رہی ہے اور فقہ کی اصطلاح میں وہ اس فعل کے لئے مباشر ہے۔ بٹن دبانے والے کی حیثیت ''متسبب'' کی ہے مباشر مکلّف ہو تو فعل کی نسبت اس کی طرف ہوتی ہے اور اگر مکلّف یعنی احکام کے مخاطب قرار پانے کا اہل نہ ہو تو اس فعل کی نسبت متسبب کی طرف جاتی ہے، اس لئے بٹن دبانے والے ہی کو ذابح تصور کیا جائے۔

اب صرف ایک مسئلہ باقی رہتا ہے کہ کیا آن (On) کرنے والے کا بسم اللہ کہنا

---

e الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیہ، از ڈاکٹر عبداللہ عبدالرحیم العبادی: ص ۳۹ المیزان

B

ان سب مرغیوں کے لئے کافی ہو جائے گا جو بٹن آف (Off) کرنے تک مشین کے ذریعہ ذبح ہوتی چلی جائیں؟ یہ اہم مسئلہ ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے پہلے ذبح کی بابت چند قواعد پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

اول یہ کہ فقہاء کے اصول اور شریعت کی نصوص کے مطابق ذبیحہ کے اعتبار سے ذبح کی دو قسمیں ہیں۔ ذبح اختیاری اور ذبح اضطراری ـــــ جانور قابو میں ہو تو اس کو ذبح کرنا ذبح اختیاری ہے۔ جانور قابو میں نہ ہو تو اس کو ذبح کرنا ذبح اضطراری ہے، جیسے شکار پر تیر پھینکنا یا تربیت یافتہ کتے چھوڑنا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ سوال میں ذبح کی جو صورت دریافت کی گئی ہے اس کا تعلق ذبح اختیاری سے ہے نہ کہ ذبح اضطراری سے ـــــ ذبح اختیاری اور ذبح اضطراری کے درمیان فقہاء نے جن احکام میں فرق کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ذبح اضطراری میں ''بسم اللہ'' کہنے کا تعلق آلۂ ذبح سے ہوتا ہے اگر کسی نے بسم اللہ کہہ کر تیر پھینکا یا کتے دوڑائے تو وہ تیر جتنے شکار کو لگے گا اور کتے جتنے شکار کو زخمی کریں گے سبھی حلال ہو جائیں گے اس کے برخلاف ذبح اختیاری میں بسم اللہ کا تعلق فعل ذبح سے ہے، مشہور فقیہ ابن نجیم کہتے ہیں:

"ان التسمية في الزكاة الاختيارية مشروعة على الذبح لا على الته وفي الذكاة الاضطرارية التسمية على الالة لا على الذبيحة"[1]

دوسرے یہ کہ چوں کہ ذبح اختیاری میں بسم اللہ کا تعلق فعل ذبح سے ہوتا ہے اس لئے اگر بالتعاقب فعل ذبح پایا جائے یعنی ایک جانور کو لٹایا، اس کو ذبح کیا پھر دوسرے جانور کو لٹایا اور اس کو ذبح کیا تو اب ایک ہی بسم اللہ اس دوسرے جانور کے حلال ہونے کے لئے کافی نہ ہوگا بلکہ دوبارہ بسم اللہ کہنا ضروری ہوگا۔ اور اگر ایک ساتھ چند بکریوں کو ایک دوسرے پر لٹا دیا اور ایک ہی بسم اللہ سے ذبح کرتے چلے گئے تو وہ

سب حلال ہو جائیں گے، گویا فعل ذبح میں تکرار ہو تو بسم اللہ میں بھی تکرار ضروری ہوگا اور فعل ذبح ایک ہی ہو تو گو ذبیحہ متعدد ہوں ایک ہی تسمیہ سب کے لئے کافی ہوگا۔ صاحب درمختار نے اس نکتہ کو واضح کیا ہے۔

"لو اضجع شاتين احدا هما فوق الاخرى فذبحهما ذبحة واحدة بتسمية واحدة حلا بخلاف مالو ذبحهما على التعاقب لان الفعل يتعدد فتتعدد التسمية۔"

تیسرے اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ذبح کا وہ مسلسل عمل جس میں بلا انقطاع چھرا حرکت کرتا رہتا ہے اور مرغیاں اس کی زد میں آئیں اور ذبح ہوتی چلی جائیں، ایک ہی فعل ذبح ہے، اس کا اندازہ درمختار کی مذکورہ بالا عبارت جس میں ایک سے زیادہ جانوروں کے ذبح کو ایک ساتھ حلال قرار دیا گیا ہے کے علاوہ عالمگیری کی اس عبارت سے بھی ...... ہوتا ہے کہ امرار اور چھرے کی مرور حرکت کی کیفیت کو فعل ذبح قرار دیا گیا ہے اور جب تک امرار کی اس کیفیت میں انقطاع نہ پیدا ہو اس کو ذبح واحد کے حکم میں رکھا گیا ہے چنانچہ کہا گیا:

"لو اضجع احدى الشاتين على الاخرى تكفى تسمية واحدة اذا ذبحهما بامرار واحد ولو جمع العصافير فى يده فذبح وسمى وذبح على اثره ولم يسم لم يحل الثانى ولو امر السكين على الكل جاز بتسمية واحد۔"[۴]

ان تینوں قواعد کو پیش نظر رکھا جائے تو مشینی ذبیحہ کا حکم اس طرح نکلتا ہے کہ:

1 بسم اللہ کہہ کر بٹن دبانے والے شخص نے کسی خاص مرغی پر تسمیہ نہیں کہا بلکہ مشین کے ذریعہ صادر ہونے والے مسلسل فعل ذبح پر تسمیہ کہا ہے اور ذبح اختیاری میں تسمیہ کا تعلق فعل ذبح ہی سے ہو سکتا ہے۔

الكبرى للشعرانى، كتاب الاضاحى

2 مشین کا عمل جب تک متواتر چلتی رہے امرار واحد اور ذبح واحد کے حکم میں ہے۔

3 لہٰذا گو مرغیوں کی تعداد کتنی بھی ہو جائے، ان سب کا ذبح ایک ہی فعل ذبح کے تحت انجام پایا ہے اور اس لئے ایک ہی تسمیہ سب کے لئے کافی ہے، ہاں اگر درمیان میں مشین رک گئی یا بند ہوگئی تو دوبارہ مشین چلاتے ہوئے پھر سے تسمیہ ضروری ہوگا۔

یہ ساری تفصیلات ان فقہاء کی رائے پر مبنی ہیں جو ذبح کرتے وقت تسمیہ کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن امام شافعی جن کے نزدیک مسلمان کے لئے تسمیہ کہنا ضروری نہیں کہ بسم اللہ اس کے دل میں موجود ہے، کے یہاں تو یہ ذبیحہ کسی تردد واضطراب کے بغیر حلال ہوگا ہی —— یہ مسئلہ گو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک نیا مسئلہ ہے لیکن ہندوستان کے موجودہ بعض اکابر علماء نے بھی اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور اس کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند اسی نوعیت کے ایک استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں:

''جس بٹن کے دبانے سے جانور کے گردن پر چھری چلتی ہے اس بٹن کا چھری چلانے کے لئے دبانے والا ''بسم اللہ اللہ اکبر'' محض (اللہ کا نام) لے کر بٹن دبائے اور مسلمان ہو یا اہل کتاب (مثلاً یہودی) ہو، اسی طرح جو لوگ چھری چلنے کے وقت جانور پر کنٹرول کرتے ہیں کہ چھری بھکنے نہ پائے جانور کی گردن ہی پر چلے، وہ لوگ مسلمان یا اہل کتاب (مثلاً یہودی) ہوں اور کنٹرول کرتے وقت ''بسم اللہ اللہ اکبر'' (محض اللہ کا نام) لے کر کنٹرول کریں تو یہ طریقہ اور عمل اگرچہ ذبح کے مسنون طریقہ (طریقہ مسنون) نہ ہونے کی وجہ سے مکروہ ہوگا مگر اس عمل سے اگر ذبیحہ کی اکثر رگیں کٹ کر سارا خون نکل جاتا ہو تو ذبیحہ حلال ہو جائے گا اور اس کا کھانا بھی درست رہے گا۔'' 1

---

q المغنی: ۹/۱۰، بدائع: ۵/۴۸

ذبح کے آداب

ذبح کے سلسلہ میں شریعت کا عمومی مزاج یہ ہے کہ ایسی صورت اختیار کی جائے جس میں جانور کو کم سے کم اذیت پہنچے، خون بہتر طور پر نکل جائے اور ذبح میں غلطی کا احتمال کم سے کم رہے، فقہاء نے لکھا ہے:

1 آلۂ ذبح تیز ہو اور لوہے کا ہو، کند ہتھیار اور لوہے کے علاوہ کسی اور چیز سے جانور کو ذبح کرنا مکروہ ہے کہ اس میں اذیت زیادہ ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تاکید فرمائی ہے۔[2]

2 جانور کی مطلوبہ چاروں نالیاں کاٹ دی جائیں کہ اس طرح جلد رشتۂ حیات کٹ سکتا ہے۔[3]

3 رگوں کو تیز تیز کاٹا جائے تا کہ تکلیف کم ہو۔[4]

4 ان ہی چار نالیوں کے کاٹنے پر اکتفاء کیا جائے اور گردن کی ہڈی تک نہ پہنچا جائے۔[1]

5 گردن پشت کی طرف سے نہ کاٹی جائے بلکہ حلق کی طرف سے کاٹی جائے کیوں کہ پشت کی طرف سے کاٹنے میں اذیت زیادہ ہے۔ البتہ اگر پشت ہی کی طرف سے کاٹنا شروع کر دے اور مطلوبہ رگوں تک پہنچنے تک اس میں حیات باقی رہے تو جانور حلال ہو جائے گا، لیکن یہ طریق ذبح مکروہ ہوگا۔[2]

6 جھٹکے کے ساتھ جو جانور کاٹا جائے وہ بھی شریعت کے مقررہ قاعدہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے لیکن ذبیحہ حلال ہو جائے گا۔[3]

---

w درمختار: ۱۹۲/۵ e درمختار: ۱۹۲/۵

q ھدایہ: ۴/۴۱۸، کتاب الذبائح

w ھدایہ: ۴/۴۲۱ e درمختار: ۱۹۲/۵

7 یہ بھی مکروہ ہے کہ جانور کے سامنے آلات ذبح تیز کیا جاے۔[4]

8 مستحب ہے کہ جانور دن میں ذبح کیا جائے، رات میں ذبح کرنا مکروہ تنزیہی ہے کہ مطلوبہ رگوں کے کٹنے اور نہ کٹنے کا اندازہ دشوار ہے۔[5]

البتہ فی زمانہ روشنی کی ایسی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں کہ بسہولت اس وقت کا ازالہ ہوسکتا ہے، اگر ایسا ہو تو مکروہ نہیں ہوگا۔

9 یہ بھی مستحب ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ رکھا جائے اور ذبح کرنے والا بھی قبلہ رخ ہوکر ذبح کرے۔[6]

0 ذبح کرنے کے بعد جانور کے پوری طرح ٹھنڈا ہونے سے پہلے اس کا چمڑا چھیلنا بھی مکروہ ہے اس لئے کہ اس سے جانور کو زیادہ اذیت ہوگی۔[7]

! غصب، چوری وغیرہ کے ہتھیار سے جانور کو ذبح کیا جائے تو جانور تو حلال ہو جائے گا لیکن اس کا یہ عمل مکروہ ہوگا۔[8]

سات حرام اعضاء

امام مجاہد کی ایک مرسل روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال جانوروں کی بھی سات چیزوں کو ناپسند فرمایا ہے، نر اور مادہ کے اعضاء تناسل، فوطے، بہتا ہوا خون، مثانہ، پتھ (مرارۃ) مغز حرام (غدۃ)۔[1] اسی لئے فقہاء نے بھی ان اجزاء کو حرام قرار دیا ہے۔[2]

جنین کا حکم

q مسلم عن شداد بن اوس w البحر الرائق: ۱۷۳/۸

q البحر الرائق: ۱۶۸/۸ w درمختار: ۱۹۲/۵

q هندیه: ۲۸۹/۵

q ماهنامه دارالعلوم دیوبند جون ۱۹۷۸ء، (راقم کے اس فتویٰ سے حضرت مولانا مجاہدالاسلام

فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ ذبیحہ کے جنین کو ذبح کیا جانا درست ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل یوں ہے کہ اگر نامکمل تخلیق کی حالت میں ذبح کے بعد وہ مردہ جنین نکلا تو بالاتفاق اس کا کھانا حلال نہ ہوگا، ذبح کے بعد زندہ حالت میں نکلا تب ذبح کیا جانا درست ہوگا، اگر ذبح کرنے سے پہلے مرگیا تو بالاتفاق کھانا حرام ہوگا۔ اور کامل الخلقت ہوکر مردہ نکلا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا کھانا جائز نہ ہوگا، دوسرے فقہاء کے نزدیک جائز ہوگا، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماں کو ذبح کرنا جنین کو ذبح کرنا ہے "ذکاۃ الجنین ذکاۃ امہ" حدیث کا مفہوم یہی متعین کرتے ہیں کہ ماں کے ذبح کئے جانے کی طرح جنین کو بھی ذبح کیا جانا چاہئے۔[3]

قرآن میں مذکور محرمات

اب ایک نظر ہم ان احکام پر ڈالتے ہیں جو اس سلسلہ میں خود قرآن مجید نے بیان کئے ہیں، ارشاد خداوندی ہے:

﴿ ! " # $ % & ' ( ) * +

, - . / 0 1 2 3 4

5 6 7 8 9﴾ [1]

D: ''تم پر حرام کئے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور کہ غیر اللہ کے نام زد کردیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مرجائے اور جو کسی ضرب سے مرجائے اور جو اونچے سے گر کر مرجائے اور جو کسی ٹکر سے مرجائے اور جس کو کوئی درندہ کھانے لگے سوائے اس کے جس کو ذبح

صاحب قاسمی، جناب مولانا محمد رضوان القاسمی اور جناب مولانا بدرالحسن قاسمی صاحبان نے بھی اتفاق فرمایا ہے۔

w بدائع: ۶۰/۵ e بدائع: ۶۰/۵ r بدائع: ۶۰/۵

کرڈالو اور جو پرستش گاہوں پر ذبح کیا جائے۔"

ذبیحہ کے سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ آیت سب سے زیادہ جامع اور احکام میں صریح ہے، انہی میں سے ہر ایک پر اس وقت گفتگو کی جاتی ہے۔

مردار

"میتة" سے مراد مردار ہے، چاہے وہ طبعی موت مرا ہو یا ذبح کے شرعی طریقے کی تکمیل کے بغیر انسانی ہاتھوں اس کی موت ہوئی ہو۔[2] حیوان کے وہ اجزاء جسم جن میں موت سرایت کرتی ہے اور جن سے زندگی اور موت کا تعلق ہے ان میں سوائے چمڑے کے تمام چیزوں گوشت وغیرہ کی حرمت پر اتفاق ہے البتہ جسم کے وہ اجزاء جن میں حیات سرایت نہیں کرتی یعنی بال، اون اور ہڈی وہ پاک ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔[3]

البتہ مردار کے چمڑے کو دباغت دے کر اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے ـــــ اکثر فقہاء کے نزدیک چمڑے کی دباغت یعنی مٹی، نمک یا کسی بھی کیمیکل طریقہ سے صاف کرنے کے بعد وہ پاک ہو جاتا ہے اور اس کا استعمال نیز خرید وفروخت جائز ہو جاتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر حضرت میمونہ کی مردار بکری پر ہوا تو فرمایا: "هلا اخذتم اهابها" اس کا چمڑا کیوں نہ لے لیا۔[1] ترمذی شریف کی روایت ہے کہ جس چمڑے کو دباغت دی جائے وہ پاک ہوجاتا ہے "ایما اهاب دبغ فقد طهر"[2] مالکیہ کے نزدیک دباغت کے بعد بھی مردار کے چمڑے سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔[3] واقعہ ہے کہ احادیث وآثار کی روشنی میں پہلی رائے ہی زیادہ صحیح ہے۔

البتہ اس میں احناف کے نزدیک بھی استثناء ہے کہ سور کا چمڑا نجس العین ہونے

---

q بدائع: ۶۰/۵ w المغنی: ۳۱۹/۹

e شرح مهذب: ۸۱/۹ r المغنی: ۳۱۷/۹

کی وجہ سے بہر حال ناپاک ہے اور دباغت کے بعد بھی پاک نہیں، امام شافعی کے نزدیک کتے کے چمڑے کا بھی یہی حکم ہے جب کہ احناف کے نزدیک کتے کا چمڑا بھی دباغت کی وجہ سے پاک ہوجاتا ہے۔[4]

مردار کے گوشت سے جس طرح خود فائدہ اٹھانا جائز نہیں ایسے ہی جانوروں کو بھی کھلانا جائز نہیں۔"ولا یطعمها الکلاب والجوارح لانها ضرب من الانتفاع۔"[5]

مردار کی پانچ خاص صورتیں

قرآن مجید نے آگے پانچ اور قسمیں بیان کی ہیں جو میتہ ہونے ہی کی بنا پر حرام ہیں، منخنقہ، موقوذہ، متردیہ، نطیحہ اور ما اکل السبع۔

منخنقہ: اس جانور کو کہتے ہیں جس کا رسی یا کسی اور ذریعہ سے گلا گھونٹ دیا جائے۔

موقوذہ: وہ جانور ہے جس کی موت زدوکوب کی چوٹ کی وجہ سے واقع ہو۔

متردیہ: وہ جانور ہے جو بلندی سے نیچے کی طرف گرنے کی چوٹ سے مرگیا ہو۔

نطیحہ: ایک جانور کے حملہ کی وجہ سے دوسرے جانور کی موت واقع ہو جائے اس کو "نطیحہ" کہتے ہیں۔[1]

ما اکل السبع: سے مراد یہ ہے کہ جس جانور کی موت درندوں کے چیر پھاڑ کرنے کی وجہ سے ہوئی ہو، اس کو بھی کھانا جائز نہیں، اس لئے کہ ان تمام صورتوں میں ذبح کا جو شرعی طریقہ ہے اور جن رگوں کا کاٹا جانا مطلوب ہے کہ ان کے ذریعہ جسم کا خون بہہ جائے، اس کی تکمیل نہیں ہو پائی ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی ہے "الا ما ذکیتم" یعنی ان تمام

---

t بدائع: ۵/۶۰ y بدائع: ۵/۶۰

u المغنی: ۹/۳۲۰ i شرح مہذب: ۹/۸۲

q کتاب الآثار لامام محمد: ص۱۱۶

صورتوں میں اگر موت سے پہلے جانور گرفت میں آ جائے اور اسے شرعی طور پر ذبح کر لیا جائے تو اب اس کا کھانا حلال ہو جائے گا۔[2]

اسی طرح جانور کا کوئی حصہ جو اس کے زندہ وجود سے کاٹ لیا جائے بالاتفاق مردار کے حکم میں ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ما قطع من البهيمة وهي حية فهي ميتة۔"[3]

اس حکم سے بڑا مقصد جانوروں کے ساتھ رحم دلی اور اس کی بے جا اذیت سے حفاظت ہے، اسلام سے پہلے لوگ زندہ جانوروں سے گوشت کاٹ لیتے تھے اور کھاتے تھے، اس میں جانوروں کے لئے جس درجہ کی ایذا تھی وہ محتاج اظہار نہیں۔

خون

مردار کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خون (دم) کا ذکر فرمایا ہے[4] میں مطلقاً خون کو حرام قرار دیا گیا ہے اور سورۂ انعام میں بہتے ہوئے خون کو، اس لئے علماء کا اتفاق ہے کہ خون حرام اور نجس ہے، البتہ سورۂ انعام کی روشنی میں اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ جس خون کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے وہ خون ہے جو بہتا ہوا ہو۔ "حمل العلماء هنا المطلق على المقيد"[1] اور خون جو گوشت میں ہوتا ہے، حرام نہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ ان سے خون لگے ہوئے گوشت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خون سے منع فرمایا ہے جو بہتا ہوا ہو۔ "نهي عن الدم المسفوح"[2] حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی سے ایک اور روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ

w بدائع: ۶۱/۵ 		e تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع: ۶۲/۵، المغنی: ۳۱۹/۹

q مائدہ، آیت: ۵ 		w احکام القرآن للجصاص: ۱۰۸/۱

e قرطبی: ۲۱۹/۲، تفسیر کبیر: ۱۵/۳، احکام القرآن للجصاص: ۲۱/۱

q قرطبی: ۲۱۸/۲ 		w ترمذی عن ابن عباس وقال حسن صحیح

میں ہم لوگ گوشت پکاتے تھے اور خون کی زردی ان پر نمایاں رہتی تھی اور یہی گوشت ہم لوگ کھاتے تھے۔[3]

اسی صل پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھلی سے نکلنے والا خون ناپاک نہیں ہے، یہی حکم مکھی، مچھر وغیرہ کے خون کا ہے کہ یہ سب بہتے ہوئے خون (دم مسفوح) میں داخل نہیں۔

سور

تیسرے سور کا ذکر کیا گیا ہے، قرآن کا مزاج یہ ہے کہ وہ لفظی موشگافیوں کے بجائے استعمال اور زبان و بیان کے معاملہ میں عرف کو ملحوظ رکھتا ہے پس ہر چند کہ خنزیر اپنے وجود کے ساتھ حرام اور ناپاک ہے لیکن چونکہ سور کا اصل مقصود اس کا گوشت ہے اس لئے از راہ اتفاق بجائے خنزیر کے ''لحم خنزیر'' سور کے گوشت کا ذکر کیا گیا، حالانکہ سور کے تمام اجزاء اسی طرح حرام ہیں، یہ ٹھیک ویسے ہی ہے جیسے جمعہ والی آیت میں تجارت سے منع کیا گیا حالانکہ تجارت ہی پر موقوف نہیں، اذان جمعہ کے بعد ہر طرح کا معاشی کاروبار ممنوع ہے، افسوس کہ بعض بدبختوں اور خدا ناترسوں نے گوشت کی اس اتفاقی قید کی وجہ سے سور کی چربی کا جواز نکال لیا ہے، حالانکہ امت کا اجماع اور اتفاق ہے کہ سور کی چربی بھی سور کے گوشت ہی کی طرح حرام ہے، قرطبی کا بیان ہے:

''اجمعت الامة علی تحریم شحم الخنزیر۔''[1]

البتہ خنزیر کے بال کے بارے میں اختلاف ہے کہ جوتے وغیرہ کی سلائی میں اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ فقہاء احناف نے مسلمانوں کے تعامل کو دیکھتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے۔[2] قرطبی نے نقل کیا ہے کہ خود عہد رسالت میں بھی اس کا استعمال تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر نکیر فرمانا ثابت نہیں ہے۔[3] امام شافعی گو

---

e قرطبی: ۱۸/۲ r احکام القرآن للتھانوی: ۱۱۵/۱

t احکام القرآن: ۷/۱، نیز دیکھئے تفسیر کبیر: ۱۹/۳ المسالۃ الرابعۃ

اس کو بھی منع کرتے ہیں لیکن خود مشہور شافعی مفسر قرآن امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ تعالیٰ کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں احناف کے ساتھ ہیں۔

غیر اللہ کے نام پر ذبح شدہ جانور

چوتھے قرآن مجید نے ان جانوروں کو حرام قرار دیا ہے جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے گئے ہوں، خواہ جمادات کے نام پر ہو یا کسی بزرگ اور پیغمبر کے نام پر ——— چنانچہ ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ عیسائی جن جانوروں کو حضرت مسیح کے نام پر ذبح کریں وہ بھی حرام ہیں۔[4] نیز حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب تم یہود و نصاریٰ کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہوئے دیکھو تو مت کھاؤ۔[5] بعض لوگوں نے عیسائیوں کے ایسے ذبیحہ کو بھی حلال قرار دیا ہے جو حضرت مسیح کے نام پر ذبح کیا گیا ہو لیکن یہ قطعاً غلط ہے اور امت کے عمومی مسلک و نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔[6]

آستانوں کا ذبیحہ

قرآن مجید نے ذبیحہ کی جن صورتوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں ایک "وما ذبح علی النصب" بھی ہے "نصب" کے معنی بعض اہل علم نے بتوں کے بتائے ہیں۔[1] اور اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مکہ کے گرد کچھ پتھر تھے جن پر خصوصیت سے لوگ جانوروں کو ذبح کیا کرتے تھے اور اس میں ان مقامات کی تعظیم مقصود ہوا کرتی تھی۔[2] ——— اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ غیر اللہ کی تعظیم کے لئے جو بھی جانور ذبح کئے جائیں وہ سب حرام ہیں، سیدتنا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ عجم

---

q مائدہ، آیت: ۳

w یہ رائے احناف، شوافع اور حنابلہ کی ہے، مالکیہ کے مسلک میں قدرے تفصیل ہے، مالکیہ کے مسلک کی تفصیل کے لئے دیکھئے حاشیہ دسوقی و شرح کبیر: ۱۱۳/۲

e ترمذی　r بقرہ: ۲، مائدہ: ۵

اپنے تیوہاروں کے موقعہ سے جانور ذبح کرتے ہیں اور مسلمانوں کو تحفہ دیتے ہیں، مسلمان اس سے کھائیں یا نہیں؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ "ما ذبح علی ذلک الیوم فلا تأکلوا منه" کے لئے جو جانور ذبح کئے جائیں اس میں سے نہ کھاؤ۔[3] حسن بصری سے منقول ہے کہ ایک عورت نے اپنی گڑیا کی شادی کی اور اس میں کچھ اونٹ ذبح کئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ گوشت نہ کھایا جائے اس لئے کہ یہ بت کے لئے ذبح کیا گیا ہے۔[4] ان روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاہے جانور کے ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے لیکن اگر غیر اللہ کی تعظیم مقصود ہو تو ذبیحہ حرام ہی ہوگا، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"نهى اللّٰه المؤمنين عن هذا الصنيع وحرم عليهم أكل هذه الذبائح التي فعلت عند النصب، حتى ولو كان يذكر عليها اسم اللّٰه في الذبح عند النصب ...... وينبغي أن يحمل على هذا لأنه قد تقدم تحريم ما أهل به لغير اللّٰه۔"[5]

D: "اہل ایمان کو اس طریقہ سے منع فرمایا گیا اور ان کے لئے آستانوں پر کئے جانے والے ذبیحے حرام قرار دیئے گئے، گو آستانوں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام ہی کیوں نہ لے لیا جائے......اور آیت کا یہی معنی مراد لیا جانا چاہئے کیوں کہ ان جانوروں کی حرمت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جن کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔"

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایسا جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر چھوڑا جائے چاہے کسی نبی یا ولی کے نام پر کیوں نہ ہو، اگر وہ شخص اپنے اس مشرکانہ عمل سے تائب

q قرطبی: ۲۲۲/۲ w احکام القرآن للجصاص: ۱۲۳/۱
e قرطبی: ۲۲۳/۲

نہ ہواور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے لے یا تعظیم کی نیت سے مزاروں اور آستانوں پر جانور ذبح کرے تو یہ بھی مردار ہی کے حکم میں ہوگا اور اس کا کھانا حلال نہ ہوگا کہ یہ بھی "ما اھل بہ لغیر اللہ" کے عموم میں داخل ہے اور معنوی اعتبار سے "ما ذبح علی النصب" کا مصداق ہے ـــــ واللہ اعلم۔

گوملا جیون کی تفسیر احمدی میں ایسے ذبیحہ کو حلال اور پاک قرار دیا گیا ہے۔[1]

شکار

کون سے جانور حلال ہیں اور کون سے حرام اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جن جانوروں کا کھانا حلال ہے ان کا شکار بھی جائز ہے، شکار کا جائز ہونا قرآن مجید اور حدیث سے ثابت ہے، ارشاد خداوندی ہے:

﴿ ® ¯ ° ± ﴾ [2]

D: ''احرام کھولنے کے بعد شکار کر سکتے ہو۔''

آگے فرمایا کہ اپنے تربیت یافتہ شکاری جانوروں کے ذریعہ شکار کرو۔ یہ بھی تمہارے لئے حلال ہیں بشرطیکہ وہ شکار کئے ہوئے جانور کو تم پر روک لیں اور تم ان پر اللہ کا نام لے چکے ہو[1] حدیثیں بہت سی شکار کے جواز میں موجود ہیں، اسی لئے شکار کے حلال اور مباح ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے۔[2]

سمندری اور زمینی دو طرح کے جانور کا شکار جائز ہے۔ خواہ ان کا کھانا حلال ہو یا نہ ہو، کھانا حلال ہو تو گوشت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، حلال نہ ہو تو اس کے چمڑے، بال اور ہڈی وغیرہ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، یا اس کی ایذاء سے اپنا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔[3] البتہ یہ ضروری ہے کہ جس جانور کا شکار کیا جا رہا ہو وہ کسی اور کی ملکیت نہ ہو۔[4] نہ حدود حرم میں واقع ہو، ہاں ایذاء پہنچانے والے جانور حرم میں ہوں تو بھی ان کا شکار

q قرطبی: ۲۲۲/۲ w جصاص: ۱۲۹/۱
e قرطبی: ۲۲۳/۲ r جصاص: ۱۲۹/۱

جائز ہے۔[5]

1 شکار کے سلسلہ میں کئی بات ہے جو پیش نظر رکھے جانے کے لائق ہے اول خود شکار کرنے والے کے بارے میں کیا باتیں پائی جانی چاہئیں، شکار میں اس سے کیا عمل متعلق ہے؟

2 دوسرے خود اس جانور کے احکام جس کا شکار کیا جائے۔

3 تیسرے آلات شکار کہ کن اشیاء سے شکار کیا جا سکتا ہے؟

شکار کرنے والے میں مطلوبہ اوصاف

شکار کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں وہ تمام اوصاف موجود ہوں جو اختیار اور قابو میں رہنے والے جانور کے ذبح کرنے والے کے اندر پائے جانے ضروری ہیں، یعنی وہ بسم اللہ اور ذبح کے مفہوم کو سمجھتا ہو، مسلمان ہو یا اہل کتاب میں سے ہو نیز خود شکار کرنے والے حالت احرام میں نہ ہو، اگر کتے وغیرہ کے ذریعہ شکار کیا ہو تو یہ بھی ضروری ہے کہ خود کتے کو شکار پر چھوڑا ہو اور کتا چھوڑنے میں اس کے ساتھ کوئی ایسا شخص شریک نہ ہو کہ جس کا شکار حلال نہیں، شکار کرنے والے تیر پھینکتے ہوئے یا کتے کو چھوڑتے ہوئے قصداً بسم اللہ کو ترک نہ کرے نیز کتا چھوڑنے کے بعد مسلسل جانور کے تعاقب میں رہے اور کسی دوسرے کام میں مشغول نہ ہو۔ اگر کسی دوسرے کام میں لگ گیا پھر بعد کو شکار کیا ہوا جانور مردہ ملا تو اب اس کا کھانا حلال نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس امر کا احتمال موجود ہے کہ اس کے چھوڑے ہوئے کتے کے بجائے کوئی دوسرا کتا اس کی موت کا سبب بنا ہو۔[1]

شکار کب حلال ہوگا؟

---

t تفسیر کبیر: ۲۰/۳

y تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر کبیر: ۲۲،۲۱/۳

جس جانور کا شکار کیا جائے، اس کے حلال ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ذبح اور نحر ہی کیا جائے بلکہ اس کے جسم کے کسی بھی حصہ کا زخمی کر دینا کافی ہے، اگر زخمی نہ ہو، محض جانور کی گردن ٹوٹ جائے یا کتا اس کا گلا گھونٹ دے تو اس کا کھانا حلال نہ ہوگا۔[2] نیز اگر موت سے پہلے اس جانور پر قابو پالیا تو پھر اس کو ذبح کے شرعی قواعد کے مطابق ذبح کرنا ضروری ہوگا، اس کے بغیر جانور حلال نہ ہوگا[3] اور اس پر تمام ہی فقہاء کا اتفاق ہے۔[4] یہ بات بھی ضروری ہے کہ جس جانور کا شکار کیا جائے وہ وحشی ہو، پالتو اور مانوس نہ ہو اور اپنے بچاؤ پر قدرت رکھتا ہو، بھاگ سکتا ہو یا اڑ سکتا ہو، ایسا جانور جو بھاگنے پر قادر نہ ہو اور بآسانی گرفت میں آ سکتا ہو، اس کو پکڑ کر عام قاعدہ کے مطابق ہی ذبح کرنا ضروری ہوگا، مثلاً پرندہ جال میں پھنس گیا، ہرن کنویں میں گر گیا یا ہو تو جنگلی جانور لیکن پالتو جانوروں کی طرح مانوس ہو گیا، اب اسے بآسانی پکڑا جا سکتا ہے، ان صورتوں میں محض زخمی کر دینا ہی کافی نہیں، عام طریقہ کے مطابق جانور کو ذبح کرنا ضروری ہوگا۔[5]

اگر شکار پر حملہ کیا گیا اور اس کا کوئی عضو کٹ کر الگ ہو گیا تو وہ مردار کے حکم میں ہے، اس کا کھانا جائز نہیں۔ اگر پورا جانور دو لخت ہو گیا یا ایک طرف ایک تہائی اور دوسری طرف دو تہائی ہو گیا ایسی صورت میں علیحدہ شدہ حصہ اور جانور کا اصل حصہ دونوں کا کھانا جائز ہوگا۔[1]

شکار کس کا کیا جائے؟

جیسا کہ مذکور ہوا شکار کھائے جانے والے اور نہ کھائے جانے والے دونوں کا کیا جا سکتا ہے۔ نہ کھایا جانے والا شکار کی وجہ سے پاک ہو جاتا ہے اور اس طرح اس

q تفسیر کبیر: ۱۳۵/۱۱ w قرطبی: ۵۷/۶
e تفسیر ابن کثیر: ۲۱۱/۲ r تفسیر ابن کثیر: ۲۱۱/۲ t ابن کثیر: ۱۲/۲
q تفسیر احمدی: ص ۳۷ بحوالہ احکام القرآن للتھانوی: ۱۱۷/۱

کے چمڑے، بال وغیرہ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔[2] اگر نجس العین یعنی سور نہ ہوتو گوشت بھی پاک ہوجاتا ہےاور کھانے کے علاوہ کسی اور ضرورت کے لئے مثلاً خارجی دواؤں کے لئے اس کا استعمال کیا جاسکتا ہے ـــــ خنزیر کی نجاست شکار کے باوجود باقی رہتی ہے۔

کسی جانور سے ضرر پہنچتا ہوتو اس سے نجات کے لئے اس کو ہلاک کرنا جائز ہے۔[3] بے مقصد اور محض کھیل تماشہ کے لئے کسی ذی روح کی جان لینا جائز نہیں۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص محض بے مقصد کسی گوریئے کی جان لے لےتو وہ قیامت میں فریاد کناں ہوگا کہ اے پروردگار! فلاں شخص نے مجھے ناحق ہلاک کیا تھا اور بے فائدہ میری جان لی تھی۔[4] فقہاء نے بھی اس کو ناجائز لکھا ہے۔[5]

آلاتِ شکار

شکار کے لئے جو آلات استعمال کئے جائیں وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک ذی روح، دوسرے غیر ذی روح۔ غیر ذی روح مثلاً تیر، نیزہ، تلوار وغیرہ، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دھاردار ہو جو جانور کو زخمی کر سکے، حضرت ابوثعلبہ خشنی کی روایت میں ہے کہ جس جانور کا تیر سے شکار کرو اور اس پر اللہ کا نام لے چکے ہو تو اس میں سے کھا سکتے ہو۔[1] ایسے ہتھیار جس سے چوٹ کی وجہ سے موت واقع ہوجائے اس کا کھانا جائز نہیں، عدی بن حاتم کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو تیر کی نوک کے بجائے پھل کی چوٹ لگےاور موت واقع ہوجائے، اسے نہ کھاؤ" ما اصاب بعرضه فلا تأكل[2] اگر کسی شخص نے بھاری پتھر سے مارا اور موت واقع ہوگئی تو اس کا کھانا جائز نہ ہوگا، دھاردار ہلکا پتھر ہوتو جائز ہوگا۔[3] علامہ ابن نجیم نے

---

w مائدہ، آیت: ۲

q مائدہ، آیت: ۴   w المغنی: ۲۹۲/۹   e بدائع: ۶۱/۵

اس سلسلہ میں بڑا جامع اصول متعین کیا ہے اور وہ یہ کہ جانور کی موت اگر زخم کی وجہ سے ہوئی ہے تو وہ حلال ہوگا، بوجھ اور چوٹ کی وجہ سے ہوئی ہے یا ایسا ہونے کا شک ہے تب بھی احتیاطاً شکار حرام ہی ہوگا۔ جانور کو ایسا زخم آیا کہ خون نکل پڑا تو پھر بالاتفاق جانور حلال ہوگا اور اگر خون بالکل نہ نکل پایا تو اس میں اختلاف ہے لیکن راجح قول یہی ہے کہ اس کا کھانا بھی حرام ہی ہوگا۔[4]

شکاری جانور

ذی روح آلۂ صید سے مراد وہ جانور ہے جن کو شکار کے لئے استعمال کیا جائے، یہ چوپایہ بھی ہو سکتے ہیں جیسے کتا اور پرندہ بھی ہوسکتا ہے جیسے باز، شاہین وغیرہ۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿n o p q r﴾[5]

D: ''اور جن شکاری جانوروں کو تم تعلیم دو اور ان کو چھوڑ و بھی۔''

یہاں ''ج سے مراد یہ'' وہ جانور ہے جو دانت یا پنجے سے شکار پر حملہ کرے اور اسے زخمی کرے۔[1] اس طرح دانت سے شکار کرنے والے تمام جانور کتا ہو یا کوئی اور درندہ ہو[2] اور پنجہ سے شکار کرنے والے تمام پرندے اس میں داخل ہیں کہ ان سب کو شکار کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے صرف سور اپنی نجاست کی وجہ سے اس سے مستثنیٰ ہے کہ اس کے ذریعہ نہ شکار کرنا جائز ہے نہ حلال۔[3] البتہ قرآن مجید نے اس کے ساتھ یہ بھی قید لگائی ہے کہ وہ پہلے سے شکار کے تربیت یافتہ ہوں ﴿n o p q r﴾[4] اس لئے جانور کا تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے اور اس پر فقہاء کا

r البحر الرائق: ۲۲۰/۸ t بدائع: ۴۱/۵
q عالمگیری ۴۲۱/۵، الباب الثالث فی شرائط الاصطیاد
w رد المحتار: ۲۹۹/۵، ۳۰۰ e بحر: ۲۲۳/۸
r بدایة المجتهد: ۴۴۵/۱ t رد المحتار: ۳۰۰/۵

اتفاق ہے۔[5]

کتے کے تربیت یافتہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ جب اسے دوڑایا جائے دوڑے، روک دیا جائے رک جائے اور جانور پر قابو پانے کے بعد اس میں سے خود نہ کھائے جیسا کہ قرآن نے کہا: "فکلوا مما امسکن علیکم"[6] حدیث میں آیا "فان اکل فلا تأکل"[7] اگر جانور اس میں سے کھالے تو تمہارے لئے کھانا روا نہیں۔[8]

پرندوں کے تربیت یافتہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ اسے شکار پر چھوڑ کر پکارا جائے تو واپس آ جائے۔ پرندوں کے تربیت یافتہ ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے شکار میں سے نہ کھائے۔ اگر کھالیا تب بھی وہ شکار حلال ہوگا، چنانچہ علی، ابن عباس اور سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ اگر شاہین شکار میں سے کھا لے تو کھالو اور کتا کھالے تو نہ کھاؤ "اذا اکل الصقر فکل وان اکل الکلب فلا تأکل۔"[9]

بندوق کا شکار

بندوق کے شکار کو عام طور پر فقہاء حرام قرار دیتے ہیں اور اس طرح کی جزئیات فقہاء متقدمین ومتاخرین کی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن فقہاء کی ان تحریرات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مٹی کے معمولی ڈھیلے بندوق کے ذریعہ پھینکے جاتے تھے، اس لئے فقہاء کی یہ رائے اپنی جگہ درست تھی۔

---

q بحر: ۲۳۰/۸ w شامی: ۳۰۵/۵ e ردالمحتار: ۳۰۵/۵

r نیل الاوطار: ۱۵۵/۸ t درمختار: ۲۹۷/۵، کتاب الصید

q صحیح مسلم: ۴۶/۲، باب الصید بالکلاب المعلمة والرمی

w بخاری: ۸۲۳/۲ باب ما اصاب المعراض بعرضه

e بحر: ۲۲۹/۸ r بحر: ۲۲۹/۸

موجودہ زمانہ میں جو بارودی گولیاں تیار ہوئی ہیں وہ کسی دھار دار سے بھی بہتر طریقہ پر جسم کے خون کو بہا دیتی ہیں اور پارہ پارہ کر دیتی ہیں اور شریعت کا اصل مقصود یہی ہے کہ خون اچھی طرح بہہ جائے، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ بندوق کی موجودہ وضع آلۂ شکار کے لئے شریعت کی مطلوبہ شرط کو پورا کرتی ہے۔

چنانچہ علامہ صنعانی نے بھی اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے:

"واما البنادق المعروفة الان فانها ترمي بالرصاص فيخرج وقد صيرته النار البارود كالنبل فيقتل بحده لا بصدمه فالظاهر حل ما قتله۔"[۱]

D: ''وہ بندوقیں جو آج کل مروج ہیں، چھروں کو پھینکتی ہیں چھرے نکلتے ہیں اور بارود کی طاقت ان چھروں کو تیر کی طرح بنا دیتی ہے چنانچہ وہ اپنی دھار سے شکار کو قتل کرتی ہے نہ کہ چوٹ سے، لہٰذا بظاہر اس کے مقتول کو حلال ہونا چاہئے۔''

شیخ رضا مصری نے اس مسئلہ پر شرح و بسط سے کلام کیا ہے اور نقل کیا ہے کہ تونس کے مشہور حنفی عالم شیخ بیرم بھی اس کو جائز قرار دیتے تھے۔[2] مشہور اہل حدیث عالم علامہ شوکانی اس کو جائز قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔"والذي يظهر لي انه حلال۔"[1]

ڈاکٹر عبداللہ عبدالرحیم العبادی نے نقل کیا ہے کہ علامہ ابن عابدین شامی نے اس کے حلال ہونے پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے۔[2]

علماء مالکیہ میں علامہ دسوقی، علامہ ابوالبرکات احمد دردیر وغیرہ جیسے بلند پایہ علماء نے اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔[3]

---

t مائدہ، آیت: ۴

q احکام القرآن للجصاص: ۹/۳ w بدائع: ۵/۵۸

اس گنہ گار کا خیال ہے کہ اس طرح کے نئے مسائل پر فقہاء کی نصوص سے زیادہ شریعت کی نصوص اور شارع کے مقصد نیز احکام کی روح پر نظر رکھنی چاہئے اور شارع کا مقصد بالکل واضح ہے کہ جانور کا خون اچھی طرح بہہ جائے تو حلال ہے اور نہ بہہ پائے اور جسم میں منجمد ہو جائے تو حرام۔ اس اعتبار سے کوئی شبہ نہیں کہ بندوق کا شکار شریعت کے مقصد کی تکمیل کرتا ہے اس لئے اسے حلال ہی ہونا چاہئے۔[4] ——— واللہ اعلم بالصواب۔

ذبیحہ اور شکار کی حلت وحرمت کا ایک اہم قاعدہ

شکار اور ذبیحہ کے بارے میں یہ بات خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہئے کہ جہاں کہیں بھی حلت وحرمت مشتبہ ہو جائے وہاں اس کے حرام ہونے ہی کو ترجیح دی جائے گی، فقہاء نے ہر جگہ اس کا لحاظ رکھا مثلاً جانور پر ایک مسلمان نے کتا چھوڑا، دوسرے مجوسی کا چھوڑا ہوا کتا بھی شریک ہو گیا تو گو اس کا احتمال موجود ہے کہ مسلمان کے کتے ہی نے شکار کیا ہو لیکن مجوسی کے کتے کی شرکت کی وجہ سے اس پر حرام ہونے کا حکم لگے گا۔

شکار کا جانور چھوڑنے کے بعد ضروری ہے کہ شکار کئے گئے جانور کے تعاقب اور تلاش میں رہے، بیٹھ رہا اور بعد کو مرا ہوا شکار ملا تو گو اس کا کتا وہاں موجود ہو پھر بھی حلال نہیں کہ ممکن ہے موت کا کوئی اور سبب پیش آیا ہو۔

پرندہ کو تیر لگا، وہ وہاں سے کسی پہاڑی وغیرہ پر گرا، پھر وہاں سے زمین پر گرا اور

---

e شامی: ۲۹۹/۵ — r مائدہ، آیت: ۴

t المغنی: ۲۹۴/۹ — y مائدہ، آیت: ۴

u ترمذی عن عدی بن حاتم: ۲۷۲/۱ — i المغنی: ۲۹۴/۹، ۲۹۵، بدائع: ۵۲/۵

o بدائع: ۵۵/۵، المغنی: ۲۹۷/۹

q سبل السلام: ۱۸۵/۴

C11

مردہ پایا گیا تو حلال نہ ہوگا کہ ممکن ہے تیر کے زخم کی بجائے چوٹ اس کی موت کا سبب بنی ہو[1] ـــــ شریعت کی اس احتیاط کو ذبح و شکار کے ان تمام احکام میں ملحوظ رکھا جائے جن میں اس کے خلاف کوئی واضح دلیل موجود نہ ہو۔

شراب ـــــ اسلام کی نظر میں!

شریعت کے رمز شناس اور اس کی مزاج و مذاق سے آگاہ علماء نے لکھا ہے کہ بنیادی طور پر احکام شریعت کے پانچ مقاصد ہیں، جان کی حفاظت، دین کی حفاظت، عقل کی حفاظت، عزت و آبرو کی حفاظت اور مال کی حفاظت[2]۔

شریعت کے جتنے احکام ہیں خواہ وہ مرضیات ہوں یا منہیات اور ان کا کیا جانا مطلوب ہو یا ان کا ترک کرنا مقصود ہو، وہ بہر حال انہی پانچ مقاصد کی تکمیل ہے، ان مقاصد پنجگانہ میں سے عقل کی حفاظت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ان تمام چیزوں پر روک لگائی جائے جو عقل و دماغ کے توازن کو متاثر کر دیتے ہوں، ان میں سرفہرست نشہ اور شراب ہے جو انسان کو وقتی طور پر عقل و شعور سے محروم کر دیتا ہے اور ہوش و خرد سے عاری کر کے ایسی ایسی حرکتوں کا ارتکاب کراتا ہے اور زبان سے وہ کچھ کہلاتا ہے کہ حالت اعتدال میں وہی شخص اس کے تصور سے بھی پشیمان ہو اور گھن محسوس کرے۔ یہ نشہ ایک طرف سے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ظلم و تعدی پر برانگیختہ کرتا ہے اور دوسری طرف خود اس کے قلب و جگر کو طبی اعتبار سے اتنا زبردست نقصان پہنچاتا ہے اور اس کے پورے نظامِ جسم کو اس درجہ متاثر کرتا ہے کہ اگر شراب نوشی کو ''تدریجی خودکشی'' اور زہر خوری قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہو، اسی لئے شریعت اسلامی نے جن چیزوں کی ممانعت اور حرمت میں شدت برتی ہے ان میں سے ایک شراب بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے شراب پی، چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی اور جس نے چوتھی بار شراب پیا اس کو آخرت میں جہنم کی نہر سے پلایا جائے

w الذبائح فی الشریعة الاسلامية: ص ۱۲۲

گا[1] یہ بھی فرمایا کہ جس نے دنیا میں شراب پی اور پیتا رہا وہ آخرت کی شراب سے محروم رہے گا[2] آخرت کی شراب وہ پاکیزہ شراب ہوگی جس میں سرمستی ہوگی، بدمستی نہ ہوگی اور جس سے سرور ہوگا، فتور نہ ہوگا۔ ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تمام برائیوں کی جڑ اور اصل قرار دیا اور بڑے گناہوں میں بھی بڑا گناہ قرار دیا "الخمر الفواحش واکبر الکبائر"[3] اور مشاہدہ ہے کہ شراب خود ایک برائی ہے لیکن بیسیوں برائیاں ہیں جو اس سے پیدا ہوتی ہیں۔ شراب کا سب سے پہلا حملہ انسان کی زبان پر ہوتا ہے، وہ ماں باپ اور بزرگوں کی ہتک کیا معنی؟ اور بھائیوں کی عزت وتوقیر کجا، خدا کے ساتھ تمسخر اور کفریات کے تکلم سے بھی باز نہیں رہتا، پھر یہ بدمستی اور رنگ لاتی ہے اور ہاتھ پاؤں تک پہنچتی ہے، اور ظلم وزیادتی اور دوسروں پر تعدی کو اس کے لئے بازیچۂ اطفال بنا دیتی ہے پھر جب یہ بدمستی بام عروج پر پہنچتی ہے تو شراب کو شباب کی تلاش ہوتی ہے اور ایسی ہوسنا کی اور نفسانیت وجود میں آتی ہے کہ حیوانات اور بہائم کی جبین غیرت بھی عرق آلود ہو، شراب کی ادنی انگڑائی مدتوں کے مضبوط رشتہ کو پاش پاش کر دیتی ہے اور جب نشہ اترتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بیوی کو طلاق دے دی ہے ـــــ پس کتنی مطابق واقعہ ہے یہ بات اور کتنا حقیقت شناس ہے یہ فقرہ کہ شراب برائیوں کا سرچشمہ ہے اور صرف گناہ نہیں، گناہ عظیم تر ہے۔ "الخمر ام الفواحش واکبر الکبائر"

شراب کی تدریجی حرمت

اسلام سے پہلے شراب عربوں میں عام تھی اور عرب اس کے اس درجہ خوگر تھے

---

q فتح القدیر: ۹/۲

w الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیۃ: ص ۱۲۳

e حاشیہ الدسوقی علی الشرح الکبیر: ۱۰۳/۲

r یہ اس فقیر کی رائے ہے، ہندوستان کے عام اور مشاہیر علماء کی رائے اس سے مختلف ہے، اس لئے قارئین

کہ بیک دفع ان کو اس سے منع کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو تین مرتبہ میں حرام قرار دیا، پہلے مرحلہ میں محض یہ بتایا گیا کہ شراب میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے" ° « ¼ ½ ¾ ¿"[1] بعض صحابہ اتنی ہی تنبیہ کے بعد شراب سے مجتنب رہنے لگے لیکن عام خیال یہی تھا کہ ابھی شراب مکمل طور پر حرام نہیں ہوئی ہے، ایک دفعہ کچھ لوگوں نے شراب پی، پھر انہی میں سے کسی نے نماز پڑھائی اور قرآن پڑھنے میں سخت غلطی کر دی، چنانچہ حکم باری تعالیٰ ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے" v w x y z۔"[2]

اب صحابہ بطور خاص نماز کے وقت شراب سے احتیاط برتتے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خصوصیت سے شراب کی قباحتوں اور اس کے مذموم اثرات کا پاس و خیال تھا اس لئے دعا کرتے تھے کہ بار الہا! شراب کے بارے میں واضح حکم فرما دیجئے "اللھم بین لنا فی الخمر بیانا شافیا" چنانچہ اس میں شراب کی حرمت کا صریح حکم نازل ہوگیا اور اس وضاحت کے ساتھ کہ اس کو نجاست بھی قرار دیا گیا، عمل شیطانی بھی، باہمی بغض و عداوت کا باعث بھی، اللہ کے ذکر اور نماز سے روکنے کا ذریعہ بھی اور پھر آخر آخر مسلمانوں سے عہد لیا گیا کہ کیا تم اس سے باز رہو گے؟" فھل انتم منتھون؟[3]

﴿ ! " # $ % & ' ( ) * +
, - . / 0 1 2 3 4 5
6 7 8 9 : ; < = > ? @
A B C D E F ﴾[1]

D: ''اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ

دوسرے علماء وارباب افتاء سے بھی دریافت کرلیں اور صرف میری اس تحریر پر اکتفا نہ کریں۔

q ردالمحتار: ۵/۳۰۴ w اصول الفقه لابی زهره: ص ۳۴۴

اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ
رہو تا کہ تم کو فلاح ہو، شیطان تو چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ
تمہارے درمیان عداوت اور بغض پیدا کر دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے
اور نماز سے تم کو باز رکھے۔ سو اب بھی باز آؤ گے؟۔''

افسوس کہ قرآن کے اتنے موکد بیان کے باوجود محض اس بنا پر کہ قرآن میں شراب کے لئے صریحاً حرام کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے بعض اہل ہوس شراب کا جواز پیدا کرنا چاہتے ہیں حالاں کہ علاوہ قرآن کے اس طاقت ور بیان کے کثرت سے حدیثیں شراب کی حرمت پر ناطق ہیں اور اس پر امت کا اجماع ہے۔[2] لیکن اہل ایمان کے لئے یہ باعث حیرت نہیں۔ اس سے اس کے یمان میں تازگی اور یقین میں اضافہ ہو جاتا ہے کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کی تکمیل ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کا ایک طبقہ شراب کو دوسرے ناموں سے حلال کرے گا۔[3]

شراب کی حقیقت

شراب جس کو قرآن نے ''خمر'' سے تعبیر کیا ہے، کی تعریف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ہے کہ وہ انگور کے کچے رس کا نام ہے، جس میں جوش اور شدت پیدا ہو جائے اور جھاگ اٹھ جائے۔[1] شراب کی یہ خاص قسم امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہرحال حرام ہے۔ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ، نشہ پیدا ہو یا نہ ہو۔ بقیہ

---

q ترمذی عن ابن عمر، باب ماجاء فی شارب الخمر: ٨/٢

w ترمذی عن ابن عمر، باب ماجاء فی شارب الخمر: ٨/٢

e مجمع الزوائد: ٦٧/٥، باب ماجاء فی الخمر و من یشربها وفیه عبدالکریم وابو امیة وهو ضعیف

دوسری مشروبات اس وقت حرام ہوں گی جب کہ ان سے نشہ پیدا ہو جائے غرض انگوری شراب کے علاوہ دوسری مشروبات کے سلسلہ میں ایک گونہ نرمی برتی گئی ہے لیکن عام فقہاء کے نزدیک ہر نشہ آور چیز خمر اور شراب ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "**کل مسکر خمر**" ہر نشہ آور شئے شراب ہے۔[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ کھجور اور انگور سے شراب حاصل کی جاتی ہے۔[3] ایک روایت میں ہے کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی اس وقت پانچ چیزوں سے شراب لی جاتی تھی، انگور، کھجور، گیہوں، جو اور رائی۔ اسی روایت میں آگے فرمایا گیا کہ جو شئی بھی عقل کو مدہوش اور مخمور کر دے وہ "خمر" ہے "**الخمر ما خامر العقل۔**" [4]

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا انگوری شراب بہت کم بنائی جاتی تھی، زیادہ تر کھجور کی شراب ہوا کرتی تھی۔[5] اس طرح کی بہت سی روایات اور شریعت کی روح اور اس کی مصلحت سب اس پر متفق ہیں کہ رائے وہی زیادہ صحیح ہے جو عام فقہاء کی ہے کہ ہر نشہ آور شئی شراب اور خمر کے حکم میں ہے اور جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کی کثیر مقدار نشہ پیدا کر دے اس کی معمولی سی معمولی مقدار بھی حرام ہے۔[1] ہر نشہ اور مشروب خواہ مقدار کی قلت کی وجہ سے یا عادت اور خو کی وجہ سے عملاً اس سے نشہ پیدا نہ ہو، حرام ہی ہوگا، یہی رائے احناف میں امام محمد کی ہے اور فقہاء نے اسی رائے پر فتویٰ دیا ہے "**وحرمها محمد مطلقاً وبه یفتی۔**" [2]

---

q البقرہ، آیت: ۲۱۹ w نساء، آیت: ۴۳

e قرطبی: ۲۸۹/۶، مجمع الزوائد: ۵۱/۵

q مائدہ، آیت: ۹۰، ۹۱

w قرطبی: ۲۸۸/۶

شراب کے احکام

شراب کی قباحت اور شناعت کی وجہ سے شریعت نے متعدد سخت احکام اس سے متعلق کئے ہیں اور وہ یہ ہیں:

1 کوئی شخص اس کی کم مقدار پئے یا زیادہ، اس پر سزائے شرعی (۸۰ کوڑے) جاری ہوگی۔

2 مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ خود اس کا مالک بنے یا کسی اور کو مالک بنائے اور اس کی خرید وفروخت اور تجارت کرے۔

3 وہ نجاست غلیظہ ہے، اگر ایک درہم کی مقدار سے زیادہ کپڑے میں لگ جائے تو اس کے ساتھ نماز جائز نہ ہو۔

4 انگوری شراب جس کے حرام ہونے پر اتفاق ہے، اگر کوئی شخص اس کو حلال قرار دے تو اس کو کافر سمجھا جائے گا۔ البتہ دوسری نشہ آور مشروبات کے خمر کہلانے میں چوں کہ فقہاء کے درمیان اختلاف ہے اس لئے اس کے حلال سمجھنے والے کو کافر نہیں سمجھا جائے گا۔

5 مسلمانوں کے حق میں وہ ایک بے قیمت شئے ہوگی، لہٰذا اگر کوئی شخص اس کو تلف کردے تو وہ اس کی قیمت کا ضامن نہ ہوگا۔[3]

اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ اگر شراب رکھی رکھی خود سرکہ بن گئی تو وہ حلال ہے جس کا اندازہ تلخی کے بجائے ترشی پیدا ہونے سے ہوگا۔[1] لیکن اگر کسی خاص طریقہ پر اس کو سرکہ بنایا گیا جیسے نمک یا سرکہ ڈال کر تو احناف کے یہاں یہ عمل جائز ہوگا اور وہ سرکہ حلال۔ اور دوسرے فقہاء کے نزدیک اس کا سرکہ بنانا بھی جائز نہیں۔[2]

---

e لیستحلن طائفة من امتی الخمر باسم یسمونها، ابن ماجه بحواله مجمع الزوائد: ۷۵/۵ باب فی من یستحل الخمر

الکوہل ملی ہوئی ادویہ اور عطریات

اسی سے الکوہل ملی ہوئی دواؤں اور سینٹ کا حکم بھی معلوم ہو گیا الکحل کے اجزاء کچھ بھی ہوں لیکن یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ نشہ آور ہوتی ہے اور شریعت کے نزدیک ان اجزاء کی اہمیت نہیں جن سے مشروب تیار کیا گیا ہو بلکہ وہ کیفیات اور نتائج واثرات حکم کا اصل مدار ہیں جو کسی چیز کے کھانے یا پینے پر ظاہر ہوتی ہے، اس طرح الکحل شراب ہی قرار پاتا ہے اور شراب ہونے کی وجہ سے حرام بھی ہے اور ناپاک بھی، نہ اس کو پینا درست ہے اور نہ جسم کو ملنا۔ اس لئے الکحل ملی ہوئی عطریات کا استعمال جائز نہیں ہوگا اور کپڑے یا جسم کے جس حصہ پر لگ جائے اس کو دھونا اور پاک کرنا ضروری ہوگا۔ البتہ دوائیں چوں کہ ضرورت ہیں اور از راہ ضرورت شریعت نے شراب پینے کی بھی اجازت دی ہے لہٰذا الکحل ملی ہوئی ادویہ کا استعمال درست ہوگا۔

حشیش، تمباکو وغیرہ

کچھ سیال مشروب ہی پر موقوف نہیں، جامد اشیاء بھی جو نشہ آور ہو وہ بھی حرام ہیں، علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

”ویحرم اکل البنج والحشیشة والافیون لانه مفسد للعقل ویصد عن ذکر اللّٰہ وعن الصلوة[3]“

D: ”بھنگ، حشیش اور افیون کا کھانا حرام ہے کیوں کہ یہ عقل کے لئے مفسد اور اللہ کے ذکر اور نماز کے لئے رکاوٹ ہے۔“

بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ جو بھنگ اور حشیش وغیرہ کے حلال ہونے پر فتویٰ دے، علامہ ابن تیمیہ نے اس کے حلال سمجھنے والے کو کافر قرار دیا ہے، یہاں تک کہ نجم الدین زاہدی نے ایسے شخص کو مباح القتل بتایا ہے[1]

q البحر الرائق: ۳۱۸/۸ w مسلم عن ابن عمر: ۱۶۸/۲

اسی طرح تمبا کونوشی اور تمبا کوخوری بھی کراہت سے خالی نہیں، گوبعض علماء نے اس کی حرمت اور بعض نے اس کی اباحت کا فتویٰ دیا ہے، علامہ عمادی نے تمبا کونوشی کرنے والے کی امامت کومکروہ قرار دیا ہے اور مسجد میں تو اس کا استعمال مکروہ ہی ہے ـــــ تمبا کوں کی ممانعت کی وجہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وہ روایت ہے "نهى عن كل مسكر و مفتر" "مفتر" سے مراد ہر ایسی چیز ہے جو جسم کوضعف ونقصان پہنچانے والی ہے۔[2]

علماء ہند میں مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو فی نفسہٖ مباح لیکن بے احتیاطی سے بدبو پیدا ہو جانے کی صورت میں مکروہ قرار دیا ہے۔[3] مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حقہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "بہر حال اس کا پینے والا گناہ سے خالی نہیں اور اصرار گناہ پر سخت گناہ ہے۔" [4]

البتہ بھنگ، افیون وغیرہ سے نشہ آجائے تو اس پر شراب والی سزا جاری نہیں ہوگی بلکہ اس سے کم درجہ سزا دی جائے گی، جس کو فقہاء "تعزیر" کہتے ہیں۔[5] غرض تمبا کو، زردہ، سگریٹ، بیڑی اور حقہ کی عادت کراہت سے خالی نہیں۔

%

e مسلم عن ابی هریره: ۱۶۳/۲
r ابوداؤد عن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنه، باب تحریم الخمر: ۵۱۶/۲
t بخاری عن انس بن مالک، باب نزول تحریم الخمر: ۸۳۶/۲
q ترمذی عن جابر بن عبداللّٰہ: ۸/۲ w شامی: ۲۹۲/۵
e بدائع: ۱۱۳/۵، ردالمحتار: ۲۸۹/۵، بحر: ۲۱۲/۸

پانچواں باب

طب وعلاج

اسلام دین فطرت ہے اوراس نے قدم قدم پرانسانی ضروریات کا خیال کیا ہے اس نے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنے اور اللہ کی نعمتوں کو اپنے آپ پر حرام کر لینے میں نجات کا سبق نہیں دیا ہے بلکہ خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حدود اللہ پر قائم رہنے کو انسانی اور روحانی کمال بتایا ہے—— اس کی نگاہ میں انسان کا وجود اور اس کی حیات خود اس کے لئے ایک ''امانت خداوندی'' ہے۔اس کی حفاظت صرف اس لئے ضروری نہیں کہ انسانی فطرت اس کا تقاضا کرتی ہے بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس سے انحراف خدا کی ایک امانت کے ساتھ خیانت اور حق تلفی ہے۔اسی تصور کے تحت اسلام ''فن طب'' کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور علاج کو نہ صرف جائز اور درست بلکہ بعض حالات میں واجب اور ضروری قرار دیتا ہے، عالمگیری میں ہے کہ اگر دوا کو واجب سمجھ کر اور خدا کو اصل شافی یقین کر کے علاج کرایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں''الاشتغال بالتداوی لا بأس به اذا اعتقد ان الشافی ھو اللّٰہ تعالیٰ۔''[1]

علاج کے لئے جو ادویہ استعمال کی جاتی ہیں یا کی جاسکتی ہیں، وہ یہ ہیں: جمادات، نباتات، حیوانات، اجزائے انسانی —— ذیل میں اختصار کے ساتھ ہر ایک کا الگ الگ حکم لکھا جاتا ہے۔

q بدائع: ۱۱۳/۵ w بحر: ۲۱۹/۸ e در علی ھامش الرد: ۲۹۴/۵

جمادات سے علاج

جمادات سے مراد وہ تمام جامد یا مائع (بہنے والی) اشیاء ہیں جن میں نمو نہیں پایا جاتا ہے اور وہ نہ کسی نباتی یا حیواناتی مخلوق سے تعلق رکھتی ہے۔ مثلاً سونا، چاندی، لوہا، پتھر وغیرہ۔ ایسی تمام اشیاء کا از راہ علاج ہر طرح استعمال درست ہے۔ یعنی ان کے کشتوں کا کھانا، جسم کے خارجی حصہ یا اندرونی حصہ میں ان کے مصنوعی اعضاء کا استعمال وغیرہ، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عرفجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چاندی اور اس کے بعد سونے کی مصنوعی ناک استعمال کرنے کی اجازت دی تھی[1] حالانکہ ان کا یہ ناک بنانا کسی تکلیف دہ امر کی بنا پر نہیں تھا بلکہ چہرے پر پیدا ہو جانے والے ظاہری عیب کو دفع کرنے کے لئے تھا، اسی بناء پر فقہاء نے دانتوں کو چاندی، اور سونے کے تاروں سے باندھنے کی اجازت دی ہے "ویشد الاسنان بالفضة ولا یشدها بالذهب وقال محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ لا بأس به۔"[2]

نباتات سے علاج

نباتی اشیاء اور ان سے بننے والی تمام چیزیں اصلاً حلال ہیں۔ صرف دو صورتیں ہیں کہ جن میں حرمت پیدا ہوتی ہے۔ اول یہ کہ ان میں نشہ پیدا ہو جائے، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کُلّ مُسکر حرامٌ"۔ دوسرے اس وقت جب کہ وہ زہر اور نفس انسانی کے لئے قاتل اور مہلک ہو اس لئے کہ خودکشی حرام ہے۔ پس جو نباتی ادویہ نشہ آور یا زہر نہ ہوں۔ ان کے جائز ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ ایسی ادویہ کا مسئلہ ہے جو نشہ آور ہونے یا مسموم یا ناپاک ہونے کی وجہ سے

---

[1] در علی هامش الرد: ۵/۲۹۵

[2] ملاحظہ ہو، درمختار رد شامی: ۵/۲۹۵،۲۹۶

عام حالات میں حرام ہیں کہ از راہ علاج ان کا استعمال درست ہوگا یا نہیں؟

حیوانات سے علاج

حیوانات میں بعض حلال ہیں اور بعض حرام، پھر جو حلال ہیں ان کو بھی اگر شرعی طور پر ذبح نہ کیا جا سکا تو وہ بھی حرام ہیں جن کو میتہ کہا جاتا ہے۔ پھر ذبیحہ میں بھی بعض اجزاء ہیں جو بہر حال حرام ہی ہیں مثلاً خون۔ اس طرح ذبیحہ حلال جانوروں کے حلال اجزاء سے علاج تو بہر حال درست اور جائز ہوگا ہی۔ حیوانات کی تین صنفوں کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ ایک وہ جن کا کھانا حلال نہیں۔ دوسرے وہ جن کا کھانا حلال ہے لیکن وہ مردار ہیں، تیسرے وہ حیوانی اجزاء جو بہر حال حرام ہی رہتے ہیں۔

حرام اشیاء سے علاج

انسانی اجزاء سے انتفاع پر گفتگو ہم بعد کو کریں گے۔ ابھی درج ذیل سوالات پر مجھے بحث کرنی ہے:

1. نشہ آور اشیاء سے علاج درست ہے؟
2. مسموم اشیاء سے علاج درست ہے؟
3. حرام جانوروں، مردار اور حرام اجزاء حیوانی سے علاج درست ہے؟
4. ان ادویہ کے خارجی استعمال اور دوا کی صورت میں کھانے میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

اور یہ تمام سوالات اس امر کے گرد گردش کرتے ہیں کہ آیا نجس اور حرام اشیاء سے علاج درست ہے یا نہیں؟

امام ابوحنیفہ کا قول مشہور یہی ہے کہ حرام اشیاء سے علاج درست نہیں۔ ''تکرہ البان الاتان للمریض وکذلک التداوی''[1] بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے عام محرمات سے تو علاج درست قرار دیا ہے لیکن شراب اور نشہ آور اشیاء سے

e کفایت المفتی: ۱۲۲/۹، ''تمباکو کا استعمال''

علاج کرنے کو منع کیا ہے۔[1] ان حضرات کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے کہ:"ان اللّٰہ لم یجعل شفاء کم فی حرم علیکم" رائے امام طحاوی کی بھی ہے۔[2] مالکیہ، حنابلہ اور احناف میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً تمام حرام اشیاء سے علاج کی اجازت دی ہے عالمگیری میں ہے:

"یجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتة للتداوی اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد فی المباح یقوم مقامہ۔" [3]

D: ''بیمار کے لئے خون و پیشاب کا پینا اور مردار کا کھانا ازراہ علاج جائز ہے، بہ شرطیکہ کسی مسلمان طبیب نے اس میں شفایابی کی اطلاع دی ہو اور جائز چیزوں میں اس کا کوئی بدل موجود نہ ہو۔''

احناف کے ہاں فتویٰ اس بات پر معلوم ہوتا ہے کہ مسکرات کا بھی ضرورتاً استعمال درست ہے۔ چنانچہ حنفیہ نے ازراہ علاج بھنگ کی اجازت دی ہے، بزازیہ میں شراب کے استعمال کی بھی اجازت دی گئی ہے "خاف الھلاک عطشاً وعندہ خمر لہ شربہ قدر ما یدفع العطش ان علم انہ یدفعہ۔[4]"

مولانا انور شاہ کشمیری کا خیال ہے کہ شاید امام صاحب رحمہ اللہ کے اصل مذہب میں بھی کچھ تفصیل ہے اور مطلقاً حرام سے علاج کی ممانعت نہیں ہے اس لئے کہ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب سے سونے کے تاروں سے دانت باندھنے کی اجازت نقل کی ہے۔ خارش کی وجہ سے ریشمی کپڑوں کے استعمال کا جواز احناف میں معروف بات ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتیں بھی حرام ہی سے علاج کی قبیل سے ہیں۔[5]

رہ گئی وہ روایت کہ حرام میں شفاء نہیں ہے تو اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔

---

r امداد الفتاویٰ: ۹۸/۴، ترتیب مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

t در علی ھامش الرد: ۲۹۵/۵

ان میں یہ توجیہ بہت قوی ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب کہ مریض اس شئے حرام کے استعمال پر مجبور اور مضطر نہ ہو بلکہ اس کا متبادل موجود ہو۔ عینی کے الفاظ میں "والجواب القاطع ان هذا محمول على حالة الاختيار" ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی اشیاء کے لئے ''شفاء'' کے لفظ کے استعمال کو مناسب نہیں سمجھا ہو کیوں کہ ''شفاء'' کا لفظ مبارک چیزوں کی بابت بولا جاتا ہے، ناجائز چیزوں سے جو فائدہ ہوا سے ''منفعت'' کہنا چاہئے، اسی لئے قرآن پاک نے شراب اور جوئے کے بارے میں فرمایا: "اثمهما اكبر من نفعهما"[1]۔

ناپاک اشیاء سے علاج

یہی حال ناپاک اشیاء کا ہے۔ قاضی ابو یوسف نے اونٹ کا پیشاب اور خون پینے کی اجازت دی ہے اگر علاج مقصود ہو[2] فتاویٰ بزازیہ میں ہے کہ دواءً کبوتر کی بٹ کھانا جائز ہے "اكل خرء الحمام في الدواء لا باس به"[3] انگلیوں میں پت داخل کر دینا بھی امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے "اما ادخال المرارة في الاصبع للتداوي جوزه الثاني وعليه الفتوى"[4] فقہی تصریحات اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ ضرورت انسانی کی رعایت کرتے ہوئے فقہاء نے از راہ علاج حرام ونجس اشیاء کے استعمال کی اجازت دی ہے بشرطیکہ اس کا کوئی طبی متبادل موجود نہ ہو یا وہ اس متبادل کے استعمال پر کسی وجہ سے قادر نہ ہو کہ غیر مقدور فقہاء کے ہاں غیر موجود کے حکم میں ہوا کرتا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ دوسری ناپاک اشیاء کے مقابلے فقہاء نے ''خنزیر'' کے اجزاء استعمال کرنے میں زیادہ احتیاط کی راہ اختیار کی ہے اس لئے کہ خنزیر نجس العین ہے۔

عالمگیری: ۲/۲۵۹

ترمذی، ابوداؤد، نسائی عن عبدالرحمن بن عرفجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بزازیہ میں ہے:"ویکرہ معالجۃ الجراحۃ بانسان او خنزیر لانھما محرم الانتفاع[1] بہما"یہی بات عالمگیری میں کہی گئی ہے۔[2] میرا خیال ہے کہ خنزیر کے اجزاء کی ممانعت بھی اس وقت ہے جب کہ کوئی اور ذریعہ علاج موجود ہو۔ کیوں کہ خنزیر اپنی حرمت اور نجاست عین کی وجہ سے مطلقاً ناقابل انتفاع ہے لیکن امام ابوحنیفہ ہی ہیں کہ چمڑے وغیرہ کی سلائی کے لئے خنزیر کے بال کے استعمال کو جائز رکھتے ہیں۔ اور فقہاء امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس رائے کو دلیل و مصالح شرعی کے لحاظ سے ''اظہر'' قرار دیتے ہیں[3] پس صحت انسانی کی حفاظت اور نفس انسانی کی صیانت کے لئے بدرجۂ اولیٰ اجزائے خنزیر کے استعمال کی اجازت دینی ہوگی۔

پھر جن حضرات نے نجس و حرام اشیاء سے بدرجۂ ضرورت علاج کی اجازت دی ہے جہاں انسانی مصلحت اور شریعت کے عمومی قواعد و مقاصد ان کی تائید کرتے ہیں وہیں حدیث ''عرینہ'' جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے پیشاب پینے کی اجازت دی بلکہ دواءً پینے کا حکم دیا[4] ان کی رائے کو صراحۃً اور عبارۃً ثابت کرتی ہے ـــــ لہٰذا ناپاک و حرام اشیاء مسکر ہوں یا غیر مسکر، ضرورتاً ان کے ذریعہ علاج درست ہے۔

ایسی ادویہ جن میں زہریلے اجزاء ہوں اگر ان کے استعمال سے ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو اور مریض کے لئے اس کا استعمال ناگزیر ہو تو ایسی ادویہ کے استعمال میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔[5] اس لئے کہ ان ادویہ کے استعمال کی ممانعت تھی ہی اس لئے کہ وہ مہلک تھیں، اب جب کہ ان کا استعمال ہی انسانی زندگی کے تحفظ یا اس کی صحت کے بچاؤں کا ذریعہ ہے تو ضروری ہے کہ عین اسی مصلحت شرعی کی وجہ سے ان کے استعمال کو جائز رکھا جائے۔

---

w خلاصۃ الفتاوی: ۴/۳۷

q خانیہ علی الھندیہ: ص ۵۳

q کتاب الام: ۲/۱۲۳ w عمدۃ القاری: ۱/۹۲۰ e ھندیہ: ۵/۳۵۵

انسانی خون کا چڑھانا

علاج کی چوتھی صورت یہ ہے کہ انسانی اعضاء واجزاء سے علاج کیا جائے انسانی اعضاء سے علاج کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، مردہ انسان کے اجزاء سے، زندہ انسان کے اجزاء سے، پھر یہ اجزاء یا تو سیال ہوں گے یا ٹھوس شکل میں ہوں گے، سیال اجزاء سے مراد دودھ ہے جو پاک ہے، اسی طرح خون ہے جو ناپاک ہے، کتب فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ از راہ علاج مدت رضاعت ختم ہونے کے بعد بھی عورت کے دودھ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔"لا بأس بان يسعط الرجل بلبن المرأة ويشربه للدواء[1]۔"

دودھ پر قیاس کرتے ہوئے اکثر علماء نے ایک انسان کے جسم میں دوسرے انسان کا خون چڑھانے کی اجازت دی ہے، دودھ اور خون میں یہ امر قدر مشترک ہے کہ یہ دونوں انسانی جسم سے اخراج کے بعد دوبارہ بہت جلد اپنی کمی پوری کر لیتے ہیں۔

مردہ کے اعضاء سے استفادہ

رہ گئی دوسرے ٹھوس اعضاء کی پیوند کاری تو فقہی نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ مردہ کے اعضاء سے پیوند کاری کو تو ناجائز ہونا ہی چاہئے۔ اس لئے کہ شوافع، بعض احناف، فقہاء مالکیہ میں ابن عربی اور حنابلہ میں ابوالخطاب نے مضطر شخص کو مردہ کھانے کی اجازت دی ہے:"قال الشافعی وبعض الحنفية يباح وهو اولى لان حرمة الحي اعظم واختار ابوالخطاب[2] انه له اكله" بات امام قرطبی نے لکھی ہے[3] اور ابن عربی کی رائے ان الفاظ میں نقل کی ہے:

"الصحيح عندي ان لا ياكل الآدمي الا اذا تحقق ذلك ينجيه[1] ويحييه۔

زندہ انسانوں کے اعضاء کے استعمال کو عام طور پر فقہاء نے منع کیا ہے، یہ

---

۲ بزازیہ علی ھامش الھندیہ: ۳۶۶/۶ ۔ ۱ معارف السنن: ۳۷۹/۱

جزئیہ اکثر کتب فقہ میں موجود ہے کہ مکرہ (مجبور) کو کوئی شخص پیش کش کرے کہ تم مکرہ (مجبور کرنے والے) کے منشاء کے مطابق مجھے قتل کر دو، یا میرے جسم میں سے کاٹ کھاؤ تو مجبور کے لئے اس کو قتل کرنا یا اس کے کسی حصہ کو قطع کرنا جائز نہیں [2] بلکہ بعض فقہاء نے مضطر کو اس بات سے بھی منع کیا ہے کہ خود اپنے جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر کھا جائے [3] لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت اس لئے تھی کہ اس زمانہ میں جسم کے کسی حصہ کو کاٹنے اور نکالنے کا وہ محفوظ طریقہ وجود میں نہیں آیا تھا جیسا کہ آج کل ہے بلکہ اس طرح کے کاٹنے سے اس شخص کو ضرر شدید ہلاکت کا اندیشہ تھا چنانچہ مضطر اپنے جسم میں سے کوئی حصہ کاٹ کر خود کیوں نہیں کھا سکتا۔ ابن قدامہ اس پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

”لنا ان اکلہ من نفسہ ربما قتلہ فیکون قاتلاً بنفسہ ولا یتیقن حصول البقاء باکلہ۔[4]“

D: ”ہماری دلیل یہ ہے کہ اس کا اپنے جسم میں سے کھانا اس کے لئے باعث ہلاکت ہو جائے گا، پس وہ خود کشی کرنے والا قرار پائے گا اور اس کے کھانے سے زندگی کے بچنے کا یقین نہیں۔“

موجودہ زمانہ میں چوں کہ اس کے لئے محفوظ اور شائستہ طبی طریقہ وجود میں آ چکا ہے اس لئے اس صورت کو بھی جائز ہونا چاہئے۔ عام طور پر ان روایات سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے جن کے مطابق ایک عورت کو دوسرے عورت کے بال استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے، یا وہ فقہی عبارات جس میں ایک شخص کو اپنے ٹوٹے ہوئے دانت کی جگہ دوسرے انسانی دانت کے استعمال سے منع کیا گیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ آرائش کے لئے دوسروں کے بال جوڑنا ضرورت نہیں، محض زینت ہے اور انسانی دانت کا استعمال ایسی چیز نہیں کہ اس کا متبادل نہیں ہو یا اس زمانہ میں اس کا

q معارف السنن: ۱/۳۷۹ w ملاحظہ ہو رد المحتار: ۵/۲۱۶

e بزازیہ علی ہامش الھندیہ: ۶/۳۶۵ r بزازیہ علی ہامش الھندیہ:

C12

متبادل موجود نہ رہا ہو، پیوندکاری کی موجودہ صورت میں ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کا عضو شدید ضرورت اور جان کے بچاؤ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس وقت جب کہ اس کا کوئی متبادل موجود نہ ہو۔

اعضاء انسانی کی خرید وفروخت

جہاں تک اعضاء کے خرید وفروخت کی بات ہے تو شریعت نے بعض مواقع پر انسانی وجود اور انسانی اعضاء کو متقوم (قابل قیمت) مانا ہے اور یہ اس وقت ہے جب کوئی انسان ہلاک کردیا جائے یا اس کا کوئی عضو تلف کردیا جائے اس کو اصطلاح شرع میں دیت کہتے ہیں۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ آزاد انسان کے پورے وجود کی خرید و فروخت نہیں ہوسکتی، انسانی جسم کے مختلف اجزاء بال اور دودھ یہی دو چیزیں تھیں، جن سے گزشتہ زمانہ میں انتفاع کیا جاتا تھا، بال جس کا استعمال عموماً آرائش وزیبائش کے لئے کیا جاتا تھا۔

فقہاء نے اس کی خرید وفروخت کو بھی منع کیا ہے اور یہ وجہ قرار دی ہے کہ یہ انسانی حرمت وکرامت کے مغائر ہے:"وشعر الانسان والانتفاع به اى لم يجز بيعه والانتفاع به لان الادمى مكرم غير مبتذل فلا يجوز ان يكون الشىء من اجزاءه مهانا مبتذلا"[1] علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بالوں کی طرح انسانی ناخنوں کی خرید وفروخت کو بھی منع کیا ہے:"وكذا بيع كل ما انفصل عن الادمى كشعر وظفر لانه جزء الادمى ولهذا وجب دفنه"[2] لیکن دودھ کی خرید وفروخت میں فقہاء کے اندر اختلاف ہے، احناف تکریم انسانیت کا پاس کرتے ہوئے منع کرتے ہیں "لم يجز بيع لبن المرأة لانه جزء الادمى وهو بجميع اجزاءه مكرم عن الابتذال بالبيع"[1] کہ امام شافعی اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ سرخسی کا بیان ہے:

۳۴۸/۴

B

"وقال الشافعي رحمه اللّٰہ یجوز بیعه ویضمن متلفه لان هذا لبن طاهر او مشروب طاهر کلبن الانعام ولانه غذاء للعالم فیجوز بیه کسائر الا غذیة۔"[2]

: "اور امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کی بیع جائز ہے اور اس کے تلف کرنے والے پر ضمان لازم ہوگا۔ اس لئے کہ یہ پاک دودھ یا مشروب ہے جانوروں کے دودھ کی طرح اور اس لئے کہ یہ اہل دنیا کی غذا ہے۔ پس اس کا فروخت کرنا بھی تمام غذاؤں کی طرح جائز ہوگا۔"

فقہائے حنابلہ کے درمیان گو اس مسئلہ میں اختلاف ہے لیکن حنبلی دبستان فقہ کے مشہور ترجمان ابن قدامہ کے نزدیک بھی ترجیح اسی کو ہے کہ عورت کے دودھ کی خرید وفروخت جائز ہے۔[3]

لہٰذا احناف کے نزدیک بدرجۂ مجبوری صرف ایسے اعضاء کو خرید کرنا جائز ہوگا جیسا کہ فقہاء نے بوقت ضرورت رشوت دینے یا سودی قرض حاصل کرنے کی اجازت دی ہے لیکن شوافع اور حنابلہ کے نزدیک ایسے اعضاء کی خرید وفروخت دونوں درست ہوگی، اس سلسلہ میں ابن قدامہ کی یہ عبارت اور اس کا عموم قابل لحاظ ہیں کہ: "وسائر اجزاء الادمی یجوز بیعها لانه یجوز بیع العبد والامة"[4]

ابن قدامہ نے گو جسم سے تراشے گئے عضو کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا ہے مگر یہ اس لئے نہیں کہ انسانی اجزاء سے انتفاع جائز نہیں بلکہ اس لئے کہ اس وقت تک انسانی اعضاء سے انتفاع ممکن نہ ہوسکا تھا: "وحرم بیع العضو والمقطوع لانه لا نفع فیه"[1]

اب جب کہ ایسا ممکن ہو چکا ہے، ابن قدامہ کی تشریح کے مطابق ایسے اعضاء کی

---

q بزازیہ علی ہامش الھندیہ: ۳۶۵/۶ w عالمگیری: ۳۵۹/۵

e عالمگیری: ۳۹/۵ r ترمذی: ۲۱/۱، باب فی بول ما یوکل لحمہ

خرید وفروخت بھی درست قرار پائے گی۔

پس حاصل یہ ہے کہ:

1 اعضاء انسانی کی پیوند کاری کے لئے جو طبی طریقہ ایجاد ہوا ہے اس میں توہین انسانیت نہیں ہے۔

2 اس لئے یہ جائز ہے بشرطیکہ اس کا مقصود کسی مریض کا جان بچانا یا کسی اہم جسمانی منفعت کو لوٹانا ہو، جیسے بینائی۔

3 اور طبیب حاذق نے بتایا کہ اس کی وجہ سے صحت کا غالب گمان ہے۔

4 غیر مسلم کے اعضاء بھی مسلمان کے جسم میں لگائے جا سکتے ہیں۔

5 مردہ شخص کے جسم سے عضو لیا جا رہا ہو تو ضروری ہوگا کہ خود اس نے زندگی میں اجازت دی ہو، اس لئے کہ وہ جسم کا مالک ہے، نیز اس کے ورثاء کا بھی اس کے لئے راضی ہونا ضروری ہے۔

6 زندہ شخص کا عضو حاصل کیا جا رہا ہو تو ضروری ہوگا کہ خود اس نے اجازت دی ہو اور اس کی وجہ سے خود اس کو ضرر شدید نہ ہو۔

7 اعضاء کی بینکنگ بھی درست ہے، شوافع اور حنابلہ کے یہاں اعضاء کی خرید و فروخت دونوں کی گنجائش ہے اور احناف کے نزدیک بدرجۂ مجبوری خرید کر سکتے ہیں لیکن فروخت نہیں کر سکتے۔[2]

"ھذا ما عندی واللّٰہ اعلم بالصواب"

%

t دیکھئے: المغنی: ۶۰۱/۱

چھٹا باب

لباس و پوشاک

خوردونوش کے بعد سب سے بڑی انسانی ضرورت ''لباس'' ہے، جسم کی ستر پوشی انسانی فطرت میں ہے۔ رب کائنات نے جہاں انسان کو علم سے سرفراز کیا ہے، عقل و دانش سے حصہ دیا ہے، تدبیر امور کی صلاحیت دی ہے، وہیں اس کی فطرت وطبیعت میں ''حیا'' کا ایک خاص داعیہ رکھا ہے۔ یہ ''حیا'' گناہوں سے روکتی ہے، خدا کی معصیت و نافرمانی سے باز رکھتی ہے اور بے شرمی و بے حیائی کے لئے حجاب بنتی ہے، حیا کی دیوار اٹھ جائے تو پھر انسان اور حیوان کے درمیان کم امتیاز باقی رہ جاتا ہے، یہی حیا ہے کہ انسان کو جسم پوشی پر مجبور کرتی ہے۔ قرآن مجید نے حضرت آدم وحوا کے بارے میں کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے جنت سے نکالے جانے کا فیصلہ فرمایا تو مضطربانہ ان حضرات نے اپنے جسم کے قابل ستر حصے ڈھک لئے۔[1]

لباس —— تقاضۂ فطرت

اسلام سے پہلے اس باب میں بھی انسانیت سخت پستی میں تھی، بعض مذاہب نے لباس کو روحانی ترقی کے لئے رکاوٹ سمجھ لیا تھا اور نظافت و پاکیزگی ان کے نزدیک ایک خالص مادی اور دنیوی عمل تھا، خود عربوں کی شرم وحیا کا حال یہ تھا کہ کیا مرد اور کیا عورتیں سب بیت اللہ شریف کا برہنہ طواف کرتے[2] قضاء حاجت کے وقت پوشیدہ جگہ کے انتخاب کو ایک عار کی بات سمجھا جاتا۔[1]

q عالمگیری: ۵/۳۵۵ w المغنی: ۹/۳۳۵ e الجامع لاحکام القرآن:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو دوسری اخلاقی خوبیوں کے ساتھ ساتھ حیا وغیرت سے بہر وافر عطا فرمایا اور اسی نسبت سے ''لباس'' کے سلسلہ میں متوازن، فطرت سے ہم آہنگ، پاکیزہ، اور مناسب ہدایات دیں۔

تہذیب جدید کا آوارہ نفس طبقہ لباس کو ایک مصنوعی اور غیر فطری عمل قرار دیتا ہے اور برہنگی کو انسانی فطرت کہ ہر انسان اپنی ماں کی کوکھ سے بے لباس ہی پیدا ہوتا ہے لیکن اسلام ستر وحجاب اور لباس کو فطرت سلیم کی آواز قرار دیتا ہے اسی لئے قرآن کا بیان ہے کہ جب پہلے دو انسان آدم وحوا کو ان کی بعض لغزشوں کی پاداش میں جنت کی نعمتوں سے محروم کیا گیا اور لباس جنت سے انہیں عاری کر دیا گیا تو جسم کے قابل ستر حصوں کو بے ساختہ انہوں نے چھپانے کی سعی کی[2] یہ کائنات کے پہلے مرد وزن کا ایک مضطربانہ عمل تھا جو انسانی فطرت اور اس کے تقاضہ کو نمایاں کرتا ہے ـــــ غور کرو کہ اول تو خدا نے جنین رحم کو بھی بے لباس نہیں رکھا۔ قدرت نے اس کے لئے ایک خاص قسم کا غلاف ماں کے پیٹ میں رکھا۔ جو گویا اس کا لباس ہے ”فی ظلمات ثلث“[3] پھر الل کا۔ بے لباس پیدا ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اسے لباس نہیں پہننا چاہئے، انسان دنیا میں اس حال میں آتا ہے کہ اس کی آنکھیں بند ہوتی ہیں، خون اس کی غذا ہوتا ہے اور ناف کے ذریعہ اس کے جسم تک پہنچتا ہے، زبان گویائی سے محروم ہوتی ہے، قوی عقل محدود ہوتے ہیں بہت سی خواہشات ہیں کہ اس وقت وہ ان کا تصور بھی نہیں کرسکتا، پھر کیا اس کی بصارت، غذا، ناطقہ، عقل غیر محدود اور صنفی تقاضے یہ سب غیر فطری متصور ہوں گے؟

بنیادی اصول

لباس و پوشاک کے سلسلہ میں انسانی ذوق ومزاج میں خاصا فرق ہوتا ہے، سماجی حالات، مختلف علاقوں کی معاشرت اور تہذیب، موسم اور آب و ہوا کا فرق،

۲۲۹/۲

وسائل اور رسائل کی کمی بیشی، طبعی رجحانات ومیلانات میں تفاوت یہ تمام اسباب ہیں جن کی وجہ سے لباس کی پسند و ناپسند میں فرق کا پایا جانا ایک فطری بات ہے۔ایک مخصوص وقت کے لئے لباس میں یکسانیت برتی جاسکتی ہے، مگر ہمہ وقت زندگی کے لئے یکساں لباس (جس کا بعض کمیونسٹ ملکوں میں ناکام تجربہ بھی کیا گیا ہے) ایک غیر فطری عمل ہے کہ خود قدرت نے انسان کے لحم واستخواں پر پوست کا جو لباس پہنایا ہے وہ یکسانیت سے خالی اور گلہائے رنگا رنگ کا مصداق ہے، اسی لئے شریعت اسلامی میں انسان کے لئے لباس کی کوئی خاص وضع اور ساخت، کوئی خاص نوعیت اور کوئی خاص رنگت متعین نہیں کی گئی ہے اور اس کو لوگوں کے مذاق ومزاج کے سپرد کیا گیا ہے۔

ہاں البتہ اس کے ساتھ کچھ بنیادی اصول مقرر کر دیئے ہیں، کچھ خاص حدیں قائم کر دی ہیں کہ آدمی ان کے اندر رہتے ہوئے جس طرح کا بھی چاہے لباس استعمال کرے، ان میں سے پہلی ہدایت یہ ہے کہ لباس میں ستر اور جسم کو چھپانے اور ڈھکنے کا پورا پورا لحاظ رہے۔

ستر وحجاب کے احکام

ساتر لباس کی حد کیا ہے؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک نظر ستر وحجاب کے احکام پر ڈال لی جائے۔

اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ شوہر کے سامنے جسم کے کسی حصہ کا بھی ستر واجب نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ بلا ضرورت جسم کے قابل حیاء حصہ کو شوہر کے سامنے بھی کھولنا مناسب نہیں۔دوسرا درجہ محرم رشتہ داروں کا ہے، ان کے سامنے قرآن مجید نے مواضع زینت کو کھولنے کی اجازت دی ہے، مواضع زینت سے مراد سر، چہرہ، سینہ، پنڈلی، گردن، ہاتھ پاؤں، بازو اور بال ہیں[1]

B

تیسرا درجہ غیر محرم رشتہ داروں سے پردہ کا ہے، ان کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت اسماء کو دیکھنا اور فتح مکہ کے موقعہ پر حضرت ام ہانی کو دیکھنا ثابت ہے، کیوں کہ رشتہ داروں کی بکثرت آمد ورفت کی وجہ سے ان سے اجنبی کا سا پردہ مشکل ہے، عام طور پر فقہاء نے اجنبی اور غیر محرم رشتہ داروں میں کوئی فرق نہیں کیا ہے لیکن فتاویٰ بزازیہ میں ان دونوں میں فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: "والحکم بالفرق بین الاجنبی وذی الرحم اذا کان النظر لاعن شھوۃ فاما بالشھوۃ فلا یحل لاحد النظر۔"

چوتھا درجہ اجنبی لوگوں سے پردہ کا ہے۔ اس میں البتہ اختلاف ہے، عام فقہاء کے نزدیک اجنبی کے سامنے بلا ضرورت چہرہ اور ہاتھوں کا کھولنا بھی جائز نہیں، احناف کے یہاں جائز ہے۔ علامہ سرخسی اور کاسانی اور جصاص رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر تفصیل سے دلائل پیش کئے ہیں۔[3] لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ شہوت اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، اگر شہوت اور فتنہ کا اندیشہ ہو جیسا کہ فی زمانہ اس کا مشاہدہ ہے تو پھر اجنبی سے مکمل پردہ ضروری ہے، چنانچہ علامہ حصکفی کا بیان ہے:

"فان خاف الشھوۃ اوشک امتنع نظرہ الی وجھھا فحل النظر مقید بعدم الشھوۃ والا فحرام وھذا فی زمانھم اما فی زماننا نمنع من الشابۃ۔"[4]

D: "اگر شہوت کا خوف یا شک ہو تو عورت کے چہرہ کو دیکھنا ممنوع ہے، پس عورت کو دیکھنے کی حلت شہوت نہ پائے جانے کی صورت کے ساتھ مقید ہے ورنہ تو حرام ہے، یہ حکم تو ان کے زمانہ میں تھا ہمارے زمانہ

q الجامع لاحکام القرآن: ۲۲۹/۲　w بدائع الصنائع: ۱۲۲/۵

e قاضی خان علی الھندیہ: ص ۴۰۴　r المغنی: ۳۳۵/۹

q البحر الرائق: ۸/۶، نیز ملاحظہ ہو ھندیہ: ۱۱۴/۳　w رد المختار: ۲۴۹/۵

q البحر الرائق: ۸۱/۶، نیز عالمگیری: ۱۱۴/۳　w المبسوط: ۱۲۵/۱۵

میں نوجوان لڑکی کو دیکھنے سے ہم مطلقاً منع کرتے ہیں۔''

خود قرآن مجید کی جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ t u v w x ﴾[1] تو بقول حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انصاری خواتین نے ایسے سیاہ کپڑے پہن لئے کہ گویا ان کے سروں پر کوے ہوں۔[2] اس لئے کہ "جلباب" ایسے کپڑے کو کہتے ہیں جو پورے جسم کو ڈھک دے "ما غطی جمیع الجسم"

اب ان تفصیلات کی روشنی میں عورتوں کے لباس کے یہ احکام متعین ہوئے کہ جب وہ گھر سے باہر نکلیں تو ایسا کپڑا پہنیں جو پورے جسم کو ڈھک دے اور بلا ضرورت چہرہ اور ہاتھ بھی کھلا نہ رکھے، ایسے گھر میں رہیں جہاں غیر محرموں کی آمد و رفت نہ ہو تو وہاں لباس ایسا ہو کہ صرف چہرہ اور ہاتھ کھلا رہے، محرم رشتہ داروں ہی کے درمیان رہنا ہو تو ستر کے مذکورہ احکام کے مطابق لباس کے احکام میں مزید وسعت ہے، مگر ظاہر ہے کہ اگر لباس کی ایسی مستقل وضع رکھی جائے جس میں جسم کے بعض ایسے حصے کھلے ہوں جو محرم کے سامنے ہی کھولے جا سکتے ہوں تو احتیاط مشکل ہوگی مثلاً کپڑے کی وضع ہی ایسی ہو کہ بازو کھلے ہوئے ہوں تو قوی امکان ہے کہ کبھی غیر محرموں کا سامنا بھی ہو جائے اور بروقت ستر نہ ہو سکے۔ اس لئے ایسی وضع کے لباس سے پرہیز ہی کرنا چاہئے، یہ بھی واضح رہے کہ پشت اور پیٹ کا حصہ محرم کے سامنے بھی کھولنا جائز نہیں، اس لئے آج کل جس قسم کے بلاؤز مروج ہوئے ہیں وہ پردہ کی ضرورت کو پورا نہیں کرتے اور سخت معصیت و گناہ کا باعث ہیں۔

مردوں کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ قابل ستر ہے، ناف ستر میں داخل نہیں اور گھٹنا ستر میں داخل ہے۔ امام شافعی کے نزدیک گھٹنا بھی ستر میں داخل ہے، مردوں کے لباس میں اس امر کی رعایت ضروری ہے کہ یہ حصے ڈھکے ہوئے ہوں، لباس کو اتنا چست بھی نہ ہونا چاہئے جس سے قابل ستر اعضاء کی ساخت نمایاں

e المغنی: ۱۲۲/۹   r المغنی: ۱۲۲/۹

ہو جائے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ونساء کاسیات عاریات ممیلات مائلات رؤسھن کاسنمة البخت المائلة لایدخلن الجنة۔[1]“

D: ”ایسی عورتیں ہیں جو کپڑا پہننے کے باوجود ننگی ہیں دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے والی ہیں اور خود بھی مائل ہونے والی ہیں، ان کے سر اونٹ کے کوہان کی طرح جھکے ہوئے ہیں، یہ جنت میں داخل نہ ہوں گی۔“

ریشمی کپڑے

لباس کے سلسلہ میں دوسری تحدید یہ ہے کہ اسلام میں مردوں کے لئے ریشم کے استعمال کو منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سونا اور ریشم میری امت کی خواتین کے لئے حلال ہیں اور مردوں کے لئے حرام[2] ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص دنیا میں ریشمی لباس پہنے، آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں[3] اس لئے اصولی طور پر فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ مردوں کے لئے ریشمی لباس کا استعمال جائز نہیں البتہ اس کی تفصیل میں معمولی نوعیت کا اختلاف بھی ہے، اس لئے پہلے فقہاء احناف کے مسلک پر قاضی خاں، حصکفی اور شامی وغیرہ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے، پھر جن نکات میں دوسرے فقہاء کا اختلاف ہے ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے گا۔

ریشم کی تھوڑی مقدار جائز ہے، زیادہ مقدار جائز نہیں اور تھوڑی مقدار سے مراد لمبائی اور چوڑائی میں چار انگل ہے، صحیح تر قول کے مطابق ایک جگہ اتنی مقدار ریشم کا

q المغنی: ۱۷۷/۴ w تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ”جدید فقہی مسائل حصہ دوم“

q اعراف، آیت: ۲۲ w حاشیہ بخاری بحوالہ مسلم عن ہشام عن ابیہ عروة: ۲۲۰/۱

استعمال مکروہ ہوگا، اگر متفرق جگہ ریشم کا استعمال ہو لیکن کسی ایک جگہ اتنی مقدار نہ ہو تو مضائقہ نہیں۔[1] اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تین چار انگلی ریشم کی اجازت دی ہے" الا موضع اصبعين او ثلاث او اربع "[2] یہ بھی مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا جبہ بھی استعمال فرمایا ہے جس کے کنارے ریشمی کپڑے سے سلے ہوئے تھے۔[3]

اگر ریشمی کپڑا جسم کے اندرونی اور بالائی کپڑے کے درمیان ہو جس کو ''حشو'' کہا جاتا ہے تو ایسے کپڑے کا پہننا جائز ہے۔[4]

کپڑے پر ریشم کی دھاری کو بعض فقہاء نے مطلقاً جائز قرار دیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ شامی نے سرخسی سے نقل کیا ہے" لا بأس بالعلم في الثوب لانه تبع "نیز یہ بھی نقل کیا ہے کہ اس کے لئے کسی مقدار کی تعیین نہیں۔[5]

امام صاحب سے یہ بھی منقول ہے کہ ریشمی کپڑے کی حرمت اس وقت ہے جب کہ وہ جسم سے مس کر رہا ہو لیکن فتویٰ اس بات پر ہے کہ اوپر کا کپڑا اگر چہ ریشمی ہو اور استر کپڑے اور جسم کے درمیان حائل ہو پھر بھی حرام ہوگا۔[6] امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جنگ میں ریشمی کپڑے کا استعمال جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز نہیں۔[7]

جس کپڑے کا تانا ریشم نہ ہو اور بانا ریشم ہو۔ امام ابوحنیفہ کے یہاں مطلقاً اس کا استعمال جائز ہے۔[1]

امام ابوحنیفہ کے نزدیک ریشمی بستر، فرش، تکیہ اور پردے وغیرہ کا استعمال جائز ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز نہیں، غالباً

---

q ابوداؤد، باب الاستبراء من البول: ۹/۱ w طه، آیت: ۱۲۱ e الزمر، آیت: ۹

q شامی: ۲۳۵/۵، نیز احکام القرآن للجصاص: ۱۲۸/۵

صاحبین کی رائے زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حریر و دیباج کے کپڑے پہننے اور اس پر بیٹھنے دونوں سے منع فرمایا۔[2]

نابالغ بچوں کو ریشمی کپڑا پہنانا جائز نہیں اور پہنانے والا گنہگار ہوگا۔[3]

کپڑے کا رنگ

شریعت نے لوگوں کے ذوق و مزاج کی رعایت کرتے ہوئے کپڑے میں کسی خاص رنگ کی تحدید نہیں کی ہے، اس لئے فقہاء لکھتے ہیں "**ولا بأس بسائر الالوان۔**"[4]

تاہم احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سفید رنگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ پسند تھا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سفید کپڑے پہنا کرو کہ یہ تمہارے کپڑوں میں سب سے بہتر ہے اور اسی میں مردہ کو کفن دیا کرو۔[5] اسی مضمون کی روایت حضرت حسن سے بھی منقول ہے۔[6] خود حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول سفید کپڑے کا استعمال ہی معلوم ہوتا ہے۔[1] اسی لئے فقہاء نے بھی سفید لباس کو مستحب قرار دیا ہے "**ویستحب الابیض**"[2] سفید کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسندیدہ رنگ سیاہ تھا فتح مکہ کے دن جب آپ مکہ میں داخل ہوئے تو یہی سیاہ عمامہ سر مبارک پر زیب تن تھا۔[3] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام خالد بنت خالد کو بھی ایک سیاہ لباس تحفۃً عطا فرمایا تھا، اسی

---

w بزازیہ علی ھامش الھندیہ: ۱۰۵/۶، احکام القرآن: ۱۲۹/۵

e المبسوط: ۱۵۲/۱۰، بدائع: ۱۰۵/۵، احکام القرآن: ۱۲۹/۵

r درمختار: ۲۶۱/۳

q احزاب، آیت: ۵۹ w احکام القرآن للجصاص: ۲۴۵۵/۵

q مسلم شریف: ۲۰۵/۲، باب النساء کاسیات عاریات

لئے فقہاء سیاہ رنگ کے لباس کو بھی مستحب قرار دیتے ہیں۔[4] البتہ میت پر اظہار غم کے لئے سیاہ لباس کا استعمال جائز نہیں۔"ولا یجوز صبغ الثیاب الاسود او کهب تأسفاً علی المیت"[5] راقم سطور کا خیال ہے کہ ایسے شہروں میں جہاں روافض کی آبادی ہو، ماہ محرم میں سیاہ لباس کا استعمال مناسب نہیں کہ اس میں روافض سے تشبہ ہے جو اظہار افسوس کے لئے سیاہ لباس کا استعمال کرتے ہیں ——— واللہ اعلم۔

ابوداؤد نے حضرت رمثہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے جسد اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر دو سبز چادریں دیکھیں۔[6] اسی لئے فقہاء سبز لباس کے استعمال کو بھی مسنون قرار دیتے ہیں "ولبس الاخضر سنة۔"[7]

البتہ سرخ لباس کے استعمال کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ بعض روایات سے سرخ لباس کے استعمال کی ممانعت معلوم ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی روایت ایسی نہیں جو درجۂ صحت کو پہنچتی ہو۔ اس کے مقابلہ میں وہ روایات ہیں جو سرخ رنگ کے استعمال کے جواز کو بتلاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت براء بن عازب سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرخ حلہ میں ملبوس دیکھا۔[1] اسی وجہ سے شارحین نے اس مسئلہ میں فقہاء و محدثین کے آٹھ اقوال نقل کئے ہیں۔ مالکیہ، شوافع اور اکثر لوگوں

---

w ترمذی   e بخاری عن ابن عمر

q رد المحتار: ۵/۲۲۸   w مسلم   e بخاری

r رد المحتار: ۵/۲۲۸   t رد المحتار: ۵/۲۲۵

y در علی هامش الرد: ۵/۲۲۸ u قاضی خان علی الهندیه: ۳/۴۱۲

q قاضی خان علی الهندیه: ۳/۴۱۲   w بخاری

e قاضی خان علی الهندیه: ۳/۴۱۲

r در علی الرد: ۵/۲۲۸

t ابوداؤد، ترمذی وقال هذا حدیث حسن صحیح

سے اس رنگ کا جواز منقول ہے۔[2] احناف کا قول مختلف ہے، بعضوں نے مکروہ تحریمی اور بعضوں نے مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے کہ امام ابوحنیفہ بھی اس کو مباح قرار دیتے تھے اور بقول شامی کراہت اس وقت ہے جب عورتوں سے یا عجمیوں سے تشبہ مقصود ہو یا از راہ تکبر اس کا استعمال کرے۔[3] تاہم راقم سطور کو اس سلسلہ میں طبری کا قول بہت صحیح معلوم ہوتا ہے جسے ابن حجر نے نقل کیا ہے:

"الذی اراہ جواز لبس الثیاب المصبغة بکل لون الا انی الا احب لبس ما کان مشبعا بالحمرة ولا لبس الاحمر مطلقاً ظاہراً فوق الثیاب لکونہ لیس من لباس اہل المروءة فی زماننا فان مراعاة ذی الزمان من المروءة مالم یکن اثماً۔"[4]

D: "ہر رنگ میں رنگے ہوئے کپڑوں کے پہننے کے جواز کا قائل ہوں، ہاں نامکمل سرخ کپڑے کا اور نہ اوپری کپڑے میں مطلقاً سرخ رنگ کا کہ یہ ہمارے زمانہ میں اہل وقار کا لباس نہیں اور جب تک گناہ کے دائرہ میں نہ آتا ہو وقت کے اصحاب مروت لوگوں کی وضع اختیار کرنی چاہئے۔"

مردوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن رنگوں کو ممنوع قرار دیا ہے ان میں ایک معصفر کپڑا ہے۔[1] فقہاء کا عام رجحان یہی ہے کہ مردوں کے لئے "معصفر" زعفرانی اور زرد کپڑے کا استعمال ممنوع ہے۔ "وکرہ المعصفر والمزعفر الاحمر والاصفر للرجال"[5] امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول

y رواہ البزار ورجالہ ثقات باب فی البیاض، مجمع الزوائد: ۱۲۸/۵

q دیکھئے صحیح بخاری، باب ثیاب البیض کتاب اللباس مع الفتح: ۲۸۲/۲، ۲۸۳

w فصل فی اللبس، شامی: ۲۲۳/۵

ہے کہ وہ زعفرانی کپڑے تو منع کرتے تھے لیکن معصفر لباس کو جائز قرار دیتے تھے، نووی نے لکھا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول اس لئے ہے کہ لباس معصفر سے ممانعت کی حدیثیں آپ تک نہیں پہنچ پائی تھیں، اگر امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ تک یہ حدیث پہنچ گئی ہوتی تو وہ بھی اس کو ضرور منع کرتے "ولو بلغ به الشافعی قال به انشاء اللّٰہ۔"

اغیار سے تشبہ

لباس اور وضع قطع کے سلسلہ میں شریعت کا اہم قاعدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو کفار مردوں کو عورتوں اور عورتوں کو مردوں کے تشبہ سے منع کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ "من تشبه بقوم فهو منهم" جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جو دوسروں سے مشابہ ہوا وہ ہم سے نہیں، اس لئے یہود و نصاریٰ کا تشبہ اختیار نہ کرو۔[5] ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کا تشبہ اختیار کرنے والے مردوں اور مردوں کا تشبہ اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے۔[1]

ایک طرف ان روایات میں تشبہ سے منع کیا گیا ہے، دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک قوم کا دوسری قوم سے ہر چھوٹی بڑی بات میں ممتاز ہونا اور تشبہ سے مکمل طور پر مجتنب ہونا عادتاً ممکن نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ تشبہ کی ایسی حدیں

---

e ترمذی کتاب اللباس باب ماجاء فی العمامة السوداء: ۲۲۵/۴ مع تحقیق احمد محمد شاکر

r باب القمیصة السوداء مع الفتح: ۲۷۹/۱ کتاب اللباس

t عالمگیری: ۳۳۰/۵ الباب التاسع فی ما یکرہ ذلک وما لا یکرہ

y فتح الباری: ۲۷۲/۱، کتاب اللباس

u ردالمحتار: ۲۲۳/۵، باب فی اللبس

مقرر کی جائیں جن کے ذریعہ احکام متعین کئے جاسکیں کہ کن امور میں اور کس درجہ کا تشبہ ناجائز ہے؟ ـــــ ان میں ظاہر ہے کہ تشبہ کی سب سے بدترین قسم وہ ہے جو دینی اور مذہبی شعائر میں ہو، یہ بہرطور حرام ہے مثلاً ہندوؤں کی طرح قشقہ لگانا، سکھوں کی طرح ہاتھ میں بالے پہننا یا مخصوص انداز کی پگڑی باندھنا، عیسائیوں کی طرح سینے پر صلیب لٹکانا یا اس کے متبادل ٹائی کا استعمال کرنا، برہمنوں کی طرح زنار پہننا وغیرہ ـــــ اور شریعت میں اس کی دلیلیں اس کثرت سے ہیں کہ محتاج بیان نہیں، یہودیوں اور عیسائیوں کے طریقہ سے ہٹ کر نماز کے لئے اذان کی مشروعیت، ان اوقات میں نماز کی کراہت جو بت پرست اور آفتاب پرست قوموں کی عبادت کے ہیں، یوم عاشوراء میں ایک روزہ کے اضافہ کی تلقین کہ یہود سے تشبہ نہ ہو اور اس طرح کے دوسرے احکام خود اسی اصل پر مبنی ہیں کہ مذہبی شعائر اور عبادات میں وہ دوسروں سے ممتاز ہیں۔ ملا علی قاری کا خیال ہے کہ جس تشبہ سے منع کیا گیا ہے اس کا تعلق ہے ہی شعائر سے "قلت بل الشعار هو المراد بالتشبه لا غير[2]"

جہاں تک معاشرتی اور سماجی زندگی اور باہمی تعلقات کی بات ہے اس میں بھی اسلام کا منشا ہے کہ مسلمان اپنے طور وطریق سے ممتاز رہیں، مثلاً سلام میں یہودیوں اور عیسائیوں کے تشبہ سے روکا گیا ـــــ پس ایسی چیزیں کہ جن کے لئے شریعت نے خود اس کے لئے اپنے اصول وقواعد ذکر کر دیئے ہیں جیسے کھانا پینا، داڑھی مونچھ آداب ملاقات، ان امور میں اسلامی طریقے کو نظر انداز کر کے کسی خاص قوم کی وضع کو اختیار کر لینا مکروہ ہوگا۔

جہاں تک لباس کی بات ہے، لباس کے احکام میں چند خاص قیود وحدود کے

---

q بخاری، باب الثوب الاحمر کتاب اللباس

w سرخ رنگ کے بارے میں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری: ۱۰/۳۰۸، ۳۰۶

e دیکھئے شامی: ۵/۲۲۸ r فتح الباری: ۱۰/۳۰۶

ساتھ شریعت نے فراخی رکھی ہے، ان حدود میں ایک یہ بھی ہے کہ لباس ایسا نہ ہو کہ دوسری قوموں سے تشبہ نمایاں ہوں، لہٰذا جب تک کوئی لباس کسی دوسری قوم کی طرف اس طرح منسوب ہو کہ دیکھتے ہی یہ خیال ہو کہ فلاں قوم کا شخص ہے، اسی وقت تک اس میں تشبہ رہتا ہے۔ ہندوستان کے ماضی قریب کے علماء کے فتاویٰ سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے، مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''مگر تشبہ کا حکم اسی صورت میں ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اسے دیکھ کر اس شبہ میں پڑ جائے کہ یہ شخص اس قوم کا فرد ہے، مثلاً ہیٹ لگانے والے کو کرسٹان سمجھا جائے۔'' [1]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''من تشبہ بقوم فھو منھم'' یہ ہے کہ کسی قوم کی ایسی چیز میں مشابہت اختیار کی جائے جو اس قوم کے ساتھ مخصوص ہو یا اس کا خاص شعار ہو تو ایسی مشابہت ناجائز ہے۔'' [2]

اسی اصول پر مسلم خواتین کے لئے ساڑی کے استعمال کے بارے میں فرماتے ہیں:

''جہاں مسلمان عورتوں کے اپنے لباس میں ساڑی داخل ہو وہاں جائز ہے اور جہاں مسلمانوں میں ساڑی مروج نہ ہو صرف غیر مسلم عورتوں کے لباس میں داخل ہوں وہاں مکروہ ہے۔'' [1]

مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی لندن میں انگریزی لباس کے استعمال کے سلسلہ میں جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں اس باب میں یہ سمجھے ہوا ہوں کہ جس جگہ یہ لباس قوی ہے جیسے ہندوستان

---

q دیکھئے نیل الاوطار: ۳۸۹/۱ تا ۳۹۱

w در علی ھامش الرد: ۲۲۸/۵

C13

میں وہاں اس کا پہننا "من تشبّہ بقومٍ فھو منھم" میں داخل ہوتا ہے اور جہاں ملکی ہے، جس کی علامت یہ ہے کہ وہاں سب قومیں اور سب مذاہب کے لوگ ایک ہی لباس پہنتے ہیں وہاں پہننا کچھ حرج نہیں۔" 2

واقعہ ہے کہ تشبہ کے مسئلہ میں ان بزرگوں کی رائے نہایت متوازن اور شریعت کے مزاج و مذاق سے قریب ہے کہ جب تک کوئی لباس کسی خاص قوم کے ساتھ یا فاسق و بددین لوگوں کے ساتھ مخصوص ہو، تشبہ مکروہ ہوگا اور جوں جوں اس لباس میں عموم پیدا ہوتا جائے گا، کراہت کم ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ جب لباس کی کوئی وضع عام ہو جائے اور اسے دیکھ کر یہ شبہ نہ ہوتا ہو کہ یہ فلاں قوم کا آدمی ہے تو اب اس لباس کا پہننا تشبہ کی بنا پر مکروہ نہیں ہوگا —— فی زمانہ کوٹ، پینٹ، ساڑی یا اس طرح کے بعض مردانہ اور زنانہ ملبوسات اسی زمرہ میں آتے ہیں۔

اسی طرح مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے سے تشبہ سے منع کیا گیا ہے وہ بھی ایسے لباس میں ہے جن کو دیکھ کر عورتوں کے مرد یا مرد کے عورت ہونے کا گمان ہوتا ہو، اس کا اندازہ شارحین حدیث کی ان عبارتوں سے ہوتا ہے جو مرد و عورت کے باہم تشبہ کے بارے میں ہے مثلاً علامہ عینی لکھتے ہیں:

"وتشبہ الرجال بالنساء في اللباس والزینة التي تختص بالنساء مثل لبس المقانع والقلائد والمخانق والأسورة والخلاخل والقرط ونحو ذلک مما لیس للرجال لبسہ وتشبہ النساء بالرجال مثل لبس النعال الرقاق والمشي بھا في محافل الرجال ولبس الأردیة والطیالسة والعمائم ونحو ذلک مما لیس لھن استعمالہ۔"[۴]

---

e شرح مھذب: ۴/۴۵۰

۲ ابوداؤد عن ابن عمر باب في لبس الشھرة: ۲/۵۵۹ کتاب اللباس

D: ''مردوں کا عورتوں کا تشبہ اختیار کرنا یہ ہے کہ عورتوں کا لباس اور ان کے لئے مخصوص زینت و آرائش کا استعمال ہو مثلاً ہار، کنگن، پازیب آئرنگ وغیرہ کا پہننا جو مردوں کے لئے پہننا روا نہیں۔ عورتوں کے مردوں سے تشبہ سے مراد مثلاً باریک جوتے پہن کر مردوں کی محفلوں میں چلنا اور رومال و عمامہ وغیرہ کا استعمال ہے جو ان (عورتوں) کا لباس نہیں۔''

اسی طرح ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض علاقوں میں عورتوں اور مردوں کے لباس کی وضع میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے تو ایسی صورت میں ان کے لباس میں یہ تشبہ کراہت کے دائرہ میں نہیں آئے گی، حافظ ابن حجر علامہ طبری سے نقل کرتے ہیں:

"فاما ھیئة اللباس فتختلف باختلاف عادة کل بلد، فرب قوم لا یفترق زی نسائھم من رجالھم فی اللبس، لکن یمتاز النساء بالاحتجاب والاستتار۔"[2]

D: ''لباس کی وضع ہر علاقہ کے رواج کے مطابق مختلف ہوسکتی ہے، بعض اقوام میں مردوں اور خواتین کے لباس کی وضع میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، عورتیں پردہ حجاب سے ممتاز ہوتی ہیں۔''

فقہاء کی عبارتوں سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے لباس میں تشبہ کو معمولی درجہ کا تشبہ سمجھا ہے اور اگر صاحب لباس نیت کے اعتبار سے مخلص ہو تو لباس کے بارے میں لکھا ہے:"تزول الکراھة باخلاص النیة لاظھار نعمة اللّٰہ تعالیٰ۔"[1]

پس حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے لباس میں ممکن حد تک غیر مسلموں اور

t ترمذی عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده باب ماجاء فی کراھیة اشارة الید فی السلام: ۹۹/۲

فاسق و فاجر کی مخصوص وضع سے احتراز کرنا چاہئے، نیز مرد و عورت کے لباس اور ان کی وضع قطع میں بھی امتیاز باقی رہنا چاہئے، نیز اپنے زمانہ کے صالحین اور دیندار لوگوں کی وضع اپنانی چاہئے ـــــ وباللہ التوفیق۔

ٹخنہ سے نیچے کپڑے

اسلام چاہتا ہے کہ انسان کا ہر عمل بندگی اور تواضع کا مظہر ہو، تواضع سے زیادہ کوئی وصف نہیں جو خدا کے نزدیک محبوب ہو اور کبر و ترفع سے زیادہ کوئی امر خدا کو مبغوض نہیں۔ شریعت نے یہی مزاج لباس و پوشاک کے باب میں بھی برتا ہے، اسلام سے پہلے شاہان مملکت اور رؤساء و سرداران اپنے لباس زمین تک لٹکتے ہوئے رکھتے تھے اور اس کے ذریعہ اپنی بڑائی کا اظہار کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک نصف پنڈلی تک تہبند رکھنے کا تھا، جو لوگ اس سے زیادہ رکھنا چاہیں تو ٹخنوں سے اوپر رکھنے کی اجازت دی[2] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جو کپڑا ٹخنوں سے بھی نیچے ہو جائے وہ حصہ جہنم میں ہے، "ما اسفل من الکعبین من الازار ففی النار" اس لئے ایسی قمیص پاجامہ یا تہبند کا استعمال جو ٹخنوں سے نیچے چلا جائے سخت مکروہ اور شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے۔

عمدہ لباس

عمدہ لباس کے استعمال میں مضائقہ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے جسم پر معمولی لباس دیکھا تو فرمایا "اذا انعم اللّٰہ علی عبد احب ان یری اثر نعمة علیہ"[1] اللہ تعالیٰ اپنی نعمت عطا فرماتا ہے تو چاہتا ہے کہ

۹ بخاری عن ابن عباس باب المتشبھین بالنساء والمتشبھات بالرجال، کتاب اللباس: ۸۷۴/۲

بندہ پر اس کا اثر دیکھے۔ خود آپ کا عام معمول جہاں سادہ اور موٹا لباس پہننے کا تھا وہیں بعض دفعہ عمدہ لباس بھی استعمال کرتے تھے۔ ایک بار حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک کپڑا خدمت میں ہدیہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے زیب تن فرمایا، کپڑا اس قدر عمدہ تھا کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسے چھونے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سعد کے رومال جنت میں اس سے بڑھ کر ہوں گے[2] نقل کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دفعہ...... ایک ہزار اور بعض دفعہ چار سو درہم کی چادر استعمال فرمائی ہے[3] امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''سنجاب'' کے کپڑے استعمال کئے ہیں[4] بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار سو دینار کی چادر استعمال کی ہے[5] ہاں یہ ضرور ہے کہ لباس کی عمدگی اسے کبر و ترفع میں مبتلا نہ کر دے۔ اور اس لباس سے پہلے جو اس کی کیفیت تھی اس لباس کے استعمال کے بعد اس میں تغیر نہ ہو جائے۔ "لبس الثیاب الجمیلة مباح اذا کان [6] لا[illegible] اس میں بھی اعتدال رہے، نہ تقشّف و رہبانیت اور نہ اسراف و نمائش۔

سر پر رُومال

عمامہ یا سر کے اوپر کوئی رومال ڈال لینا جو چہرہ تک آ جاتا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ سیدتنا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہجرت والی روایت میں آنحضرت کی تشریف آوری کی جو کیفیت نقل کی گئی ہے وہ یہی تھی[1] حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمامہ کے اوپر رومال باندھنے کا بھی ذکر ہے "عصب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم

---

w حاشیہ ابوداؤد: ۵۵۹/۲ بحوالہ مرقاۃ
q کفایت المفتی: ۱۵۹/۹، جواب نمبر۱۹۶
w کفایت المفتی: ۱۶۰/۹ جواب نمبر۲۰۹
q کفایت المفتی: ۱۶۱/۹ جواب نمبر۲۱۱

علی رأسه حاشیة برد[2] ابن حجر نے "عصابة" اور "تقنع" کا فرق ان الفاظ میں نقل کیا ہے "فالتقنع تغطیة الرأس والعصابة شد الخرقة علی ما احاط بالعمامة"[3] اسی طرح گرمی سے بچنے کے لئے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے مبارک پر اونی یا سوتی رومال کا استعمال ثابت ہے جس کو حدیث میں "خمیصة" سے تعبیر کیا گیا ہے۔[4]

عمامہ مبارک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول مبارک عمامہ باندھنے کا تھا۔ آپ کے ایک عمامہ کا نام "سحاب" تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باندھا تھا، کبھی صرف عمامہ باندھتے، کبھی ٹوپی کے اوپر باندھتے، بعض دفعہ صرف ٹوپی پہننا بھی ثابت ہے۔[5] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء آپ نے تنہا عمامہ یا ٹوپی کے استعمال کو ناپسند فرمایا تھا اور مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان امتیاز قائم رکھنے کی غرض سے دونوں کے اجتماع کا حکم فرمایا تھا۔[6] بعد کو جب تمام عرب مسلمان ہوگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں طرح استعمال کی اجازت مرحمت فرمادی۔

عمامہ کے ساتھ بہتر یہ ہے کہ اس کا چھوڑ دونوں مونڈھوں کے درمیان پشت کے وسطی حصہ تک چھوڑ دیا جائے۔[1] اکثر روایتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اسی طرح منقول ہے۔[2] بعض روایتوں میں دائیں جانب کان کی طرف چھوڑ رکھنے کا ذکر

---

w امداد الفتاوی: ٢٦٨/٤ سوال نمبر ٣٤٥

q عینی علی البخاری: ٤١/٢٢ باب المتشبهون بالنساء الخ

w فتح الباری: ٤٠٨/١٠ باب المتشبهون بالنساء والمتشبهات بالرجال

q شامی: ٢٢٨/٥ w ترمذی، باب فی مبلغ اللباس، کتاب اللباس: ٢٤٧/٤

e بخاری، کتاب اللباس، باب ما اسفل من الکعبین فهو فی النار

q مشکوٰة، کتاب اللباس: ص ٢٧٧

بھی آیا ہے۔[3] بعض حدیثوں میں آپ کے عمامہ کے دو چھوڑ کا ذکر ہے، ایک آگے اور ایک پیچھے، "اذا اعتم ارخی عمامته بین یدیه ومن خلفه"[4] بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی اس چھوڑ کے بغیر بھی عمامہ باندھتے تھے۔[5] بعضوں نے ایک بالشت اور بعضوں نے بیٹھنے کی جگہ تاک لانبا چھوڑ رکھنے کو کہا ہے۔[6] خود حدیث میں اس چھوڑ کے چار انگلی کے مقدار ہونے کا ذکر ہے۔[7] عبداللہ بن زبیر کا معمول تھا کہ ایک بالشت یا اس سے کم اور کبھی ایک ہاتھ کے قریب چھوڑ رکھتے تھے۔[8] نووی سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو طرح کے عمامے تھے۔ بڑا جو بارہ ہاتھ کا تھا، چھوٹا جو سات ہاتھ کا تھا۔[9] مگر حقیقت یہ ہے کہ عمامہ کی کوئی خاص مقدار آپ سے صحیح اور صریح طور پر ثابت نہیں۔ سیوطی کا بیان ہے: "اما مقدار العمامة الشریفة فلم یثبت فی حدیث"[10] یہی بات الفاظ کے تھوڑے تغیر کے ساتھ علامہ جرزی نے لکھی ہے۔[0] البتہ عمامہ کے فضائل کے سلسلہ میں جو روایات نقل کی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ عمامہ کے ساتھ ایک فرض یا نفل پچیس نمازوں کے برابر ہے تو یہ موضوع ہے۔[1] یہی حال اس طرح کی دوسری روایات کا بھی ہے۔

ٹوپی

---

w بخاری باب قبول الهدیة من المشرکین: ۳۵۹/۱

e هندیه: ۳۳۳/۵ r غیاثیه: ص ۱۰۹

t هندیه: ص ۳۳۳ y غیاثیه: ص ۱۰۹

q متقنعا بخاری کتاب اللباس باب التقنع

w بخاری باب مذکور e فتح الباری: ۲۷۹/۱۰

r بخاری عن عائشه وابن عباس کتاب اللباس باب الاکیسة والخمائص

t زاد المعاد: ص۱۳۵، تحقیق شعیب ارنوط، عبدالقادر ارنوط، ط، الرساله، بیروت

y فرق ما بیننا والمشرکین العمائم علی القلانس، ترمذی وقال هذا حدیث

شریعت کا عام مزاج یہ ہے کہ سر ڈھکا رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ تر عمامہ کا استعمال فرماتے لیکن بعض اوقات صرف ٹوپی بھی زیب تن کرتے، عالمگیری میں ہے: "لا بأس بلبس القلانس وقد صح ان النبی کان یلبسھا"[2] ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے طبرانی نے دو روایتیں نقل کی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفید ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ "کان رسول اللّٰہ یلبس قلنسوۃ بیضاء"[3] ریشم کے جس طرح دوسرے کپڑے ممنوع ہیں اسی طرح ٹوپی کو بھی منع کیا گیا ہے، چاہے وہ عمامہ کے اندر کیوں نہ ہو، "وکذا تکرہ القلنسوۃ ان کانت تحت العمامۃ۔"[4]

قمیص

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص زیب تن فرمائی ہے اور قمیص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھی جس کے آستین گٹوں تک ہوتی، چنانچہ ترمذی میں ہے کہ "کان احب الثیاب الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم القمیص"[5] روایت میں ہے کہ "کان کم ید رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الی الرسغ۔"[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قمیص کی وضع ایسی ہوتی تھی جس میں گریبان سینے کے سامنے ہوتا تھا[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبہ اور قبا بھی پہنی ہے، تہبند اور چادر کا

غریب واسناہ لیس بالقائم وقال فیہ الملا علی قاری: رواہ ابوداؤد وسکت عنہ ولعل اسنادہ قائم، مرقاۃ: ۸/۲۵۰ ط: امدادیہ

q عالمگیری: ص ۳۳۰

w کتاب اللباس، باب فی سدل العمامۃ بین الکتفین، ترمذی: ۴/۲۲۵

e ویرخی لھا من جانب الایمن نحو الاذن، مجمع الزوائد: ۵/۱۲۰

r مجمع الزوائد: ۵/۱۲۰ وفیہ حجاج بن رشدین وھو ضعیف

استعمال بھی فرمایا ہے، چادر عام طور پر ۶ ہاتھ لانبی اور ۳½ ہاتھ چوڑی ہوتی اور تہبند ۴½ ہاتھ لانبی اور ۲½ ہاتھ چوڑی ہوتی۔[3]

کپڑے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اون کے بھی استعمال فرمائے ہیں، کتان کے بھی اور سوت کے بھی۔ زیادہ تر آپ اور آپ کے اصحاب کا معمول سوتی کپڑے پہننے کا تھا "وکان غالب ما یلبس ھو واصحابہ ما نسج من القطن" ابن قیم وغیرہ نے بعض صوفیاء کے خاص طور پر اونی لباس ہی کے استعمال کرنے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے، ان کا خیال ہے کہ آپ کے یہاں اس بارے میں کوئی تکلف نہیں تھا، سوت، اون، کتان جس کا کپڑا میسر آ گیا پہن لیتے۔[4]

پائجامہ

لباس جتنا زیادہ ساتر ہو، شریعت کی نظر میں اسی قدر بہتر ہے۔ اسی لئے تہ بند کا استعمال بھی جائز ہے لیکن پائجامہ کا استعمال زیادہ بہتر ہے، خود آپ نے پائجامہ خرید فرمایا ہے مالک بن عمیرہ اسدی سے مروی ہے:

"قدمت قبل مھاجرۃ رسول اللّٰہ فاشتری من سراویل فرجح لی وما کان لیشتریہ عبثا وان کان غالب لبسہ الازار" [5]

D: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے میں آیا تو آپ نے مجھ سے پائجامہ خرید کیا اور قیمت زیادہ کر کے دی، ظاہر کہ آپ کا یہ خرید کرنا بلا ضرورت تو نہ ہوگا، ہاں زیادہ استعمال ازار کا فرماتے تھے۔"

---

t دیکھئے زاد المعاد: ۵۰/۱ فصل فی ملابسہ ط: دار احیاء التراث الاسلامی

y عالمگیری: ص ۲۳۰

u مجمع الزوائد: ۱۲۰/۵ باب ماجاء فی العمامة

i تحفة الاحوذی: ۴۹/۳

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ میں ایک دن آپ کے ہمراہ بازار آیا، آپ ایک پارچہ فروش کے پاس بیٹھ گئے اور چار درہم میں پائجامہ خرید فرمایا، میں نے عرض کیا، آپ اور پائجامہ پہنتے ہیں؟ فرمایا، کیوں نہیں؟ سفر وحضر اور شب وروز پہنتا ہوں، اس لئے کہ مجھے بھی تو جسم پوشی کا حکم دیا گیا ہے۔[1] اس حدیث سے خیال ہوتا ہے کہ آپ نے پائجامہ کا استعمال بھی فرمایا ہے اس لئے ابن قیم کہتے ہیں کہ ''بظاہر آپ نے استعمال ہی کے لئے خرید کیا ہوگا اور ایک سے زیادہ روایتیں ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی پائجامہ پہنا ہے اور دوسرے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے پائجامے استعمال کیا کرتے تھے۔[2]

کپڑا پہننے کی سنتیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب جوتا پہننا ہوتا تو پہلے دائیں پاؤں میں پہنتے پھر بائیں پاؤں میں پہنتے۔[3] اور جوتا اتارنا ہوتا تو پہلے بائیں پاؤں کو اتارتے پھر دائیں پاؤں کو۔[4] اسی پر قیاس کرتے ہوئے کپڑوں میں بھی پہنتے اور اتارتے ہوئے یہی ترتیب مسنون ہوگی ــــــ کپڑا پہنتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض دعائیں بھی منقول ہیں جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو پہلے اس کا نام لیتے پھر فرماتے:

''اللھم لک الحمد، انت کسوتنیہ اسالک خیرہ وخیر ماصنع لہ واعوذبک من شرہ وشرما صنع لہ

D: ''خداوندا! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ لباس پہنایا میں آپ سے اس کے اور اس کی ساخت کے مقاصد میں سے خیر کا خواستگار اور اس

o تحفہ عن القاری: ۴۹/۳ p دیکھئے تحفۃ الاحوذی: ۴۹/۳
q تحفۃ الاحوذی: ۵۱/۳ w ھندیہ: ۳۳۰/۵
e وفیہ عبداللّٰہ بن خراش وثقہ، ابن حبان وضعفہ جمھور الائمۃ وفی روایۃ کمۃ

کے اوراس کی بناوٹ کے مقاصد کے شر سے پناہ خواہ ہوں۔''

اورکبھی یہ دعا پڑھتے:

"الحمد للّٰہ الذی کسانی ما اواری بہ عورتی واتجمل بہ فی حیاتی"

D:''خدا کی تعریف جس نے مجھے یہ لباس پہنایا کہ اس سے قابل ستر حصے ڈھک سکوں اوراپنی زندگی میں اس سے تجمل کروں۔''

اورکبھی یہ دعا پڑھتے:

"الحمد للّٰہ الذی کسانی ھذا ورزقنیہ من غیر حول منی ولا قوۃ۔" [1]

D:''خدا کی تعریف جس نے یہ پہنایااور بلاقوت ودخل عطافرمایا۔''

ان تینوں دعاؤں میں سے جوبھی پڑھ لی جائے کافی ہے۔

%

بیضاء وفیہ محمد بن حنفیہ الواسطی وھو ضعیف لیس بالقوی، مجمع

ساتواں باب

زیبائش وآرائش

خدا نے اپنی اس کائنات کو نہایت حسین وجمیل اور خوبصورت بنایا ہے سورج کی روشن کرنیں، چاند کی خنک روشنی، آسماں کی جبیں پر روشن ستاروں کی آرائش، زمین پر سرسبز پودوں کا نکھار اور نوع بہ نوع عطر بیز اور مشکبار اور خوش منظر پھولوں کی بہار، فلک بوس پہاڑیاں اور ان پر سفید وشفاف برف کے دوپٹے، سمندر کا لطف آمیز تموج اور آبشاروں کا کیف پرور اتار، غرض پوری کائنات ہے کہ قدرت کی حسن کاری اور اس کی جمال آرائی کی تصویر ہے۔

پھر خود حیوانات میں کیسے کیسے خوبصورت، خوش منظر، چہچہاتے دوڑتے ناچتے رقص کرتے اور اپنے نغموں سے محظوظ کرتے ہوئے چرند و پرند خدا کی اس دنیا میں اپنی اپنی طرف دامن دل کو کھینچتے اور نگاہ شوق کو متوجہ کرتے ہیں لیکن اس پوری کائنات کا سب سے حسین وجمیل وجود حضرت انسان کا ہے جو تمام مخلوقات میں اشرف بھی ہے، ان کا مخدوم بھی اور خدا کی اس بستی کے بسائے جانے کا اصل مقصود بھی۔

انسان اللہ کے دوسرے احسانات اور انعامات کے علاوہ خود جمالیاتی نقطۂ نظر سے اپنے سراپا پر غور کرے اور تناسب وموزونیت پر نگاہ ڈالے تو اس احسن الخالقین کا شکر ادا کئے بغیر نہ رہے۔"فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین"

اور علاوہ اس حسن خداداد کے خدا نے اپنی اس مخلوق میں زیبائش وآرائش کا جو سلیقہ اور ذوق عطا فرمایا ہے اس میں بھی اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں، دنیا میں جتنی

مخلوقات ہیں وہ ذوق سے عاری ہیں، نہ مور نے آج تک گیسو سنوارے ہیں، نہ ہرنوں نے پیچ در پیچ سینگوں پر رنگ آرائی کی ہے، نہ خوبصورت پرندوں نے کبھی اپنے جمال و کشش کا اندازہ بھی لگایا ہے، لیکن انسان ہے کہ اس نے سر کے بال سے پاؤں کے ناخن تک حسن آرائی کے ایک سے ایک طریقے دریافت کئے ہیں اور ان کو وجود بخشا ہے، اسلام نے اس مذاق فطرت پر یکسر روک تو نہیں لگائی لیکن اپنے مزاج خاص کے مطابق اس کی تہذیب کی اور اس کے لئے مناسب حدیں قائم کر دیں۔

خواتین کے لئے زیورات

خود حدیثوں سے عورتوں کے لئے زیورات کا استعمال ثابت ہے۔ حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں ہاتھ اور پاؤں میں انگوٹھیوں کے پہننے کا ذکر ہے۔[1] حضرت عائشہ کے ہار کا واقعہ مشہور ہی ہے، کان کے زیور (قرط) کا ذکر بھی حدیث میں ہے۔[2] حضرت ام سلمہ کا ہاتھوں میں کنگن کا استعمال کرنا منقول ہے۔[3] ایک صحابیہ کا پازیب (خلخال) پہننا روایت میں نقل کیا گیا ہے۔[4] خود قرآن مجید نے " g h i kj nml۔[5] کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ عورتوں کے جسم کے بعض حصوں پر آرائشی زیورات کے استعمال کی گنجائش ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس آرائش کا اظہار شوہر اور محرم رشتہ داروں کے سامنے ہو اور ایسی کھنک نہ ہو جو غیر محرموں کو اس کی طرف متوجہ کر دے۔

دراصل شریعت نے عورتوں کے لئے مناسب طور پر زیبائش و آرائش کی

الزوائد: ۱۲۱/۵

r شامی: ۲۲۵/۵

t ترمذی عن ام سلمۃ: ۲۳۷/۲ باب ماجاء فی القمیص

q ترمذی عن اسماء بنت یزید: ۲۳۸/۲ باب سابق

w بخاری کتاب اللباس باب جیب القمیص من عند الصدر وغیرہ

اجازت دی ہے، یہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے کہ خدا تعالیٰ نے مردوں میں جرأت و بہادری، طاقت وقوت، حوصلہ وہمت، تحفظ کی صلاحیت اور اقدام کی قدرت عطا فرمائی ہے نیز فہم ودانش، اور معاملہ فہمی ودور اندیشی سے حصہ وافر عطا فرمایا ہے جو اس کی شخصیت کو نکھارتا، ممتاز ونمایاں کرتا اور عورتوں کے لئے باعث کشش بناتا ہے، اسی طرح عورتوں میں ان صفات سے محرومی یا کمی کے بدلہ اس صنف کے اندر حسن و جمال، لطف ومحبت، نازک اندامی، شان محبوبیت اور جذبۂ آرائش نیز ذوق خودنمائی رکھ دی ہے جو اس کو ممتا بھری ماں، محبت کرنے والی بیوی اور ناز کرنے والی بیٹی بناتی ہے اور وہ اپنی صنفی کمزوری کے باوجود مردوں کے لئے باعث کشش اور اس کا قبلۂ مقصود قرار پاتی ہے۔ اسی کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما رأیت من ناقصات عقل ودین اذهب للب الرجل الحازم من احداکن" زیورات کے پہننے اور تزئین وآرائش کی اجازت دینے کا منشا اصل میں عورت کے اسی جذبۂ خلقی اور تقاضۂ طبعی کا اعتراف اور مرد کی عفت وپاکدامنی کی رعایت ہے!

مہندی اور پینٹ

عورتوں کے لئے چوں کہ زیبائش وآرائش کی رعایت زیادہ کی گئی ہے اس لئے وہ مہندی بھی لگا سکتی ہیں، ہاتھوں میں بھی اور پاؤں میں بھی، مردوں کے لئے گو بچہ کیوں نہ ہو مہندی کا استعمال جائز نہیں [2] ایسے پینٹ جو جسم تک پانی کے پہنچنے میں مانع ہوں، خواتین ان ایام میں لگائیں جن میں ناپاکی کی وجہ سے نماز کا حکم ان سے متعلق نہیں تو مضائقہ نہیں۔ اسی طرح عورتوں کے لئے کاجل اور سیاہ سرمہ کا استعمال درست ہے، مردوں کے لئے بہتر ہے کہ سفید سرمہ استعمال کریں اور سیاہ بھی استعمال کریں تو زینت مقصود نہ ہو، آرائش کے نقطۂ نظر سے مردوں کے لئے سیاہ سرمہ کا

e زاد المعاد: ۵۱/۱ r زاد المعاد: ۵۲/۱ فصل فی البسته الصوف والقطن والکتان

استعمال مکروہ ہے[1] عورتوں کا سیندور اور ٹکلی کا استعمال کرنا یا جنوبی ہند میں کالی پوتھ کا استعمال کرنا مکروہ ہے، یہ ہندوانہ رسم ہے اور اس میں دوسری اقوام کے ساتھ تشبہ ہے۔

انگوٹھی

زیورات کے قبیل کی جتنی چیزیں ہیں وہ سب صرف عورتوں ہی کے لئے جائز ہیں، مردوں کے لئے جائز نہیں، اس سے صرف انگوٹھی کا استثناء ہے جو خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمائی ہے، اسی لئے محدثین نے اپنی کتابوں میں اس کو مستقل عنوان بنا کر ذکر کیا ہے۔

خاتم مبارک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءً انگوٹھی نہیں پہنتے تھے، صلح حدیبیہ کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۃ العرب کے باہر دعوت اسلام کی مہم شروع کی اور مختلف سربراہان مملکت کو خطوط لکھے تو لوگوں نے عرض کیا کہ اہل روم مہر کے بغیر خطوط قبول نہیں کرتے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی، انگوٹھی بنائی اور اس پر ''محمد رسول اللہ'' کا نقش کندہ کرایا تا کہ اس سے مہر کا کام لیا جا سکے[2] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سونے کی انگوٹھی استعمال کی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھا دیکھی بہت سے صحابہ نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوالیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگوٹھی پھینک دی اور اعلانیہ فرمایا کہ میں یہ پھر نہیں پہنوں گا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین کے پاس رہا کرتی۔ یہاں تک کہ عہد

---

t فتح الباری: ۱۰/۲۷۳

q فتح الباری: ۱۰/۲۷۳ w زاد المعاد: ۱/۵۱

عثمانی میں ''بیر اریس'' میں گری اور پھر مل نہ سکی۔[1] اسی روایت سے اہل علم نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ آغاز اسلام میں مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ بعد کو ممانعت کردی گئی[2] بلکہ مردوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق سونے ہی کے استعمال سے منع فرمادیا۔[3]

خاتم مبارک کا حلقہ تو چاندی کا تھا ہی، نگینہ بھی چاندی ہی کا تھا[4] البتہ اس کی وضع اور ساخت حبشی تھی۔[5] دائیں بائیں دونوں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا ثابت ہے۔[6] انگوٹھی جس ہاتھ میں بھی ہو خنصر (چھوٹی انگلی) میں پہنے۔[7] انگشت شہادت اور درمیانی انگلی میں پہننے سے صراحۃً منع فرمایا[8] اور ابہام و بنصر میں کبھی پہننا ثابت نہیں۔[9] آپ صلی اللہ علیہ وسلم انگوٹھی کا استعمال چوں کہ از راہ ضرورت ہی فرماتے تھے اور زینت کا پہلو پیش نظر نہیں تھا اس لئے نگینہ کے حصہ کو اندر کی طرف رکھنے کا معمول تھا۔[0] انگوٹھی پر ''محمد رسول اللہ'' کا نقش تھا اور ہدایت تھی کہ اس نقش پر کوئی اور انگوٹھی نہ بنائے۔[!] کہ اس سے التباس و مغالطہ کا اندیشہ تھا، غالبًا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک سے زیادہ

---

e بخاری کتاب اللباس باب یبدا بالنعل الیمنی
r بخاری کتاب اللباس باب ینزع نعله الیسری
q زادالمعاد: ۱۹/۲
q بخاری کتاب اللباس باب الخاتم للنساء
w بخاری کتاب اللباس باب القرط للنساء
e ابوداؤد باب الکنز ما هو وزکوٰۃ الحلی: ۲۱۸/۱
r ابن ماجه: ۱۶۹/۲، باب المظاهر یجامع قبل ان یکفر عن ابن عباس
t نور، آیت: ۳۱
q بخاری: ۴۴/۱ باب مباشرۃ الحیض
w عالمگیری: ۳۵۹/۵، باب الزینة
q عالمگیری: ۳۵۹/۵، باب الزینة
w بخاری عن انس باب اتخاذ الخاتم لیختم به الشیء الخ: ۸۷۳/۲

انگوٹھیاں تھیں، بعض خالص چاندی کی اور بعض لوہے کی جس پر چاندی کا پتر چڑھایا ہوا تھا۔[1]

انگوٹھی سے متعلق احکام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ مردوں کے لئے صرف چاندی ہی کی انگوٹھی جائز ہے گو بہتر انگوٹھی کا نہ پہننا ہی ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورتاً ہی انگوٹھی استعمال فرمائی تھی، ابتدا سے انگوٹھی نہیں پہنی۔ اسی لئے بعض تابعین سے منقول ہے کہ تین ہی اشخاص انگوٹھی پہنتے ہیں، 1 سلطان 2 قاضی 3 اور بے وقوف۔[2] بے وقوف سے مراد وہ شخص ہے جو بلا ضرورت انگوٹھی کا استعمال کرے۔

فی زمانہ چونکہ انگوٹھی کے بجائے مستقل مہریں بننے لگی ہیں اس لئے امیر و قاضی اور عہدیداروں کے لئے بھی انگوٹھی کی حاجت نہیں رہی، انگوٹھی دائیں اور بائیں دونوں ہاتھ میں پہنی جاسکتی ہے۔ دوسری انگلیوں میں پہننے کو امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے البتہ عورتیں تمام ہی انگلیوں میں پہن سکتی ہیں۔[3] دائیں ہاتھ کی فضیلت کی وجہ سے اکثر علماء کی رائے ہے کہ انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہنی جائے۔[4]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیتل اور لوہے کی انگوٹھی سے منع فرمایا[5] ہاں جیسا کہ مذکور ہوا اگر لوہے کی انگوٹھی کے اوپر چاندی کا پتر چڑھا دیا جائے تو مضائقہ نہیں یہ کراہت مردوں کے لئے بھی ہے اور عورتوں کے لئے بھی۔[6] مرد انگوٹھی کا نگینہ اندر کی سمت رکھے البتہ عورتیں باہر رکھ سکتی ہیں۔[1] مرد چاندی کے علاوہ کسی اور چیز کی انگوٹھی

---

q بخاری عن ابن عمر، باب خاتم الفضۃ: ٨٧١/٢
w کتاب الاعتبار للحازمی: ٧/٢٣٠ باب اباحۃ لبس خاتم الذھب ونسخھا
e بخاری عن براء بن عازب، باب خواتیم الذھب: ٨٧١/٢
r بخاری عن انس، باب فص الخاتم: ٨٧٢/٢

نہیں پہن سکتے لیکن انگوٹھی کا نگینہ کسی پتھر یا شیشہ کا ہوتو مضائقہ نہیں۔[2] ـــــ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی میں بھی یہ شرط لگائی ہے کہ ایک مثقال سے کم ہو ”ولا تتمه مثقالا“[3] یہی رائے فقہائے احناف کی ہے۔[4] ایک مثقال کی مقدار موجودہ اوزان میں ۴ ماشہ ۴ رتی ہوتی ہے۔[5] جیسا کہ مذکور ہوا خواتین کے لئے سونے کی انگوٹھی استعمال کرنا درست ہے اور دوسرے زیورات بھی۔[6]

انگوٹھی پر موعظت خیز فقرے

صحابہ اور بعض اہل علم سے اپنی انگوٹھیوں پر خاص قسم کے عبرت خیز اور موعظت آمیز فقرے لکھنا منقول ہے، یہاں ان کا نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

حضرت ابوبکر صدیق: ”نعم القادر اللّٰہ“ (اللہ کیا ہی قادر ہے)

حضرت عمر فاروق: ”کفی بالموت واعظاً“ (موت عبرت کیلئے کافی ہے)

حضرت عثمان غنی: ”لتصبرنَّ او لتندمنَّ“ (صبر کروگے یا ندامت اٹھاؤ گے)

حضرت علی مرتضیٰ: ”الملک لِلّٰہ“ (حکومت اللہ کے لئے ہے)

امام ابوحنیفہ: ”قُل الخیر والاَّ فاسکت“ (اچھی بات کہو ورنہ چپ رہو)

امام ابو یوسف: ”من عمل برأیه فقد ندم“ (جس نے خودرائی کی اس نے ندامت اٹھائی)

امام محمد: ”من صبر ظفر“ (جس نے صبر کیا کامیاب ہوا)[1]

---

t ابوداؤد عن انس، باب ماجاء فی اتخاذ الخاتم: ۵۷۹/۲، حدیث کا یہی مفہوم ملاعلی قاری نے بتایا ہے۔

y ابوداؤد عن علی وابن عمر باب ماجاء فی التختم فی الیمین اوالیسار: ۵۸۰/۲، مرقاۃ: ۴۴۴/۴

u ابوداؤد عن بن عمرو بن عباس، باب مذکور: ۵۸۰/۲

i مسلم عن علی: ۱۹۷/۲ o مرقاۃ المفاتیح: ۴۴۵/۴

خوشبواور عطریات

خوشبو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند تھی اور بد بو اسی درجہ ناپسندیدہ۔ ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ پاکیزہ ہے اور پاکیزگی و خوشبو کو پسند کرتا ہے "انَّ اللّٰہ طَیّب یحبّ الطیب" ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان کو ہفتہ میں ایک بار ضرور ہی غسل کر لینا چاہئے اور خوشبو ہو تو اس کا بھی استعمال کرے۔ بخاری شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک نقل کیا گیا ہے کہ کوئی تحفہ میں خوشبو پیش کرتا تو واپس نہیں فرماتے۔ مسلم شریف کی ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت موجود ہے کہ خوشبودار پھول پیش کیا جائے تو واپس نہ کرے "من عرض علیہ ریحاناً فلا یرد" ابوداؤد کی ایک روایت میں مطلقاً خوشبو کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ اسے واپس نہ کیا جائے[2]

ہاں مردوں کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیز لیکن بے رنگ خوشبو اور عورت کے لئے رنگ دار لیکن کم خوشبودار عطریات کو پسند فرمایا ہے۔

بیوٹی سرجری اور کریم وغیرہ کا استعمال

حسن و جمال کی طرف رغبت اور جذبۂ خودنمائی انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔ اسلام نے اس تقاضۂ طبعی کی رعایت بھی کی ہے اور تہذیب بھی، ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفائی ستھرائی، اچھے کپڑے، پہننے بالوں کی آرائش، وضع قطع کی اصلاح اور خواتین کے لئے ریشم اور شوخ رنگ کے کپڑے نیز زیورات کو جائز رکھا ہے۔ دوسری طرف جذبۂ آرائش میں تکلف اور مبالغہ آمیز حد تک تزین کو منع بھی فرمایا

---

p بخاری باب من جعل فص الخاتم فی بطن کفہ، عن بن عمر: ۲/۸۷۳

Q بخاری عن انس، باب قول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا ینقش علی نقش خاتمہ: ۲/۸۷۳

ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوندنے، دانتوں کو مصنوعی طور پر نوکدار بنانے، دانتوں کے درمیان مصنوعی فصل پیدا کرنے، اپنے بال کے ساتھ دوسروں کے بال جوڑنے اور بھوں کے بال اکھاڑ کر باریک بنانے کو ناپسند فرمایا ہے اور اللہ کی تخلیق میں تغیر قرار دیا ہے۔

اسی لئے فقہاء بھی اس باب میں اعتدال ومیانہ روی ہی کو پسند کرتے ہیں۔ اگر کسی کو غیر فطری طریقہ پر چھٹی انگلی نکل آئے تو آپریشن کے ذریعہ اس کو کاٹ دینا جائز ہوگا[1] اس باب میں فقہاء شوہر کے مزاج کو بھی ایک گونہ اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ اگر شوہر موٹاپے کو پسند کرتا ہو تو عورت کے لئے خصوصیت سے ثرید کھانے کی اجازت دی گئی ہے[2] غور کیا جائے کہ پہلی صورت میں خلاف فطرت اضافہ کو آپریشن کے ذریعہ دور کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور دوسری صورت میں محض غذا کے ذریعہ اس کی جسمانی نشوونما میں بڑھوتری کی گئی ہے لہٰذا کریم اور پاؤڈر وغیرہ کے ذریعہ آرائش میں مضائقہ نہیں۔ اس سے تغییر خلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح مسے یا گوشت کا غیر معمولی اُبھار وغیرہ کو آپریشن کے ذریعہ دور کرلیا جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن بہ تقاضۂ طبعی چہروں پر جو جھریاں پڑ جاتی ہیں، آپریشن کے ذریعہ ان کو دور کرنا، ناک کو کھڑا کرانا وغیرہ جائز نہیں ہوگا کہ یہ تغییر خلق ہے اور نہ ان حدیثوں کی روشنی میں جو بال جوڑنے کی ممانعت کے سلسلہ میں وارد ہیں، یہ جائز نظر آتی ہیں۔

تعمیر مکان میں اعتدال

مکانات اور اس کی تعمیر میں ڈیزائن اور نقشوں کا تنوع فی زمانہ آرائش کا بڑا ذریعہ ہے بلکہ ہر زمانہ میں رہا کیا ہے، خود قرآن مجید نے قوم عاد وثمود کے ذوق تعمیر اور اس میں افراط وتعیش اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ کا ذکر کیا ہے، خدا کی زمین پر

---

q دیکھئے: ابوداؤد عن ایاس بن حارث، باب ماجاء فی خاتم الحدید: ۵۸۰/۲

آج بھی اپنے نافرمان بندوں پر عتاب اور ''بطش شدید'' کے آثار سامان عبرت ہیں ـــــــ مگر اس کے باوجود غالباً یہ ذوق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کو چھوڑ کر کبھی کم نہ ہو پایا بلکہ گزشتہ قوموں میں تعمیری تفاخر کا جذبہ فرمانرواؤں اور رؤساء وحکمرانوں میں تھا، جدید ترقیات نے اس کو اتنا عام کر دیا ہے کہ اب یہ ذوق تعیش متوسط طبقہ میں بھی نفوذ کر گیا ہے۔

اسلام نے تو تعمیر کے سلسلہ میں قانون کی سطح پر کوئی قید و بند عائد نہیں کی اور نہ کسی خاص نقشہ کی تعیین، کی سوائے اس کے کہ اس کا مکان دوسرے پڑوسیوں کے لئے ضرر کا باعث نہ بنے، لیکن اخلاقی طور پر اس میں حد سے گزرے ہوئے غلو اور افراط کو ناپسند کیا ہے۔ تعمیر مکان کی طرف زیادہ توجہ اور اس کی تزئین و آرائش میں افراط اور مقابلوں کے نتیجہ میں انسان اپنی دولت کا بڑا حصہ اس میں صرف کر دیتا ہے، یہ رقم جو اینٹ اور گاڑے، پتھر اور چونے کی صورت میں منجمد ہو جاتی ہے، ایک طرف خود اس کی دولت میں نمو اور بڑھوتری کو روک دیتی ہے۔ دوسری طرف اس سے بالواسطہ اس کی قوم کے دوسرے لوگوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے کہ اس سرمایہ کے گردش میں رہنے کی وجہ سے دوسروں کو اس سے جو نفع پہنچتا ہے وہ اس سے رک جاتا ہے اس کے علاوہ اخلاقی طور پر اکثر کم ظرف لوگوں میں اس کی وجہ سے کبر اور ترفع کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے کافی سے زیادہ تعمیر کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے۔

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے میں اور میری والدہ دیوار پر مٹی کا پلاسٹر کر رہے تھے "وانا اطين حائطاً"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا: موت کا معاملہ اس عمارت سے زیادہ قریب ہے "الامر اسرع من ذالك" روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کے مکان پر بلند گنبد دیکھا۔ آپ کو

یہ تعمیر پسند نہیں آئی، ان صاحب مکان نے سلام کیا تو از راہِ اصلاح منہ پھیر لیا، انہوں نے محسوس کر لیا اور گنبد کو ڈھا دیا، آپ نے یہ دیکھا تو خوش ہوئے اور فرمایا کہ: ہر تعمیر صاحب تعمیر کے لئے وبال ہے، سوائے اس کے جو اس کے لئے ضروری ہو۔[2]

البتہ چوں کہ مختلف لوگوں کی ضروریات الگ الگ ہو سکتی ہیں، مزاج و مذاق میں بھی تفاوت ہوتا ہے نیز ہر زمانہ اور عہد کے تعمیری انداز جداگانہ ہوتے ہیں، موسموں کا فرق بھی تعمیر کے انداز میں فرق پیدا کرتے ہیں اس لئے مکانات کے لئے کوئی خاص وضع اور حد مقرر نہیں کی جا سکتی تھی، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ حجرۂ اقدس پر بالا خانہ بھی بنائے ہوئے تھے۔[3]

مساجد کی تزیین و آرائش

ذاتی تعمیرات کے علاوہ خود مسجد کی تعمیر میں بھی غیر معمولی آرائش کو پسند نہیں کیا گیا ہے اور آپ نے ایک حد تک اس سے منع فرمایا ہے۔ ایک روایت میں آپ نے اسے قیامت کی علامت قرار دیا ہے کہ لوگ مساجد کی تزئین وسعت و خوبصورتی اور بلندی میں ایک دوسرے پر فخر کرنے لگیں۔[4] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں خود مسجد نبوی کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں، چھت کھجور کی ٹہنیوں کی اور ستون بھی کھجور کے تھے، حضرت ابوبکر وعمر کے عہد میں مسجد میں توسیع ہوئی لیکن تعمیری سامان اس کا بھی یہی رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں عمدہ منقش پتھر اور گچ کی دیواریں بنائیں، ساگوان کی چھت ڈالی اور منقش پتھروں کے ستون لگائے۔[1]

---

w شامی: ۲۳۱/۵ e مرقاۃ: ۴۴۵/۴ r مرقاۃ: ۴۴۵/۴

t ابوداؤد، عن بریدہ باب ماجاء فی خاتم الحدید: ۵۸۰/۲

y دیکھئے عون المعبود: ۲۸۲/۱۱، شامی: ۲۳۰/۵

q شامی: ۲۳۰/۵ w درمختار علی ھامش الرد: ۲۳۰/۵

e ابوداؤد عن بریدہ: ۵۸۰/۲، باب ماجاء فی خاتم الحدید

مسجد نبوی کی اس مرحلہ وار ارتقاء نے جہاں یہ بات بتائی کہ مساجد کی تعمیر میں حد سے زیادہ تکلف وتزین اور تفاخر مناسب نہیں، وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ تعمیر میں اپنے عہد اور زمانہ کے تعمیری معیار کو بھی پیش نظر رکھنا اور لوگ جس سہولت و آسانی کے عادی ہوگئے ہیں اس کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر تفاخر اور ایک دوسرے پر مادی سبقت کی نیت نہ ہو بلکہ مقصود اللہ کے گھر کو پر کشش اور جاذب بنانا ہو اور نمازیوں کو سہولت پہنچانا ہو تو خوبصورت وسیع اور بلند مسجدوں کی تعمیر میں بھی مضائقہ نہیں۔

کتا پالنا

کتا ایک موذی اور تکلیف دہ جانور ہے اور انسان کو صرف زخمی ہی نہیں کرتا ہے بلکہ اپنے زہر کے ذریعہ دماغی توازن بھی متاثر کر دیتا ہے اور انسان کو اس کی وجہ سے تکلیف دہ موت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کی پرورش اور اس سے زیادہ قربت کو پسند نہیں فرمایا ہے آپ کی ہدایات کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص کسی واقعی ضرورت کے بغیر کتا رکھے اس کے اجر میں کمی کر دی جاتی ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے دوسروں کو ایذا کا خطرہ رہتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب ارشاد ایسے مکان میں فرشتۂ رحمت کی آمد نہیں ہوتی۔[2]

کن ضروریات کی بناء پر کتا رکھا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں روایات میں مختلف صورتوں کا ذکر ملتا ہے، شکار کا کتا، کھیت کی حفاظت کے لئے، قافلہ کی حفاظت کے لئے، بکری وغیرہ کی حفاظت کے لئے۔[1] گھر کی حفاظت اور موجودہ زمانے میں جرم کی تفتیش اور مجرم کی شناخت کے لئے استعمال کئے جانے والے کتے بھی اسی حکم میں ہیں اور ان مقاصد کے لئے کتوں کے چھوٹے بچوں کی پرورش بھی کی جا سکتی ہے۔[2]

ہمارے زمانہ میں مغربی تہذیب میں کتا رکھنے اور کتا پالنے اور انسانوں سے بڑھ کر اس

۲ درمختار علی ھامش الرد: ۵/۲۳۰، شوافع کی ایک جماعت مثقال سے زیادہ کو حرام اور کچھ لوگ

کی خدمت کرنے نیز یورپ کے بعض علاقوں میں بہ مقابلہ شوہر کے کتوں کی رفاقت کو ترجیح دینے کا مذاق نہ صرف اخلاقی، مذہبی اور تمدنی وتہذیبی اعتبار سے قابل نفرت ہے بلکہ طبی اور صحت جسمانی کے لحاظ سے بھی نہایت مضر اور غیر سائنسی عمل ہے لیکن تف ہے اس تہذیب پر جس نے جنون کا نام خرد اور خرد کا نام جنوں رکھا ہوا ہے۔

ٹی، وی

ٹی وی دور جدید کی حیرت انگیز ایجادات میں سے ایک ہے، اس نے معاشرہ کی فکر وعمل پر جو غلبہ حاصل کیا ہے وہ محتاج اظہار نہیں، اہلِ علم کے درمیان ابھی یہ موضوع زیر بحث ہے کہ ٹی وی کی حیثیت تصویر کی ہے یا عکس کی اور وہ فی نفسہٖ جائز ہے یا ناجائز؟ لیکن شریعت میں کسی بھی امر کا حکم متعین کرتے ہوئے اس بات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ عملاً اس میں نقصان اور نفع کا تناسب کیا ہے۔ اور معاشرہ پر اس کا جو اثر پڑ رہا ہے وہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے مثبت ہے یا منفی؟ میرا خیال ہے کہ کم سے کم ہندوستان میں ٹی وی کا جس طریقہ پر استعمال ہو رہا ہے اور اس کے ذریعہ جس قسم کے تصورات اور معاشرہ کو فروغ مل رہا ہے وہ نہایت تکلیف دہ اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ اخلاقی اور مذہبی قدروں کے قدر دانوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے، اس لئے ٹی وی اور ویڈیو کی حیثیت سے قطع نظر اس کے استعمال اور اثرات ونتائج کو دیکھتے ہوئے یہ بہت بڑی آفت اور مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے لئے ابتلا محسوس ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ شریعت نے جس طرح شراب کو ام الخبائث قرار دیا ہے، ٹی وی اس عہد کی ام الفواحش ہے اور اس سے اجتناب مناسب ہے۔

تصویر

محض مکروہ تنزیہی قرار دیتے ہیں، مرقاۃ: ۴/۴۴۹

t جواهر الفقه: ۱/۴۲۸

تصویر اور صورت گری کی ایک صورت ''مجسمہ سازی'' ہے جس کو عام طور پر تمثال یا صنم کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسری صورت منقوش تصویر کی ہے جیسے کپڑوں، دیواروں اور کاغذ پر نقش، اس کی ترقی یافتہ صورت موجودہ عکسی تصویر (فوٹو گرافی) ہے ـــــ قرآن مجید کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی امتوں میں تصویر کی یہ دونوں ہی صورتیں جائز تھیں، چنانچہ نبی وقت سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے جنات ان کے لئے مجسمے بنایا کرتے تھے۔" ³ ´ µ ¶ ¸

¹ º « ¼ـ“ ¹

لیکن چوں کہ یہ مجسمہ سازی اور تصویر سازی مختلف اقوام میں بتدریج شرک کا باعث بنتی رہی ہیں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت شریعت کی تکمیل، عقیدۂ توحید کے قیامت تک کے لئے غلبہ و اظہار اور دین حقیقی کو ہر طرح کی تحریف و تصحیف سے محفوظ رکھنے کے لئے وجود پذیر ہوئی تھی، نے ضروری جانا کہ اس چور دروازہ کو بند کر دیا جائے تا کہ اس امت میں فتنہ در نہ آ سکے۔

تصویر کے سلسلے میں سب سے پہلے ہم کو احادیث پر نظر کرنی چاہئے ـــــ تصویر کے متعلق احادیث میں بظاہر اختلاف و تعارض محسوس ہوتا ہے۔

بے جان تصویریں

1 بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقاً تصویر حرام ہے، جاندار کی ہو یا بے جان اشیاء کی ـــــ حضرت ابوزرعہ سے مروی ہے کہ وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مدینہ کے ایک گھر گئے تو گھر کے بالائی حصہ میں ایک تصویر پر نظر پڑی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا کی طرح تخلیق کرنے لگے، وہ ایک

y ملاحظہ ھو باب الخاتم للنساء، بخاری عن ابن عباس: ۲/۸۷۳

دانہ اور ذرہ کی تخلیق کر کے ہی بتائے۔[1]

یہاں ''حبہ'' اور ''ذرہ'' کے لفظ سے اشارہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی کسی بھی مخلوق خواہ جاندار ہو یا بے جان کی تصویر بنانی جائز نہیں۔ چنانچہ ابن عباس کے مایۂ ناز شاگرد کی طرف منسوب ہے کہ وہ پھلدار درخت کی تصویر بنانے کو بھی منع فرماتے تھے۔[2]

جاندار کی تصویر

2 بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جاندار اور ذی روح کی تصویریں ممنوع ہیں، بے جان اشیاء کی تصویروں میں مضائقہ نہیں —— چنانچہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ جو تصویر بنائے گا، اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس کو عذاب دے گا جب تک کہ وہ روح نہ پھونک دے اور ظاہر ہے کہ انسان روح نہ پھونک سکے گا۔"حتى ينفخ فيه الروح وليس بنافخ ابداً۔"[3]

تاہم روایت کے لب ولہجہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر ذی روح کی تصویر بنانے اور اس کو ذریعہ معاش بنانا بھی کچھ پسندیدہ امر نہیں، چنانچہ آگے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ اگر تم اس سے باز آنے کو تیار نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ درخت اور بے روح چیزوں کی تصویر پر اکتفا کرو:"ان ابيت الا ان تصنع فعليك بهذا الشجر وكل شيء ليس فيه روح۔"[1]

اس طرح کی متعدد روایات ہیں جو مطلقاً ذی روح کی تصویر کو ناجائز قرار دیتی

---

q ردالمحتار: ۲۳۰/۵

w زادالمعاد: ۱۸۳/۳ فصل فی هديه صلى الله عليه وسلم فی حفظ الصحة فی الطيب

q هنديه w ردالمحتار: ۲۲۵/۵

ہیں۔ چنانچہ فقہاء کی ایک بڑی جماعت نے جاندار کی تصویر کو مطلقاً اور بہر صورت حرام قرار دیا ہے اس سلسلے میں امام نووی کی وضاحت خصوصیت سے قابل ذکر ہے، فرماتے ہیں:

"وقال اصحابنا وغیرھم من العلماء تصویر صورة الحیوان شدید التحریم وھو من الکبائر"[2]

D: "ہمارے اصحاب اور دوسرے اہل علم کا کہنا ہے کہ حیوان کی تصویر شدید حد تک حرام ہے اور کبائر میں سے ہے۔"

تصویریں بطریق احترام

3 بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جاندار کی تصویریں بھی اس وقت حرام ہیں جب کہ لٹکی ہوئی ہوں، بلند مقام پر ہوں اور اس طرح رکھی گئی ہوں کہ تصویر کی تعظیم کا احساس ہوتا ہو، چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ:

"کان فی بیتی ثوب فیه تصاویر فجعلته الی سھوة فی البیت فکان النبی یصلی الیه فقال یا عائشة! اخریه عنی قالت فنزعته فجعلته وسائد۔"[3]

D: "میرے گھر میں کپڑا تھا جس میں تصویریں تھیں، میں نے اسے طاق میں رکھ دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف نماز پڑھنے لگے پھر ارشاد فرمایا، اے عائشہ! اس کو مجھ سے دور کر دے، پس میں نے اس کو اتار کر تکیہ بنا دیا۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک مصور پردے کے حجرۂ اقدس میں موجودگی کی وجہ سے آنے سے انکار کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم

q ابوداؤد، باب فی البناء کتاب الادب: ۲/۷۱۰

w کل بناء وبال علی صاحبہ الا مالا بدله، ابوداؤد، باب فی البناء، کتاب

سے کہا کہ یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تصویروں کے سر کاٹ دیں یا اس کو فرش بنا دیں:

"فاما ان تقطع رؤسها او تجعل بساطاً یوطأ" چنانچہ کتب حدیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ اور اجلۂ تابعین نے مصور تکیئے استعمال کئے ہیں۔

فقہاء اور سلف صالحین کی ایک بڑی جماعت اسی کی قائل رہی ہے۔ شارح بخاری علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ رقمطراز ہیں:

"...... وخالف الآخرون هؤلاء المذكورين وهم النخعي والثوري وابوحنيفة ومالك والشافعي واحمد في رواية وقالوا اذا كانت الصور على البسط والفرش التي توطا بها الاقدام فلا باس بها واما اذا كانت على الثياب والستائر ونحوها فانها تحرم وقال ابو عمر ذكر ابن القاسم قال كان مالك يكره التماثيل في الاسرة والقباب واما البسط والوسائد والثياب فلا باس به۔"

D: "دوسرے لوگوں نے ان مذکورہ حضرات سے اختلاف کیا ہے اور وہ نخعی، ثوری، ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور ایک...... روایت کے مطابق احمد ہیں۔ ان حضرات نے کہا کہ تصویریں بستروں اور فروش پر ہوں جو پاؤں سے روندے جاتے ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ کپڑے، پردے وغیرہ پر ہوں تو حرام ہیں۔ ابوعمر ابن قاسم کے حوالہ سے امام مالک سے ناقل ہیں کہ آپ تخت اور گنبدوں پر تصویریں مکروہ سمجھتے تھے، فروش و تکیوں اور کپڑوں پر نہیں۔"

ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ، تاخرین میں جن کا پایۂ علمی محتاج اظہار نہیں،

الادب: ۲/۷۱۰

e ابوداؤد، باب في اتخاذ الغرف عن ابن سعيد المزني: ۲/۷۱۱

صاحب ہدایہ سے نقل کرتے ہیں:

"ولو كانت الصورة على وسادة ملقاة او على بساط مفروش لا يكره لانها تداس وتوطأ۔"[1]

D: "پڑے ہوئے تکیئے یا بچھے ہوئے بستر پر تصویر ہو تو مکروہ نہیں کہ اسے روندا جاتا ہے۔"

پھر آگے وضاحت کرتے ہیں کہ دراصل دو صورتوں میں تصویر کی کراہت ہے، ایک اس وقت جب اس کی تعظیم کی صورت اختیار کی جائے۔ دوسرے اس وقت جب غیر مسلموں سے تشبہ پیدا ہو جائے، جیسے نماز کے وقت سامنے کھڑی کر کے تصویر رکھنا، یا ایسی تصویریں جن کی غیر مسلم پرستش کرتے ہیں۔

"الذي يظهر من كلامهم ان العلة اما التعظيم أو التشبه

D: "ان کے کلام سے یہ بات ظاہر ہے کہ اصل علت تصویر کی تعظیم یا تشبہ ہے۔"

جو حضرات فرش وغیرہ کی تصویر کو درست کہتے ہیں ان کے پاس جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے متعدد روایات اور آثار موجود ہیں جن میں بعض نہایت واضح اور سند کے اعتبار سے بھی قوی ہیں مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ناقل ہیں کہ ان کا ایک پردہ تھا جس پر پرندہ کی تصویر تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لاتے تو اس کا سامنا ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے ہٹادو "حولي ..." جب داخل ہوتا ہوں اور نظر پڑتی ہے تو دنیا یاد آتی ہے۔[1]

اب دیکھئے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع ہی نہیں فرمایا پھر منع کیا تو دنیا یاد آنے کو علت قرار دیا، پھر صرف ہٹانے کا حکم دیا، نہ پھاڑنے کا اور نہ تصویر کو مسخ کرنے کا، بلکہ ایک اور سند میں صراحت ہے کہ آپ نے قطع

۲ ابوداؤد باب في بناء المسجد: ۶۵/۱ وحاشیہ بحوالہ ملا علی قاری: ۶۵/۱،

کرنے کا حکم نہیں فرمایا۔[2]

تاہم جو لوگ ایسی تصویروں کو بھی منع کرتے ہیں، ان کے حق میں بھی بعض صریح حدیثیں موجود ہیں مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا: میں اپنی غلطی سے بارگاہ خداوندی میں تائب ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ گدا کس لئے ہے؟ عرض کناں ہوئیں، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھیں اور اس کا تکیہ لیں۔ فرمایا: ان تصویر والوں کو قیامت کے دن عذاب ہوگا۔[3]

بے سایہ تصویریں

4 بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مجسمے حرام ہیں، وہ تصویریں جو کپڑے وغیرہ پر منقش ہوں، ممنوع نہیں ہیں۔ بسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ زید بن خالد بیمار ہوئے، ہم عیادت کے لئے گئے تو دروازہ پر ایسا پردہ پایا جس میں تصویر تھی، میں نے عبداللہ خولانی سے دریافت کیا کہ اس سے پہلے تو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تصویروں کی ممانعت کی بابت نقل کیا تھا۔ عبیداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: حضرت زید کا فقرہ نہیں سنا تھا کہ اس سے وہ تصویر مستثنیٰ ہے جو کپڑے پر نقش ہو۔" الا رقـــمـًــــا فـــــــی [4]اس مضمون کی ایک روایت حضرت سہل بن حنیف سے بھی مروی ہے:

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو بلایا کہ گدا نکال دے، حضرت سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وجہ دریافت کی، ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس میں تصویریں ہیں، سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا، وہ تصویریں ممنوع نہیں جو کپڑے پر نقش ہو۔" الا ما کان

نسائی: ۱/۱۱۲

q ابوداؤد: المباحات فی المساجد w شرح نووی علی مسلم: ۲/۲۱

q دیکھئے مسلم: ۲/۲۱، باب الامر بقتل الکلاب الخ

w مسلم: ۲/۲۰

رقـــمـــا فـــي ثوب دیواں ہاں"، مگر دل کو یہی بھاتا ہے "ولـــكـــنـــه اطيـــب لنفسي۔"[1]

اسی بنا پر سلف صالحین ہی کے زمانہ سے ایک گروہ ایسی تصویر کی حرمت کا قائل رہا ہے جو سایہ دار ہو یعنی مجسمے۔ بے سایہ تصویریں جیسے کاغذی تصویریں ان کے نزدیک جائز ہیں، عینی کا بیان ہے: "وقـــال قـــوم انـــمـــا كـــره من ذلك مالـــه ظل ومـــا لا ظـــل لـــه فليـــس بـــه بأس۔"[2] امام نووی نے بھی ایک جماعت علماء سے ایسی تصویروں کا جواز نقل کیا ہے۔[3] اور اسی بنا پر قاضی عیاض نے صرف سایہ دار تصویر یعنی مجسمہ کی حرمت پر اجماع و اتفاق نقل کیا ہے اور اس سے بھی گڑیا کو مستثنیٰ رکھا ہے:

"وقال عياض واجمعوا على منع ما كان له ظل۔"[4]

شیخ عبدالرحمٰن جزیری رحمہ اللہ تعالیٰ مالکیہ کا مسلک ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

"ثـــانيـــهـــا ان تـــكـــون مـــجـــســـمـــة سواء كـــانـــت مـــاخـــوذة من مـــادة تبـــقـــى كـــالـــخشـــب والـــحـــديـــد والـــعـــجين والـــسكـــر اولا كـــقشر البـــطـــيـــخ ...... امـــا اذا لـــم تـــكـــن مـــجـــســـمـــة كـــصـــورة الـــحـــيـــوان والانـــســـان الـــتـــي تـــرســـم عـــلـــى الـــورق والثيـــاب والـــحيـــطـــان والـــسقـــف فـــفيـــهـــا خـــلاف .... اربـــعـــهـــا ان يـــكـــون لـــهـــا ظـــل فان كـــانـــت مـــجـــســـمـــة ولـــكـــن لا ظـــل لـــهـــا بان بنيـــت فـــي الـــحـــائـــط ولم يظهر منها سوى شيء لا ظل له فانها لا تحرم

D: "تصویر کے حرام ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مجسم ہو چاہے

---

q سبا، آیت: ۱۳

q بخاری عن ابی ھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، باب عذاب المصورین یوم القیامۃ: ۲/۸۸۰

وہ باقی رہنے والا مادہ جیسے لکڑی، لوہا، گوندا ہوا آٹا اور شکر سے بنی ہو یا ناپائدار مادہ مثلاً خربوزہ کے چھلکے سے بنی ہو......اگر حیوان اور انسان کی صورت کی طرح مجسمہ نہ ہو جو کپڑے، کاغذ، دیوار اور چھت پر نقش کیا جاتا ہے تو اس میں اختلاف ہے......تصویر کے حرام ہونے کی چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ سایہ دار بھی ہو، اگر وہ مجسمہ کی شکل ہو لیکن سایہ دار نہ ہو مثلاً دیوار میں اس طرح بنائی گئی ہو کہ اس کا سایہ نہ بن پاتا ہو تو وہ حرام نہیں۔''

مشرکانہ تصویریں

اسی طرح بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ممانعت کی اصل وجہ یہ ہے کہ تصویر بتدریج آدمی کو شرک تک پہنچا دیتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب بعض ازواج مطہرات نے حبش کے گرجاؤں کی خوبصورتی اور تصویروں کا ذکر کیا تو آپ کو ناگواری ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اولئک اذا مات فیھم الرجل الصالح بنوا علی قبرہ مسجداً ثم صوروا فیہ تلک الصور، اولئک شرار خلق اللّٰہ۔"[1]

D: ''ان میں سے جب کسی نیک شخص کی موت ہوتی تھی تو اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے تھے پھر اس میں تصویریں بنا دیتے تھے۔ یہ لوگ بدترین مخلوق ہیں۔''

اسی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز میں ''صلیب'' پاتے اسے گھر میں نہیں رہنے دیتے "کان لا یترک فی بیتہ شیئا فیہ صلیب۔[1]"

چنانچہ شامی کا بیان ہے:

"والظاھر انہ یلحق بہ الصلیب وان لم یکن تمثال ذی

w بحر: ۳/۳۱، رد المحتار: ۱/۴۳۶

روح لان فیه تشبها بالنصاری۔''[2]

D: ''ظاہر یہ ہے کہ اس کا حکم صلیب کا ہوگا اگر چہ اس میں جاندار کا مجسمہ نہ ہو، کیوں کہ اس میں نصاریٰ سے مشابہت ہے۔''

اس کا تقاضا ہے کہ ذی روح ہوں یا غیر ذی روح، دیوار میں آویزاں ہوں یا نہ ہوں اور بڑی ہوں یا چھوٹی، جن تصویروں کی کسی قوم اور طبقہ میں پرستش ہوتی ہوں وہ حرام ہوں گی۔

بعض اور احکام

یہ حکم تو نمایاں تصاویر سے متعلق ہے، چھوٹی تصویریں جو بے تکلف پہچان میں نہ آتی ہوں، جائز ہیں:"ولو كانت صغيرة بحيث لا تبدو للناظر الابتأمل لا يـــك"[3] خزانۃ الروایات سے نقل کیا گیا ہے کہ پرندہ کی مقدار جو تصویر ہو وہ مکروہ ہوگی، اس سے چھوٹی تصویر مکروہ نہ ہوگی:"ان كانت مقدار طير مكروه وان كانت اصغر فلا"[4] کٹی تصویریں بھی جائز ہیں، یہی حکم ایسی تصویر کا ہے جس کا کوئی عضو محو کردیا گیا ہو کہ اس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا:"او محوة اعضو لا تعیش بدونه۔''[5]

خلاصہ یہ ہے کہ:

1 مجسمے جو سایہ دار ہوں ان کی حرمت پر اجماع ہے جیسے کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔

2 غیر ذی روح کی تصویریں جائز ہیں بہ شرطیکہ کوئی قوم اس کی پرستش نہ کرتی ہو۔

3 چھوٹی تصویریں ذی روح کی کی بھی جائز ہیں جیسے روپے اور انگوٹھی وغیرہ کی

e بخاری: ۲۹۶/۱ باب بیع التصاویر التی لیس فیها روح

q شرح مسلم: ۱۹۹/۲ w صحیح مسلم مع النووی: ۲۰۱/۲

e نسائی عن ابی هریرة، باب التصاویر: ۳۰۰/۲

C15

تصویریں۔ البتہ چھوٹی اور بڑی کی تحدید میں اختلاف ہے بعض حضرات کے نزدیک بڑی وہ ہے جو بے تکلف پہچان میں آجائے اور بعضوں کے نزدیک وہ جو پرندہ سے کم حجم کی ہو۔

4 ذی روح کی بڑی بے سایہ تصویروں کے سلسلہ میں فقہاء کے اندر اختلاف ہے۔ سلف صالحین کی ایک جماعت اور خصوصیت سے فقہاء مالکیہ کا ایک طبقہ اس کے جواز کا قائل ہے جب کہ اکثر فقہاء اس کو اصلا ناجائز کہتے ہیں۔

5 جو لوگ ذی روح کی تصویروں کو ناجائز قرار دیتے ہیں ان میں بھی بعض بہر صورت اس کو منع کرتے ہیں لیکن اکثر فقہاء کی رائے ہے کہ یہ ممانعت اس وقت ہے جب کہ اس کو بطریق احترام رکھا جائے، فرش، کپڑے اور تکیہ میں ایسی تصویر ہو تو مضائقہ نہیں۔

6 ضرورتاً مثلاً پاسپورٹ، شناختی کارڈ، بس وریلوے پاس، مجرموں کی شناخت کے لئے تصویروں کی حفاظت یا کسی بڑی قومی مصلحت کے تحت تصویر کشی جائز ہوگی کہ دشواریوں کی وجہ سے احکام شرع میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے: "المشقة تجلب التيسير"

7 جو تصویریں ناجائز ہیں ان کا کھینچنا اور کھچوانا دونوں ناجائز ہے اور ایسی تصویر کشی کا پیشہ بھی درست نہیں۔

آٹھواں باب

تفریح وادب

انسانی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ اپنی ذہنی اور فکری تکان کو دور کرنے اور طبیعت کو تازہ دم کرنے کے لئے چند ساعت فرحت وانبساط کے ساتھ گزارے، یہ ذوق جسمانی حرکات کے سانچہ میں ڈھلتا ہے تو کھیل کود اور ورزش و ریاضت کی صورت اختیار کرتا ہے اور تخیلات کا روپ دھارتا ہے تو شعروسخن، طنز ومزاح اور ادب و آرٹ سے موسوم ہوتا ہے۔

اسلام نے انسان کے اس ذوق کی تسکین کا سامان بھی فراہم کیا ہے البتہ اس بات کا خیال رکھا ہے کہ یہ ذوق لطیف اپنا سفر صحیح سمت اور صحیح رخ پر کرے۔

شعروسخن

شعرگوئی اور شعر سے دلچسپی ایک حد تک علم اور زبان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اشعار کلام کی نہایت زوداثر صنف ہے اور اس کے ذریعہ کم الفاظ میں زیادہ مؤثر ڈھنگ سے بات کہی جاسکتی ہے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شعراء نے اپنی زبردست صلاحیت کا استعمال ذہن واخلاق کی تعمیر کے لئے کم اور اپنے رکیک جذبات کے اظہار کے لئے زیادہ کیا ہے، غالباً ان ہی دونوں جہتوں کو سامنے رکھ کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں اس کی تعریف کی ہے اور کہیں اس کی مذمت۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر کی تاثیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ قریش پر

تیر سے زیادہ سخت ہے۔[1] اور شعر کے مضمون کے بارے میں فرمایا کہ بعض اوقات اس میں حکمت کی باتیں ہوتی ہیں "ان من الشعر لحکمة"[2] ایک اور روایت میں اشعار کے ذریعہ دشمن کے مقابلہ کو جہاد باللسان فرمایا گیا ہے۔[3] دوسری طرف زبان حق ترجمان نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ شعر سے پیٹ بھرنے سے بہتر پیپ سے پیٹ بھرنا ہے۔[4] قرآن نے شعراء کے بارے میں فرمایا:

﴿ .. © a »﴾ [5]

D: ''بے راہ لوگ ہی شعراء کی پیروی کرتے ہیں۔''

لیکن دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات میں کوئی تضاد نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ شعر فی نفسہٖ ایک ذریعہ اظہار ہے، اگر صحیح مقاصد کا اظہار پیش نظر ہو تو عین بہتر ہے اور غلط افکار کی نمائندگی کی جائے تو مذموم ہے۔ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ راوی ہیں کہ آپ کے سامنے شعر کا ذکر آیا تو فرمایا کہ وہ بھی ایک کلام ہے، اچھی بات کہی گئی ہو تو اچھا ہے، بری بات کہی گئی ہو تو برا ہے، "هو کلام فحسنه حسنٌ وقبيحه قبيحٌ"[6] خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان سے اشعار پڑھوائے ہیں اور دعائیں دی ہیں کہ اے اللہ روح القدس کے ذریعہ ان کی مدد فرما۔[7] ایک موقعہ پر حضرت حسان اسلام کی طرف سے مدافعت کے اشعار پڑھ رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے

q نسائی عن ابی ھریرہ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ باب التصاویر: ۳۰۱/۲

w عمدۃ القاری: ۶۰/۱۲

q رد المحتار: ۴۳۵/۱ w رد المحتار: ۴۳۶/۱

q صحیح مسلم: ۲۰۰/۲

w صحیح مسلم: ۲۰۰/۲، فلم یأمرنا رسول اللّٰہ

e بخاری باب من کرہ القعود علی الصور: ۸۱،۸۰/۲، نیز صحیح مسلم: ۲۰۱/۲

r صحیح بخاری مع الفتح: ۳۲۰/۱۰

لئے مسجد نبوی میں منبر رکھوائے[1]

اچھے اشعار کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی پڑھتے، لبید کا شعر

الا کل شیء ما خلا اللہ باطل

D: ''خدا کے سوا ہر چیز فانی ہے۔''

تو آپ کو بہت ہی پسند تھا[2] ـــــ غزوۂ خندق کے موقعہ پر جب اپنے پروانوں کے ساتھ خود چراغ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق کھودنے اور اس کی مٹی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں مصروف تھا، زبانِ مبارک پر یہ اشعار جاری تھے

واللہ لولا ما اھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا

فانزلن سکینۃ علینا وثبت الاقدام ان لاقینا

ان الاولی قد بغوا علینا اذا ارادوا فتنۃ ابینا[3]

D: ''اگر اللہ (کا کرم) نہ ہوتا تو راہ ہدایت نہ پاتے نہ صدقہ ادا کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔ اے اللہ تو ہم پر سکینت نازل فرما دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو تو ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔ لوگوں نے ہمارے ساتھ شرارت کی ہے جب انہوں نے کوئی فتنہ اٹھایا تو ہم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔''

پیغمبر اسلام اور شعر گوئی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں شعر گوئی سے شغف نہیں رکھتے تھے لیکن بعض دفعہ ایسا ہوا ہے کہ بے تکلف اور بے ساختہ آپ کی زبان پر چند مصرعے موزوں ہو گئے،

q ترمذی نے اس حدیث کے متعلق کہا ہے: ھذا حدیث حسن صحیح: ۲۰۸/۱ باب ما جاء فی الصورۃ

w عمدۃ القاری: ۶۰/۱۲ e شرح مسلم: ۱۹۹/۲۰ r عمدۃ القاری: ۶۰/۱۲

اسی غزوۂ خندق کے موقع پر جب انصار جوش میں یہ شعر پڑھتے ؎

نحن الذین بایعوا محمدا علی الجهاد ما بقینا ابداً

D: ''ہم لوگ وہ ہیں جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد پر بیعت کی ہے جب تک کہ ہم زندہ رہیں۔''

تو اپنے وفاداروں اور سرفروشوں کے اس رجزیہ شعر کا جواب ان دعائیہ کلمات میں زبان مبارک سے نکلتا ؎

اللهم لا عیش الا عیش الآخرة

فاغفر للانصار والمهاجرة[1]

D: ''اے اللہ آخرت کے سوا کوئی زندگی نہیں انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما۔''

ایک غزوہ کے موقع پر کہ آپ کی انگلی زخمی اور خوں آلود ہوگئی تھی، ارشاد ہوا ؎

هل انت الا اصبع دمیت

وفی سبیل اللّٰه ما لقیت[2]

D: ''اے انگلی! تو اللہ کے راستہ میں زخمی اور خون آلود ہوئی۔ کوئی بڑی آزمائش سے دوچار نہ ہوئی۔''

یہ اور اس طرح کے مصرعے جو کبھی اتفاقاً زبان مبارک سے جاری ہوئے ہیں، شعر گوئی کا مصداق نہیں بلکہ بے ارادہ و بے تکلف اور بے ساختہ فقرے ہیں جو موزون ہو گئے ہیں۔[3] البتہ آپ کے متعدد صحابہ حضرت علی، حضرت حسان، حضرت کعب اور حضرت عبداللہ ابن رواحہ وغیرہ بلند پایہ شعراء میں تھے اور ان کے سامنے ہمیشہ اسلام کی سربلندی ہوا کرتی تھی اسی لئے فقہاء نے بھی مباح اشعار کے پڑھنے کو جائز قرار دیا

q باب بناء المسجد علی القبر، بخاری: ۱۲۹/۱، مسلم عن عائشه رضی اللّٰه تعالیٰ عنها

q نسائی کتاب اللباس عن عائشه رضی اللّٰه تعالیٰ عنها

ہے، اشعار میں عورتوں کا اور ان کے حسن و جمال کا اس طرح ذکر جس سے سفلی جذبات غیر معتدل ہو جائیں جائز نہیں البتہ اگر مطلق عورت کے اوصاف بیان کئے جائیں، متعین زندہ عورت کے اوصاف بیان نہ کئے جائیں اور وہ جیسا کہ مذکور ہوا، نفسانی جذبات برانگیختہ کرنے والے نہ ہوں تو جائز ہے۔[1] اگر آدمی دوسرے اور بہتر ضروری کاموں کو چھوڑ کر مشق سخن میں لگا رہے تو یہ بھی مکروہ ہے۔[2] اچھے اشعار پر انعام دیا جائے تو قباحت نہیں کہ آپ نے حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی چادر عنایت فرمائی تھی، لیکن اشعار پڑھ کر اس کی اجرت طلب کرنا اور اس کو ذریعہ معاش بنالینا جائز نہیں۔[3]

ناول افسانے

شعر و سخن کی طرح ادب کی دوسری اہم صنف نثر ہے۔ نثر کبھی تو وقائع نگاری کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور کبھی مفروضہ کردار اور واقعات کے لئے جو آج کی زبان میں ناول اور افسانے کہلاتے ہیں، قدیم زمانہ میں بھی اس قسم کی کہانی نویسی کی مثالیں موجود ہیں۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ کی گلستاں اور مولانا روم کی مثنوی کہا جا سکتا ہے کہ ایسی کہانیوں کا شاہکار اور معراج کمال ہے۔

اگر یہ مفروضہ کہانیاں عبرت آموز اور نصیحت خیز ہوں، صالح مقصد کی حامل ہوں اور تعمیری ہوں تو نہ صرف جائز بلکہ بہتر ہیں ـــــ لیکن اگر ان کا مقصد سفلی جذبات کو برانگیختہ کرنا اور اباحیت اور اخلاقی انارکی پیدا کرنا ہو تو ظاہر ہے کہ سخت گناہ اور ناجائز ہیں۔ ہاں ایسی تحریریں جن کا مقصد اسلام کی حفاظت و اشاعت ہے عظیم ترین عبادت ہے اور یہی اس حدیث کا مصداق ہے کہ علماء کے قلم کی روشنائی اور شہداء

---

[1] ردالمحتار: ۴۳۵/۱ [2] هنديه: ۱۰۷/۱ [3] ردالمحتار: ۴۳۷/۱

[4] درمختار على الرد: ۴۳۷/۱

[5] مسلم عن عائشه مشكوة بحواله مسلم: ۴۰۹/۲

کا خون دونوں قیامت میں ہم وزن ہوں گے۔

تقریر وخطابت کے آداب

تقریر وخطابت کو اسلام میں دعوت دین اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی مقصد کے تحت جمعہ وعیدین اور بعض دوسرے مواقع پر خطبات رکھے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی نبوت کا اعلان بھی ایک مؤثر اور مدلل وخطاب ہی کے ذریعہ فرمایا۔ خطاب میں موثر لب ولہجہ اور اسلوب کا اختیار کرنا کہ لوگوں پر اس کا اثر ہو، بری بات نہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبات عربیت کے لحاظ سے نہایت بلیغ، سادگی کے باوجود نہایت مؤثر، جامع اور پر معنی ہوا کرتے تھے۔ غزوۂ حنین کے بعد حجۃ الوداع کے موقعہ سے اور اسی طرح بعض دوسرے موقعوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبات ارشاد فرمائے ہیں وہ اتنے پر تاثیر ہیں کہ آج بھی ان کو پڑھ کر آنکھیں نم ہوتی ہیں ـــــ البتہ اس میں تکلف اور تصنع کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا، ارشاد ہوا: "ھلک المتنطعون" شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ "متنطعون سے مراد وہ لوگ ہیں" جو فصاحت و بلاغت میں تکلف کرتے ہیں اور از راہ تصنع انتہائے حلق سے آواز نکالتے ہیں۔[1] ایک اور روایت میں ہے کہ تم میں سب سے زیادہ مبغوض اور قیامت کے دن مجھ سے دور وہ لوگ ہوں گے جو بد خلق، بہت گفتگو کرنے والے "ثرثارون" غیر محتاط اور تضحیک آمیز باتیں کرنے والے "متشدقون" اور اکڑ کر باتیں کہنے والے "متفیھقون" ہوں گے۔[2]

تقریر میں رنگ آمیزی کے لئے جھوٹے واقعات اور موضوع اور غیر مستند روایات کا نقل کرنا عظیم ترین کبیرہ گناہوں میں سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

[1] بخاری عن ابی بن کعب: ۹۰۸/۲، باب مایجوز من الشعر

[2] مشکوٰۃ عن کعب بن مالک، الفصل الثانی باب البیان بالشعر: ص ۴۱۰

فرمایا کہ جس نے جانتے بوجھتے مجھ پر جھوٹ کہا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ بلکہ جب تک کسی مستند کتاب، صاحب نظر عالم سے تحقیق نہ ہو جائے ہر سنی اور دیکھی ہوئی روایت کا نقل کرنا جائز نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی آدمی کے جھوٹے ہونے کے لئے کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی روایت کو نقل کر دے "کفى بالمرء كذباً ان يحدث بكل ما سمع[1] صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس بارے میں اس درجہ محتاط تھے کہ وہ آپ کی طرف منسوب کر کے کسی روایت کو بیان کرتے تو مارے خوف کے پسینہ آ جاتا اور از راہ احتیاط اخیر میں یہ بھی فرماتے تھے کہ "او كما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم" ہمارے زمانے کے غیر محتاط اور واعظین اور رلانے ہنسانے کے خوگر مقررین محض اپنی تقریر میں رنگ و آہنگ پیدا کرنے کے لئے نہایت بے احتیاطی سے صحیح وغیر صحیح روایات کا استعمال کرتے ہیں۔ "والى الله المشتكى"

بعض لوگ اپنی خداداد صلاحیت کا فائدہ اٹھا کر وعظ فروشی شروع کر دیتے ہیں اور اپنی تقریروں کی قیمت متعین رکھتے ہیں بلکہ سامان خرید و فروخت کی طرح بھاؤ تاؤ سے بھی باز نہیں آتے۔ یہ ایک قبیح عادت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قرب قیامت کی علامت قرار دیا کہ لوگ اپنی زبان کو معاش کا ذریعہ بنا لیں۔[2]

ہاں اگر کسی شخص نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مقصد بنا لیا ہے اور وہ کسی دینی ادارے یا اسلامی حکومت کی طرف سے اس کام پر مامور ہے تو اس کے لئے اس کی تنخواہ لینی جائز ہے، اسی طرح مسلمانوں کے مطالبہ پر جو لوگ دور دراز کا سفر کریں ان کا کرایہ کی رقم لینا یا لوگوں کا بطور خود کسی مطالبہ کے بغیر تعاون کرنا اور اس تعاون کو قبول کرنا یہ سب جائز ہوگا۔

---

r مسلم عن سعد، كتاب الشعر: ۲/۲۴۰

t الشعراء، آیت: ۲۲۴

مزاح وظرافت

ادب کی ایک صفت مزاح وظرافت ہے، بات یہ ہے کہ انسان دنیا میں مسائل کے درمیان گھرا رہتا ہے، فطرت تقاضا کرتی ہے کہ انسان کبھی ساعت دو ساعت ذہن کو اس بوجھ سے آزاد کرے۔ اسی لئے رب کائنات نے نیند کا نظام رکھا جو بیداری کی تکان کو اتارتی ہے، انسانی ذہن و دماغ کے ساتھ بھول اور نسیان کا رشتہ بھی جوڑ دیا کہ اس سے غم غلط ہوتا ہے اور دماغی الجھنیں کم ہوتی ہیں۔ اسی مقصد کے لئے انسان مزاح اور ظرافت کا سہارا لیتا ہے، اس سے باہمی محبت اور الفت بھی بڑھتی ہے، مساوات و برابری کا اظہار ہوتا ہے اور دوسروں کو ایک لمحہ خوش ہونے کا موقعہ میسر آتا ہے، پس شریعت نے بھی مزاح کو جائز رکھا ہے۔ خود انسان کامل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مزاح فرمایا کرتے تھے۔

حدیث کی کتابوں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ ایک شخص نے جناب قدسی صلی اللہ علیہ وسلم میں سواری کی درخواست کی، فرمایا کہ میں اونٹنی کا بچہ دے سکتا ہوں۔ سائل نے عرض کیا کہ اونٹنی کے بچہ سے بھلا کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر اونٹ اونٹنی ہی کا بچہ تو ہوتا ہے۔[1] ایک صاحب سے مزاحاً کہا کہ اے دو کانوں والے۔[2] ایک بوڑھی خاتون آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بوڑھی عورت جنت میں داخل نہیں ہوگی۔ وہ قرآن پڑھا کرتی تھیں، کہنے لگیں بوڑھی عورتوں کا کیا قصور کہ وہ جنت میں نہیں جائیں گی، ارشاد فرمایا کہ تم نے قرآن نہیں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر ان کی جوانی لوٹا دیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ بڑھاپے کی حالت میں وہ نہیں جائیں گی۔[3] ـــــ کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم عملاً بھی مزاح فرمایا کرتے زاہر بن

y مشکوٰۃ بحوالۂ دارقطنی کتاب الشعر، الفصل الثالث: ص ۴۱۰

u بخاری عن عبدالرحمن بن عوف: ۹۴/۱

q بخاری عن عائشہ، مشکوٰۃ بحوالہ بخاری: ص ۴۱۰

ہران آپ کے دیہاتی ساتھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ایک گونہ بے تکلف تھے، شکل وشباہت بہت اچھی نہ تھی، ایک دن اپنا سامان بیچنے میں مصروف تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دیکھی میں پیچھے سے آئے اور پکڑ لیا۔ انہوں نے نہیں سمجھا، کہنے لگے، کون ہیں؟ مجھے چھوڑ دو۔ پھر جب گوشہ چشم سے دیکھا تو اپنی پشت سینۂ مبارک سے تبرکاً چمٹانے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کون اس غلام کو خریدے گا، حضرت زاہر نے کہا کہ آپ مجھے معمولی اور کھوٹا سودا پائیں گے۔ ارشاد ہوا: لیکن تم خدا کی نظر میں کھوٹے نہیں۔[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بے تکلفی اور شفقت صحابہ میں بھی یہ ہمت پیدا کرتی تھی کہ وہ گاہے ماہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذاق کر لیا کرتے اور مزاح میں بھی آپ کے احترام کی پوری رعایت کرتے۔ عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سے آپ کے سامنے ایسی گفتگو کرنا ثابت ہے جس سے ہنسی آئے۔[2] تاہم اس باب میں بھی غلو اور افراط شریعت کو پسند نہیں اور نہ ایسا مزاح پسند ہے جو لطف ومحبت میں اضافہ کے بجائے ایذاء اور محبت میں کمی کا سبب ہو جائے، اسی پس منظر میں آپ سے مزاح کی ممانعت بھی منقول ہے: "**ولا تمازح**[3]"

مزاح کے اصول میں یہ بھی ہے کہ اس میں جھوٹی اور غلط بات نہ کہی جائے۔ ایک بار حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ سے تعجب کے ساتھ عرض کیا۔ آپ بھی ہم لوگوں سے مزاح فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہر طور میری زبان سے سچ کے سوا کچھ اور نہیں نکلتا "**لا اقول الا حقا**"[4] علی قاری رحمہ

w مسلم عن ابی ھریرہ، کتاب الشعر: ۲۳۹/۲

e بخاری عن براء بن عازب باب غزوۃ الخندق: ۵۸۹/۲

q بخاری عن انس باب غزوۃ الخندق: ۵۸۹/۲

w بخاری عن جندب باب ما یجوز من الشعر: ۹۰۸/۲

e مرقاۃ المفاتیح: ۶۱۳/۴

اللہ تعالیٰ نے امام نووی سے مزاح کے سلسلہ میں شریعت کے نقطۂ نظر کو بڑے بچے تلے الفاظ میں اس طرح نقل کیا ہے:

''وہ مزاح جس سے منع کیا گیا ہے ایسا مزاح ہے جس میں افراط ہو اور کثرت و دوام ہو اس کی وجہ سے کثرت سے ہنسی آتی ہے، قلب میں سختی پیدا ہوتی ہے، اللہ کی یاد اور دین کی اہم باتوں میں غور وفکر سے غفلت پیدا ہوتی ہے، بسا اوقات ایذا اور حسد کا باعث ہو جاتا ہے اور رعب و وقار کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسا مزاح جو ان باتوں سے خالی ہو، مباح ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے اور مقصود مخاطب کی تالیف اور ان سے انس کا اظہار ہوا کرتا تھا جو کہ محبوب سنت ہے۔'' 1

لطیفہ گوئی اور طنزیات میں زبان کو ذریعہ بنایا جائے یا قلم کو ان ہی اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے، اور ہاں ایسا مزاح جو تعمیری مقصد کے لئے نہ ہو بلکہ وقتی تفریح کے لئے ہو، کو مستقل مشغلہ بھی نہ بنانا چاہئے، نیز لطیفہ گوئی کو ذریعہ معاش بنانا اور اس کی اجرت وصول کرنا فقہاء کی نگاہ میں مکروہ اور ارشاد خداوندی " B D C D E[2] کا مصداق ہے۔[3]

ترنم وموسیقی

گانا اور بجانا بھی ان امور میں سے ہے جو انسانی طبیعت پر گہرا اثر ڈالتا ہے اور اس کو متاثر کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں شریعت کے عام اصول وہی ہیں جو اشعار کے سلسلہ میں ہیں یعنی اگر اشعار غلط جذبات کو ہوا دینے والے ہوں اور ہیجان انگیز ہوں، ان کا سننا اور سنانا تو بہرحال کراہت سے خالی نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر عورتیں غیر محرم اور اجنبی مردوں کے درمیان آکر گائیں تو یہ بھی ناجائز ہی ہوگا کہ شریعت نے اس باب میں جو احتیاط برتی ہے یہ اس کے خلاف ہے، اسی طرح اگر گانے کے ساتھ مزامیر اور

q دیکھئے عالمگیری: ۳۵۱/۵

دوسرے آلات ہوں تو اس طرح گانا بجانا بھی جائز نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ تم گانا اور موسیقی کے سننے سے بچو "ایاکم واستماع المعازف والغنا[1]" حضرت علی کی ایک روایت میں امت کے ایک طبقہ پر عذاب کا اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے جو شراب پیتے ہوں، ریشم پہنتے ہوں اور دف بجاتے ہوں[2] البتہ اگر ان مفاسد سے بچ کر ترنم سے اشعار پڑھے اور سنے جائیں تو مضائقہ نہیں۔

علامہ شامی نے نقل کیا ہے کہ گانے (غناء) کا اطلاق اس وقت ہوگا جب کہ تین باتیں پائی جائیں، اشعار ہوں ان کو لحن کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کے ساتھ تالی بجائی جائے، اگر ان میں سے کوئی ایک بات نہ پائی جائے تو اس پر غناء اور گانے کا اطلاق نہ ہوگا۔ اسی طرح ایسے اشعار پر گانے کا اطلاق ہوگا جس میں کسی متعین زندہ مرد یا عورت کے اوصاف بیان کئے جائیں، شراب کی ترغیب ہو یا کسی مسلمان کی ہجو ہو اور یہی پڑھنے والے کا مقصود ہو، اگر اس کو عربی زبان کے کسی اسلوب کو ثابت کرنے یا فصاحت و بلاغت کے سیکھنے کے لئے پڑھا جائے یا ایسے اشعار ہوں جس میں اچھے مضامین ہوں ان کو ترنم سے پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں جب تک کہ آلات موسیقی کی شرکت نہ ہو، نیز صوفیاء کے یہاں قوالی اور ان احکام کی رعایت کے بغیر سماع اور وجد و حال کی جو رسم جاری ہے وہ مکروہ اور دین میں بے اصل ہے[3] فقہ حنفی کی مشہور کتاب بزازیہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ڈھول، طبلہ وغیرہ کی آواز کا سننا حرام و معصیت اور وہاں بیٹھنا فسق ہے[4] کسی کی تعیین کے بغیر ایسے اشعار جس میں عارض و گیسو اور قد و قامت اور عورتوں اور امردوں کے دوسرے اوصاف ذکر کئے جائیں، ان کا گانا بھی اہل دین کے لئے مناسب نہیں اور ایسے لوگوں کے درمیان پڑھنا جن پر ہوا اور نفسانیت کا غلبہ

---

w الفتاوی الهندیه: ۳۵۱/۵

e رد المحتار: ۲۲۴/۵

ہو، ناجائز ہے، آلات موسیقی کے ساتھ گانا گانے اور سننے کی حرمت ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہ ہے۔[1]

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں جن مختلف آلات موسیقی کا استعمال کیا جاتا ہے وہ جائز نہیں ہیں۔

صحت افزا کھیل وورزش

ایسے کھیل جس سے جسمانی قوت یا سواری وغیرہ میں مہارت پیدا ہو جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثنیۃ الوداع اور مسجد بنو حنیف کے درمیان گھوڑ دوڑ کرائی ہے۔[2] نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیراندازی اور شمشیر زنی اونٹ اور گھوڑے وغیرہ کی دوڑ میں مسابقت کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔[3] اسی لئے فقہاء نے مختلف جانوروں کے علاوہ پیدل دوڑ کو بھی مستحب قرار دیا ہے، نیز اس پر انعام کا مقرر کیا جانا بھی درست ہے، البتہ انعام اور شرط کے جائز ہونے کی تین صورتیں ہیں:

1 کوئی تیسرا شخص جو دوڑ میں شامل نہ ہو۔ شرکاء میں سے سبقت لانے والے کے لئے انعام کا اعلان کرے۔

2 دو شخص شریک ہوں لیکن شرط ایک ہی جانب سے ہو مثلاً رشید وحمید میں سے اگر رشید سبقت لے جائے تو حمید اسے حسب شرط مال ادا کرے، حمید سبقت لے جائے تو رشید کچھ ادا نہ کرے۔

3 تین یا اس سے زیادہ آدمی شریک ہوں، دو آدمیوں میں یہ شرط ہو کہ ہم دو میں سے جو سبقت لے جائے اس کو دوسرا مشروط رقم ادا کرے گا، بقیہ دوسرے اشخاص کے

---

q مرقاۃ: ۹۱۱/۴

w مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی عن ابی ثعلبہ الخشنی، کتاب الشعر: ص ۴۱۰

q مسلم: ۱۸/۱

w مشکوٰۃ بحوالہ مسند احمد عن سعد بن ابی وقاص کتاب الشعر: ص ۴۱۰

لئے کوئی شرط نہ ہو۔ اگر تمام شرکاء کے ساتھ اس طرح کی شرط ہو کہ سبقت لے جانے والے کو مشروط مقرر مال ادا کریں گے تو یہ جوا ہوگا اور اس طرح کا کھیل جائز نہیں ہوگا۔[1]

موجودہ زمانہ میں بھی جن کھیلوں سے جسمانی ورزش ہوتی ہے جیسے کبڈی فٹبال، والی بال یا گاڑیوں کی ریس وغیرہ۔ ان کے احکام اسی طرح کے ہوں گے جو گھوڑ دوڑ وغیرہ کے ہیں۔

دفاع میں معاون کھیل

ایسے ہی وہ کھیل جن سے دفاع اور حفاظت کی قوت پیدا ہوتی ہو، نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہیں۔ اوپر گزر چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیراندازی کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اہل حبش نیزوں سے کھیلتے تھے۔[2] تیراندازی کے مقابلہ میں تو بعض دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی ہے۔[3]

اس لئے موجودہ زمانہ کے وہ تمام کھیل جس سے آدمی اپنی حفاظت کے لائق ہو سکے، نہ صرف درست بلکہ مستحسن ہوں گے مثلاً کشتی کھیلنا، کراٹے، لاٹھی چلانا، مکا بازی وغیرہ۔ فقہاء شافعیہ نے صحیح لکھا ہے کہ تیرنا اور بندوق کا نشانہ کرنا وغیرہ کھیل جائز ہیں۔[4]

تاہم خیال رہے کہ کھیل کود اور ورزش کا یہ جواز اس وقت ہے جب کہ شریعت کے احکام ستر کی پوری پوری رعایت ہو اور لڑکے اور لڑکیوں کا اختلاط نہ ہو۔

---

q ترمذی عن انس باب ماجاء فی المزاح: ۲۰/۲
w ابوداؤد عن انس باب ماجاء فی المزاح: ۶۸۳/۲
e مشکوٰۃ المصابیح عن انس باب المزاح: ص۴۱۶
q مشکوٰۃ، الفصل الثانی باب المزاح: ص۴۱۶

شطرنج اور بعض نئے کھیل

شطرنج کے ساتھ اگر جوا بھی ہو تب بھی اس کے ناجائز ہونے پر اتفاق ہے ہی اگر جوا نہ ہو تب بھی اکثر فقہاء کے نزدیک گناہ اور حرام ہے۔[1] حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کچھ شطرنج کھیلنے والوں پر گزر رہوا تو فرمایا یہ کیسے بت ہیں جن پر تم جھکے پڑے ہو "ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون"

اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو شطرنج سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے وہ واقعی اور حقیقی مسائل سے بے توجہ ہو جاتے ہیں کیوں کہ یہ ایسا کھیل ہے کہ انسان کے اندر جسمانی تکان نہیں ہوتی اور وہ بلا قید وتحدید وقت کھیلتا چلا جاتا ہے، جو کھیل جسمانی مشقت اور ورزش کے ہوتے ہیں ان کو مسلسل اور بہت دیر تک کھیلا نہیں جا سکتا۔ اسی لئے فقہاء نے شطرنج اور عام کھیلوں کے درمیان فرق...... کیا ہے اس لئے صحیح یہی ہے کہ اگر قمار اور جوا نہ ہو تب بھی شطرنج کراہت سے خالی نہیں[2]

مجھے خیال ہوتا ہے کہ فی زمانہ کرکٹ کا مروجہ کھیل شطرنج ہی کے حکم میں ہے اور ضروری اور حقیقی مسائل سے غفلت پیدا کرنے میں کہا جا سکتا ہے کہ شطرنج سے بھی بڑھ کر ہے اور یہی حکم کیرم بورڈ اور لوڈو (Ludo) وغیرہ کا ہونا چاہئے۔ "واللّٰہ اعلم بالصّواب"

%

w دیکھئے مشکوٰۃ المصابیح باب المزاح کی آخری حدیثیں: ص ۴۱۷

e ترمذی عن ابن عباس باب ماجاء فی المراء: ۲۰/۲

r ترمذی فی الشمائل عن ابی ھریرہ، باب ماجاء فی صفۃ مزاح رسول اللّٰہ

نواں باب

نکاح وطلاق

انسان کے اندر جو طبعی تقاضے رکھے گئے ہیں ان میں ایک اہم چیز اپنی صنف مخالف کی طرف رجحان ومیلان ہے، بچپن میں یہ جذبہ محدود ہوتا ہے لیکن انسان جوں جوں بلوغ کی طرف قدم بڑھاتا ہے اس تقاضائے طبعی میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اس کی شدت مخالف کی ایک ایک ادا اور اس کے حرکت و سکون کا ایک ایک سماں اس آگ کو بھڑکاتا اور شعلہ بار کرتا جاتا ہے۔ پھر رب کائنات نے اپنی اس حسین اور خوبصورت دنیا میں قدم قدم پر ایسے محرکات ودواعی رکھ دیئے ہیں جو اس کے تقاضائے صنفی کو حرکت دیتے اور بڑھاتے رہتے ہیں، چاند کی ٹھنڈک، گلاب کی رنگت، موتیوں اور بیلوں کی خوشبو، بادنسیم کے جھونکے، ساون کی بہار اور برسات کا نکھار، ان میں سے کوئی چیز نہیں جو انسان کے نفسانی جذبات کے لئے مہمیز کا کام نہ کرتی ہوں، اور پھر خود انسان نے اپنے ان جذبات کو نشو ونما بقاء وارتقاء کے لئے کچھ سامان نہیں کیا ہے؟ نغموں کی شیرینی اور شاعروں کی خیال آرائی اور بلند پروازی ان سب سے سوا ہے۔

غور کرو کہ فاطر کائنات کی طرف سے قرار واطمینان سے محرومی اور اضطراب و بے سکونی کے یہ سامان حضرت انسان کے لئے کیوں کئے گئے ہیں؟ اسی لئے کہ انسان کے ورع واحتیاط، اطاعت وفرمانبرداری اور تقویٰ ورضا جوئی کا امتحان لیا جا سکے اور اس سے بڑھ کر دوسرا مقصود یہ ہے کہ نسل انسانی کی افزائش اور اس میں تسلسل برقرار

رہے، پھر افزائش نسل کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ عصمت انسانی بھی ہوا ور پانی کی طرح عام اور بے قید ہو۔ لیکن اس میں جو بے اعتدالی، بے غیرتی و بے حیائی، منافست باہمی، نسل انسانی کی اپنی شناخت سے محرومی اور اعتماد و اعتبار کا فقدان ظہور میں آ تا، اور اس سے معاشرہ میں جو بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا وہ محتاج اظہار نہیں، تاریخ میں کئی ایسے مراحل آئے ہیں جب حیوان نما انسانوں اور شیطان حقیقی کو شرمندہ کر دینے والے شیطانوں نے اس کا تجربہ کیا ہے، ایسا تجربہ کہ جس کے ذکر اور تصور سے بھی حیا کا لہو ٹپکتا ہے، روم پر دہ دور انحطاط جب طوائف بننا معاشرہ کے لئے ایک آئیڈیل تھا اور مزدک کی وہ تحریک جس میں ماں اور بہن بیٹی کی تمیز بھی روا نہیں تھی، اس کی شرمناک مثالیں ہیں اور افسوس کہ مغرب کی جاہلیت جدیدہ نے ایک بار پھر تہذیب و ثقافت کے پیرہن میں ملبوس ہو کر اسی تاریخ بدانجام کو دہرانے کی سعی کی ہے۔ ”واللّٰہ المشتکی“

اس افراط کے مقابلہ اس تفریط کا ظہور ہوا کہ مرد و زن کے رشتۂ صنفی کو بہر طور ایک ناپاکی اور نجاست تصور کر لیا گیا اور نا قابل عفو گناہ ٹھہرایا گیا، روم میں بھی بے قید اباحت کے مقابلہ یہی ردعمل پیدا ہوا اور ایران میں بھی مزدک کی تحریک کے مقابلہ مانی کی تحریک شروع ہوئی جس نے رہبانیت کو جنم دیا اور اس رہبانیت نے فکر و خیال میں ایسی شدت پیدا کر دی کہ اولاد کی نگاہ میں خود ماں باپ کا وجود ایک گناہ ٹھہرا، بلکہ انسانوں کو خود اپنے آپ سے گھن آنے لگی کہ وہ بھی ایک گناہ اور غلطی کا نتیجہ ہے، اس فکری بے اعتدالی سے انسانی سماج میں جو نفرت بے رحمی اور بے مروتی وجود میں آئے گی اور انسانی معاشرت سے فرار کے جذبات پروان چڑھیں گے نسل انسانی کی افزائش میں جو کمی واقع ہوگی اور فطرت انسانی پر غیر طبعی روک لگانے کی وجہ سے جو اخلاقی نفسیاتی اور طبی نقصانات ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔

اسلام نے جو دین فطرت ہے اور ایک طرف فطرت انسانی کی رعایت بھی کرتا

ہے اور دوسری طرف اس کی تہذیب بھی، اس نے اس باب میں بھی وہی اعتدال و توازن کی راہ اختیار کی ہے، ایک طرف جائز راستہ سے اس تقاضے کی تکمیل کے لئے نکاح کو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن قرار دیا اور دوسری طرف زنا کے بارے میں اسی درجہ سختی اور شدت برتی۔

واقعہ ہے کہ جو شخص بھی نکاح کے بارے میں اسلام کے معتدل و متوازن تصورات کا مطالعہ کرے گا، اس کو فطرت کی میزان پر پرکھے گا اور مذاہب عالم کے نقطۂ نظر سے مقابلہ کرے گا اس کی روح وجد میں آئے گی اور اس کی زبان دل بے ساختہ اسلام کی قانون فطرت سے ہم آہنگی، اعتدال و توازن اور رب کائنات کی طرف سے اس کے نزول وحصول کا اعتراف کرے گا کہ "ان الدین عند اللّٰہ الاسلام"

نکاح کی حوصلہ افزائی

اسلام نے نکاح کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اسے پسند کیا ہے اور اس کی ترغیب دی ہے اور تجرد کی زندگی کو منع کیا ہے، مسلم سماج کے بے نکاح لوگوں کے نکاح کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد ہوا " ! " #"[1] عورتوں کی تجرد کی زندگی کو روکتے ہوئے فرمایا گیا " Y Z [\ ]"[2] انبیاء کے اوصاف میں یہ بات شمار کی گئی کہ وہ شادی شدہ اور صاحب اولاد ہوا کرتے تھے " l m no p q r s t u"[3] اپنے صالح بندوں کی اس دعا کو سراہا گیا کہ وہ سکون بخش بیوی اور اولاد کے لئے خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں" u v w x y z { |"[4]

حدیثیں بھی کثرت سے نکاح کی ترغیب اور حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں موجود

صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ص ۱۶

q مرقاۃ: ۶/۴۸۸ w لقمان، آیت: ۶ e درمختار وردالمحتار: ۵/۲۲۴

ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو وہ ضرور ہی نکاح کر لے "من استطاع منکم الباءة فليتزوج"[1] کچھ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے یہ ارادہ کیا کہ وہ نکاح نہیں کریں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ میں تم میں سب سے زیادہ صاحب تقویٰ اور صاحب خشیت ہوں اس کے باجود عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو جس نے میرے طریقہ سے انحراف کیا وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو نہ صرف اپنی سنت بلکہ اللہ کے رسولوں اور نبیوں کی سنت قرار دیا۔[3] نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی حاجت پیدا ہونے کے بعد ابتداء عمر ہی میں نکاح کو پسند فرمایا اور اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ عمل اس کی شیطان کی دام سے حفاظت کرتا ہے۔[4] بعض صحابہ نے اس لئے تجرد کی زندگی گزارنے کی اجازت چاہی کہ اپنا وقت زیادہ سے زیادہ عبادت میں استعمال کر سکیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ناپسند فرمایا اور اجازت نہیں دی۔[5] خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل میں متعدد نکاح فرمائے ہیں۔

نکاح کا حکم

نکاح کے بارے میں ان تاکیدات اور خود لوگوں کی ضروریات و حالات کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے تعیین کی ہے کہ کن حالات میں شرعی نقطہ نظر سے نکاح کی کیا اہمیت ہوگی؟

---

q کنز العمال عن ابن مسعود: ۱۹/۱۶۰ w کنز العمال: ۱۹/۱۶۲

e شامی: ۵/۲۲۲ r درمختار علی هامش الرد: ۵/۲۲۳

q الفقه الاسلامی وادلته: ۳/۵۲۸، احیاء علوم الدین: ۲/۲۶۸، ۲۶۹ کتاب آداب السماع والوجد

w نسائی باب اخمار الخیل للسبق: ۲/۱۲۸

e نسائی عن ابی هریرة باب السبق: ۲/۱۲۵

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر نکاح نہ کرنے کی صورت میں گناہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو نکاح واجب ہوگا تا کہ اپنے آپ کو پاک دامن رکھ سکے اور حرام سے بچا رہے۔ جنسی تقاضہ کے اعتبار سے نکاح کی حاجت رکھتا ہو لیکن اس درجہ شدید تقاضہ نہ ہو کہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں گناہ میں پڑے جائے، اپنے نفس کے بارے میں مطمئن ہو تو ایسے شخص کو نکاح کر لینا چاہئے۔ بعضوں نے ان حالات میں نکاح کو مسنون اور بعضوں نے مستحب لکھا ہے مگر اصل میں ان حالات میں نکاح سنت سے کم درجہ نہیں اور جن حضرات نے مستحب لکھا ہے ان کا بھی مقصود یہی ہے۔[1] روایات اس بارے میں جس کثرت اور قوت کے ساتھ منقول ہیں، ان کا بھی یہی تقاضہ ہے۔

وہ شخص جس میں جنسی خواہش نہ ہو اور صنفی تعلقات سے معذور ہو، خواہ پیدائشی طور پر ایسا ہو، یا درازی عمر اور بیماری وغیرہ کی وجہ سے ایسا ہوا ہو، اس کو نکاح نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ وہ نکاح کے واجبات کی ادائیگی اور بیوی کی عصمت و عفت کی حفاظت سے قاصر و عاجز ہے۔[2] ہاں اگر کوئی سن رسیدہ شخص اپنی عمر ہی کے لحاظ سے سن رسیدہ عورت سے نکاح کر لے تا کہ بڑھاپے میں ایک دوسرے کی خدمت کر سکیں تو مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ اس کے اس عمل کی وجہ سے عورت کی بے عفتی کا اندیشہ نہیں۔

زمانۂ جاہلیت کے نکاح

اسلام سے پہلے نکاح کے نام پر مختلف ایسے طریقے رائج تھے جو فحاشی و بے حیائی کی بدترین مثال تھے، چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جاہلیت میں تین قسم کے نکاح ہوتے تھے، 1 پیشہ ور فاحشہ عورتیں اپنے دروازے پر جھنڈا نصب کر دیتیں جو ان کے پیشہ کی علامت ہوتی، ایسی عورتوں کے

q درمختار: ۲۵۸/۵

w بخاری باب اللعب بالحراب ونحوھا: ۹۰۶/۱

پاس مرد آتے، اس کو ''نکاح رایات'' کہا جاتا۔ 2 دوسری قسم ''نکاح رہط'' کی تھی، ایک قبیلہ یا علاقہ کے متعدد لوگ ایک عورت سے مقاربت کرتے اور وہ عورت ان کے علاوہ کسی اور مرد سے تعلق نہیں رکھتی پھر ولادت کے بعد مشابہت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کی طرف مولود بچہ کی نسبت کرتی، 3 تیسری قسم ''نکاح استبضاع'' کی تھی، عورت شریف اور اچھے لڑکے کے حصول کے لئے مختلف قبائل کے ممتاز لوگوں سے جنسی تعلق قائم کرتی۔[1] اسلام نے نکاح کے ان تمام حیا سوز طریقوں کو منع کر دیا اور نسوانیت کو اس تذلیل واہانت سے نجات بخشی۔

اسلام کا طریق نکاح

اسلام نے نکاح کا جو طریقہ مقرر کیا وہ نہایت آسان، سادہ، صرفہ اور اخراجات کے لحاظ سے سہل ہے۔ اسلام کے طریقہ نکاح کا خلاصہ یہ ہے کہ دو بالغ مرد وعورت دو گواہوں کے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ ازدواجی رشتہ کو قبول کر لیں۔[2] عاقدین میں کوئی ایک یا دونوں نابالغ ہوں تو ان کے اولیاء کا نکاح کو قبول کرنا اور معاملہ کو طے کرنا ضروری ہوگا۔[3] لڑکی بالغہ ہو تو احناف کے نزدیک اس کی طرف سے ولی کا مجلس نکاح میں ایجاب وقبول کا طے کرنا بہتر ہے لیکن اگر وہ خود بھی نکاح کو قبول کر لیں تو کافی ہے۔[4] اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الایم احق بنفسھا من ولیھا"[5] لڑکی خود اپنے نفس کی زیادہ حقدار ہے قرآن مجید نے ایک سے زیادہ مواقع پر خود عورت کی طرف نکاح کی نسبت کی ہے۔[6] خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی ولی کے توسط کے بغیر نکاح کیا اور یہی شریعت کے عام اصول وقواعد کا تقاضہ ہے۔ اس لئے کہ نکاح ایک عقد اور معاملہ ہے اور شریعت نے تمام عقود اور معاملات میں عورت کی شخصیت کو ہر طرح مستقل مانا

e بخاری باب التحریض علی الرمی: ۴۰۸/۱

r درمختار علی ھامش الرد: ۲۵۹/۵

ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ عورت کی طبعی حیا کا تقاضہ ہے کہ اس کی پسند اور رضا مندی کو ملحوظ رکھا جائے لیکن براہ راست ایجاب وقبول کی ذمہ داری اس پر نہ رہے۔ اس بنا پر شریعت نے بالغہ لڑکی کی طرف سے بھی ولی کی وساطت کو بہتر اور مستحب قرار دیا اور یہی منشا ہے ان روایات کا جن میں عورت کے نکاح کے لئے ولی کی ضرورت ظاہر کی گئی ہے اور اس کی تاکید کی گئی ہے۔[1] ـــــ دوسرے فقہاء نے عورتوں کے نکاح کے لئے ولی کی موجودگی کو ایک ضروری شرط مانا ہے۔[2] نکاح کے اس سیدھے سادے طریقہ کا دوسری اقوام کے طریقۂ نکاح سے موازنہ کیا جائے تو اسلام کی شان رحمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے نکاح کے معاملہ میں اعلام واظہار کو پسند کیا ہے اسی لئے نکاح کے لئے گواہوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا گیا۔[3] نکاح کے اعلان کا حکم فرمایا گیا ہے۔[4] اور اعلان نکاح کے لئے دف وغیرہ بجانے کی اجازت دی گئی ہے۔[5] مسجد میں نکاح کرنے کو بہتر قرار دیا گیا ہے جہاں فطری طور پر لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے پھر اس کے ساتھ دعوت ولیمہ بھی جوڑ دی گئی ہے تاکہ اعزہ واقرباء دوست احباب پوری طرح واقف ہو جائیں لیکن فی زمانہ عقد نکاح کے لئے جو تکلّفات کئے جاتے ہیں، دور دراز سے نکاح میں شرکت کے لئے آتے ہیں، ایک شہر سے دوسرے شہر باراتیں جاتی ہیں اور لڑکی والوں کو ان کے لئے پر تکلف کھانوں کا نظم کرنا پڑتا ہے، پھر تمام دوست احباب اور اعزہ واقرباء بارات میں شرکت کو اپنا حق جانتے ہیں، یہ

q الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۵۷۲/۳ نیز دیکھئے الجامع لاحکام القرآن: ۲۹۱/۶

w اگر شطرنج کے ساتھ جوا نہ ہو تو امام شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اسے مباح قرار دیتے ہیں۔ در مختار علی ھامش الرد: ۲۵۳/۵

q نور، آیت: ۳۲۰ w البقرہ، آیت: ۲۳۲

e رعد، آیت: ۳۸ r الفرقان، آیت: ۷۴

تمام مزاج شریعت کے قطعاً مغائر، ناپسندیدہ اور غلط ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ گواہان نکاح کے علاوہ کچھ صالحین اور نیک لوگوں کو جمع کر لینا آداب نکاح میں سے ہے۔[1]

متعہ

نکاح کے اس شریفانہ طریقہ کے علاوہ اور کوئی صورت اسلام نے روانہیں رکھی، اس کے سوا جتنی صورتیں تھیں ان میں سے کوئی بھی بے حیائی سے خالی نہیں ـــــ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے ابتداءً زمانۂ جاہلیت کے ایک اور طریقۂ نکاح نکاح متعہ کو جائز رکھا تھا جس میں ایک یا چند دن کے لئے باہم مقررہ مہر پر نکاح کیا جاتا تھا۔ لیکن بعد کو چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی منع فرمایا دیا۔ ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اب قیامت کے لئے متعہ کو حرام قرار دیا ہے۔[2] سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شدت سے متعہ کی حرمت کے قائل تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے عبداللہ بن عباس کی فہمائش بھی کی تھی۔[3] عبداللہ بن عباس کی طرف بعض لوگوں نے متعہ کے جواز کی نسبت کی ہے حالانکہ وہ بھی ابتداء اضطرار کی حالت میں نکاح متعہ کے جواز کے قائل تھے، ایسے اضطرار میں کہ جس میں انسان کے لئے ''سور'' تک کھانا جائز ہو جاتا ہے۔[4] لیکن بعد میں انہوں نے اس سے رجوع فرمایا لیا تھا[5] اس لئے متعہ کی حرمت پر امت کا اجماع ہے اور صرف روافض ہی ہیں جو اس شنیع طریقہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔

---

q بخاری: ۲/۷۵۸ باب قول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من استطاع منکم الخ

w اتزوج النساء ومن رغب عن سنتی، بخاری، باب الترغیب فی النکاح: ۲/۷۵۷

e مجمع الزوائد بحوالۂ طبرانی عن ابن عباس: ۴/۲۵۳ وفیہ اسماعیل بن شیبہ قال الذہبی، واہن

نکاح حلالہ

نکاح متعہ سے قریبی ایک اور مسئلہ اس نکاح کا ہے جو طلاق مغلظہ کی وجہ سے علیحدہ ہونے والی عورت کو اس کے شوہر اول کے لئے حلال کرنے کی نیت سے کیا جاتا ہے ـــــ صورت حال یہ ہے کہ شریعت نے تین طلاق کو روکنے اور مرد کو متنبہ کرنے کی غرض سے تین طلاق کے بعد عورت کو اس پر کلیۃً حرام قرار دیا ہے اور اب دوبارہ ازدواجی رشتہ کے حلت کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ وہ کسی مرد کے نکاح میں جائے اور صنفی تعلقات کے ذریعہ وہ ایک دوسرے سے محظوظ ہوں۔ اب اس کے بعد وہ شوہر اول کے لئے حلال ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ وہ ایک غیرت مند شوہر کی غیرت کے لئے شدید چوٹ کا درجہ رکھتی ہے۔

مگر بعض لوگوں نے اس کے لئے یہ بہانا تلاش کر لیا کہ وہ کسی مطلقہ عورت کا کسی مرد سے دن دو دن کا نکاح کرا لیتے، وہ مرد ہم بستری کے بعد اسے طلاق دے دیتا تا کہ وہ شوہر اول کے نکاح میں آسکے اور نکاح کے وقت ہی یہ جان رہا ہوتا کہ وہ محض عارضی اور وقتی ضرورت کی تکمیل کے لئے نکاح کر رہا ہے اور اس عورت کے ساتھ مستقل ازدواجی زندگی گزارنے میں سنجیدہ نہیں، نکاح کی یہ صورت بعینہٖ متعہ کے مماثل ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ نکاح متعہ میں عاقدین معاہدۂ نکاح کے وقت صراحۃً اس نکاح کے عارضی اور وقتی ہونے کا اظہار کر دیتے ہیں اور اس نکاح میں یہ بات ان کے دل میں ہوتی ہے، زبان تک نہیں آتی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجی ہے جو ایک صاحب ایمان کو بے چین کر دینے اور تڑپا دینے کے لئے کافی ہے۔[1] البتہ اگر کوئی شخص ایسا کر ہی گزرے تو نکاح منعقد ہوگا یا نہیں؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

عام فقہاء کی رائے یہی ہے کہ نکاح منعقد ہو جائے گا، وہ عورت شوہر اول کے لئے حلال ہو جائے گی [2] البتہ فقہاء حنابلہ اور احناف میں قاضی ابو یوسف ایسے نکاح کو تحلیل کے لئے ناکافی قرار دیتے ہیں [3] ـــــ صحیح یہی ہے کہ گو ایسا شخص عند اللہ سخت عاصی اور گنہ گار ہے اور یہ طرز عمل مذموم اور نہایت ناپسندیدہ ہے لیکن حلت پیدا کرنے کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ خود اس حدیث میں بھی شوہر دوم کو حلال قرار دینے والا (محلل) اور شوہر اول کو محلل لہ (جس کے لئے عورت کو حلال کیا گیا) قرار دیا گیا ہے اور اسلامی قانون میں ایسی نظیریں موجود ہیں کہ ایک فعل بجائے خود ممنوع اور ناپسندیدہ رہتا ہے لیکن اس سے جو نتائج اور اثرات متعلق ہوتے ہیں وہ بہرحال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

نکاح کے مقاصد

اب ایک نظر ان مقاصد پر بھی ڈالنا مناسب ہوگا جن کے لئے اسلام نے نکاح کو نہ صرف جائز قرار دیا ہے بلکہ اس کو معاملات سے بڑھ کر عبادات کے خانہ میں جگہ دی ہے اور جن کی وجہ سے مسلمانوں کے بڑے طبقہ کی نگاہ میں تاہل کی زندگی تجرد کی اس زندگی سے افضل ہے جس میں نفل عبادت میں اپنا وقت مصروف رکھا جائے کہ احکام ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں اور مقاصد کو سمجھے بغیر نہ اس شعبہ کے متعلق کسی نظام حیات کے مزاج و مذاق کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ احکام کی تفصیلات کو۔

اسلام کی نگاہ میں نکاح کا اصل مقصود توالد و تناسل ہے، اس لئے قرآن مجید نے بیوی کو مرد کے لئے کھیتی قرار دیا ہے۔"**فأتوا حرثكم انى شئتم**"[1] پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مناکحت کی ترغیب دیتے ہوئے اس کو افزائش امت کا باعث فرمایا

r مجمع الزوائد بحوالۂ طبرانی عن جابر: ۲۵۳/۴

t بخاری، باب ما یكره من التبتّل والخصاء

q وكثير اما يتساهل فى اطلاق المستحب على السنة، ردالمحتار: ۴۲۸/۲

"تناکحوا تناسلوا"[1] روایات میں خاص طور پر ایسی عورت سے نکاح کرنے کی ہدایت فرمائی جس میں تولید کی قوت وصلاحیت زیادہ ہو "تزوجوا الودود الولود"[2] قرآن[3] نے صالحین اور نیکوکار بندوں سے ایک ساتھ بیوی اور اولاد دونوں کی دعا کرائی ہے " x w v y z { ا"[4] یہ ساری باتیں اسلام کے اس تصور کو واضح کرتی ہیں کہ نکاح کا اصل، بنیادی اور اساسی مقصود نسل انسانی کی افزائش ہے۔ اسی لئے شریعت اسلامی اصولی طور پر ضبط ولادت کی نظریہ کی حامی نہیں ہے جس کا آگے ذکر آئے گا۔

نکاح کا دوسرا اہم مقصد عفت وعصمت کی حفاظت ہے اور فطری طریقہ پر انسان کی نفسانی ضرورت کی تکمیل۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح انسان کو بدنگاہی سے بچاتا ہے اور بے عفتی سے حفاظت کرتا ہے "فانہ اغض للبصر واحصن للفرج"[5] قرآن مجید نے شادی شدہ مرد وعورت کو "محصن" اور "محصنہ" سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی قلعہ بند کے ہیں، گویا نکاح کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو عفت و عصمت کے قلعہ میں محفوظ کر لیتا ہے اور شیطان اس پر تسلط حاصل نہیں کر پاتا۔

انسان کی طبیعت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ دوسرے انسان کے ذریعہ سکون اور قرار حاصل کرتا ہے، وہ جب پیدا ہوتا ہے تو ماں کی ممتا، باپ کی شفقت اور بھائی بہنوں کا پیار اور دل کا قرار ہوتا ہے اور جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے ان رشتوں سے اس کا جذباتی اور والہانہ لگاؤ کم ہوتا جاتا ہے اور بیوی اس کمی کو پورا کرتی ہے اور اگر نیک اور صالح ہو تو قلب کی ٹھنڈک اور ذہن ودماغ کی راحت کا سامان بن جاتی ہے، پھر جوں جوں عمر ڈھلتی جاتی ہے اولاد کی محبت بیوی کی محبت پر غالب ہوتی جاتی ہے لیکن

---

w المغنی: ۵،۶/۷ "ملخص"

q شرح مہذب: ۱۲۹/۱۶ — w ھدایہ: ۳۰۹/۲ — e ھدایہ: ۳۰۹/۲

موت تک اس کے لئے اصل سامان سکون، حزن ومسرت کی شریک، دل کے زخموں کا مرہم اور خلوت وجلوت کی ہمراز ودمساز یہی بیوی ہوتی ہے، اسی لئے قرآن نے کہا ﴿ b a ﴾ اور میاں بیوی کے باہمی تعلق کے لئے نہایت عمدہ تعبیر ''لباس'' کا استعمال فرمایا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لئے لباس ہو ﴿ (* + , - . / ﴾ [2] کہ لباس سے زیادہ کوئی چیز جسم انسانی کی ہمراز، انسان کے خوبی و خامی سے باخبر اور موسموں کی شدت سے صحت کی محافظ نہیں ہوتی۔

غور کیا جائے تو نکاح کے تمام احکام انہی تینوں مقاصد کے گرد گردش کرتے ہیں، عدت اور ثبوت نسب کے تمام احکام اور تعلق ازدواجی کی بابت تمام ہدایات اسی لئے ہیں کہ افزائش نسل کی ضرورت پوری ہو اور نسل انسانی کی شناخت باقی رہے۔

نکاح سے پہلے منگیتر کو دیکھنے کی اجازت، زنا کی حرمت اور بیوی سے زن وشوہر کے تعلق کی ترغیب، ایک دوسرے کے مقتضیات نفس کی رعایت کی ہدایت، مردوں کے لئے ایک تا چار بیویوں کی اجازت وغیرہ احکام کا مقصود محض عفت و پاکدامنی اور عصمت انسانی کا تحفظ ہے۔

رشتہ میں زوجین کی پسند اور ضروری امور میں کفاءت کا لحاظ، حسن معاشرت کے احکام، طلاق کی ممانعت، لیکن جہاں نفرت نے محبت وسکون کے لئے جگہ باقی نہیں رکھی ہو، وہاں طلاق اور خلع کی اجازت اور بعض خاص امراض اور اعذار کی وجہ سے عورت کے مطالبہ تفریق کا حق، یہ اور اس طرح کے بہت سے احکام ہیں جو اس لئے ہیں کہ زوجین کے درمیان محبت وسکون کی فضا برقرار رہے بلکہ پروان چڑھے۔

دنیا کے بعض مذاہب نے نکاح کو ایسا اٹوٹ رشتہ بنا دیا ہے کہ نفرت کی بنیادوں پر بھی اس کی کھوکھلی دیوار کو قائم رکھنا ضروری ہے، مغرب کی جدید ترین تہذیب میں نکاح محض خواہش نفس کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے، نہ اس کے ساتھ توالد وتناسل کا

---

r مبسوط: ۱۰/۵ t مسلم: ۴۵۵/۱ y بقرۃ، آیت: ۲۳۰

جذبہ ہے اور نہ پائیدار محبت وسکون کی دنیا اور نہ رشتہ نکاح کے ساتھ عفت وعصمت کی برقراری۔ اگر جاہلیت کے ان جدید وقدیم بتکدوں کا جائزہ لیا جائے اور ان کے چہروں سے تہذیب وثقافت کی مصنوعی قلعی کو کھرچ کر دیکھا جائے اور ان کا اسلام کی فطری، معتدل اور متوازن تعلیمات سے تقابل کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہی وہ نظام حیات ہے کہ جس نے متوازن اصولوں اور بہترین مقاصد پر احکام نکاح کی بنیاد رکھی ہے اور ہر جگہ افراط وتفریط سے دامن بچائے رکھا ہے۔

منگیتر کو دیکھنا

شریعت اسلامی چاہتی ہے کہ رشتۂ نکاح ایک پائیدار رشتہ ہو، اس لئے وہ ابتداء ہی ناپائیداری کے تمام دروازوں کو بند کر دیتی ہے اسی لئے اس لڑکی کو دیکھنے کی اجازت دی گئی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب فرمائی کہ جس کو نکاح کا پیام دیا جائے، پہلے اس کو دیکھ لیا جائے۔

”اذا خطب احدکم المراۃ فان استطاع ان ینظر الی ما یدعوه الی نکاحها فلیفعل[1]“

D: ”جب تم میں سے کوئی کسی خاتون کے یہاں نکاح کا پیام بھیجے تو جو چیز اس کے نکاح کی داعی بنی ہے اس کو دیکھ سکے تو دیکھ لے۔“

یہ بھی ضروری نہیں کہ لڑکی اور اس کے اولیاء سے پیشگی اجازت لے لے بلکہ غیر محسوس طور پر دیکھ لے تو یہ بھی کافی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مذکورہ روایت میں خود اس امر کی صراحت ہے کہ میں نے ایک عورت کو نکاح کا پیام دیا اور چھپ کر اسے دیکھا[1] اجازت سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ام کلثوم صاحبزادی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کی اجازت ہی سے دیکھا تھا۔

q مشکوٰۃ، باب الولی واستیذان المرأۃ فی النکاح

w ھدایہ: ۳۱۴/۲، باب الاولیاء والاکفاء

تاہم خیال ہوتا ہے کہ بلا اظہار دیکھنا زیادہ مناسب ہے کہ لڑکی کو دیکھ کر پھر رشتہ رد کر دیا جائے تو اس کا نفسیاتی اثر اچھا نہیں ہوتا، لڑکا خود دیکھنے کے بجائے گھر کی دوسری عورتوں کے ذریعہ لڑکی دکھلوائے اور ان کی خبر پر اعتماد کرے تو یہ بھی کافی ہے، ویسے جیسا کہ مذکور ہوا لڑکا خود بھی لڑکی دیکھ سکتا ہے۔ ہندوستان میں لوگ اس کو معیوب سمجھتے ہیں، یہ صحیح نہیں۔

منگیتر کا ہاتھ اور چہرہ ہی دیکھ سکتا ہے[2] اور کپڑے کے اوپر سے جسم کا مجموعی قد و قامت اور بس۔ عورتیں دیکھیں تو شریعت کے عام اصول و قواعد کے مطابق، ناف سے گھٹنوں تک کا حصہ چھوڑ کر جسم کے بقیہ حصے حسب ضرورت دیکھ سکتی ہیں۔[3] البتہ لڑکے کے لئے ضروری ہے کہ نکاح کے ارادہ سے دیکھے، بدنظری مقصود نہ ہو، اگر نکاح کے ارادہ سے دیکھے تو گو شہوت کا اندیشہ ہو پھر بھی دیکھنا جائز ہے۔[4] یہ ایک شرعی ضرورت ہے ـــــ مغربی تہذیب کی اباحیت نے یہ نعرہ بھی لگایا ہے کہ زوجین کو عقد سے پہلے ایک دوسرے کے ساتھ ایک عرصہ تک وقت بھی گزارنا چاہئے اور باہم محبت اور پیار کے تعلقات رکھنے چاہئیں، لیکن اسلام اس طرح کے بے حیائی کے عمل کو حرام اور گناہ عظیم تصور کرتا ہے...... اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک اجنبی مرد و عورت کا ایک دوسرے کے ساتھ تخلیہ میں ملنا جائز نہیں۔[5] اس لئے کہ ایسا کرنا ایک عورت کے ساتھ کھلی زیادتی اور ظلم ہے کیونکہ اس تجربہ نے اگر صنفی تعلقات کے تجربہ تک پہنچا دی اور پھر رشتہ نہ ہو سکا تو اس کا خمیازہ تنہا عورت ہی کو بھگتنا پڑے گا۔

پیام پر پیام

---

e مجمع الزوائد: ۲۸۵/۴ باب ماجاء في الولي والشهود

r ترمذي: ج ۱، باب ماجاء في اعلان النكاح

t ترمذي: ج ۱، باب ماجاء في اعلان النكاح

q احياء علوم الدين: ۳۶/۲

پیغام نکاح دینے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی بھی ہدایت فرمائی کہ اگر ایک شخص کسی لڑکی کو پیام دے چکا ہو تو اب تم اپنی طرف سے پیام نہ دو" **ولا یخطب بعضکم علی خطبۃ اخیہ**" باہم منافست، رقابت اور نفرت پیدا ہوتی ہے لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ اس پیام میں لوگ دلچسپی لینے لگیں، اگر لڑکی کی طرف سے اس پیشکش کو رد کر دیا جائے یا اس کی طرف کوئی میلان ورجحان نہ ہو تو پیام دے سکتے ہیں۔ رشتہ کی پیشکش گو لڑکے اور لڑکی کسی طرف سے بھی ہو سکتی ہے لیکن بہتر ہے کہ لڑکے کی طرف سے ہو، اکثر ازواج مطہرات کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نکاح کی پیش کش کی تھی، صحابہ کا عمل بالعموم اسی پر تھا، گو ایک آدھ مثال اس کے خلاف بھی ملتی ہے، اس لئے کہ لڑکی کی طرف سے نکاح کی پیش کش بہ ظاہر حیا کے خلاف محسوس ہوتی ہے اور مردوں کی طرف سے بیوی کی تلاش اس کی قوامیت اور ازدواجی زندگی میں اس کی ایک گونہ برتری کے عین مطابق ہے۔

انتخاب رشتہ کا معیار

مرد و عورت اور اولیاء رشتہ کے انتخاب و ترجیح میں کس معیار کو ملحوظ رکھیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی واضح فرما دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب ایسے رشتے آجائیں جن کی دینی و اخلاقی حالت سے تم مطمئن ہو" **من ترضون دینہ وخلقہ**" تو قبول کر لو کہ ایسا نہ کرو گے تو فتنہ وفساد پیدا ہوگا[2] ایک اور روایت میں ہے کہ عورتوں سے چار وجوہ کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے، 1 مال 2 حسب و خاندان 3 جمال 4 اور دین، ان میں دیندار سے شادی کر کے ازدواجی زندگی کی کامیابی حاصل کرو[1]

پس گو نکاح میں خوبصورتی اور طبیعت کے مطابق کسی اور مرغوب وصف کو بھی

w مسلم عن صبرۃ الجھنی: ۵۴۱/۱

معیار بنایا جا سکتا ہے جس کی طرف قرآن نے ﴿ماطاب لکم من النساء﴾ (جو عورت تجھے پسند ہو) کے لفظ سے اشارہ کیا ہے لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکے کی دینداری اور اخلاق ہی کو معیار بنایا جائے، علامہ کاسانی کا بیان ہے:

"وعندنا الافضل اعتبار الدین والاقتصار علیہ[2]

D: ''ہمارے نزدیک دین کا اعتبار اور صرف اسی پر اکتفاء کرنا افضل ہے۔''

کفاءت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض روایات میں نکاح میں کفاءت یعنی برابری اور ہمسری کا لحاظ کرنے کو کہا گیا ہے، عام طور پر اس سلسلہ میں جو حدیثیں نقل کی جاتی ہیں وہ ضعیف اور نامعتبر ہیں۔ تاہم فقہاء نے مجموعی طور پر نو امور میں کفاءت کا اعتبار کیا ہے: 1 نسب وخاندان 2 آزادی وغلامی 3 خاندانی مسلمان یا نومسلم ہونا 4 دیانت وتقویٰ 5 مال اور معاشی سطح 6 حسب 7 پیشہ و ذریعہ معاش 8 جسمانی عیوب سے محفوظ ہونا 9 اور عقل وفہم ـــــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل میں جو چیز قابل توجہ ہے وہ محض دین واخلاق ہے۔ خاندان اور برادری کے لحاظ میں غلو اسلام کی شان مساوات اور مذاق اخوت کے خلاف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے تم سے جاہلیت کا امتیاز اور آباء واجداد پر فخر کو ختم کر دیا ہے، انسان یا تو مؤمن تقی ہے یا فاجر شقی۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے خود اپنے عمل کے ذریعہ اس کی مثال پیش فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چچا زاد بہن حضرت زینب کا نکاح اپنے غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا[2] انہی

e مجمع الزوائد: ۲۶۵/۴، باب نکاح المتعہ

r مجمع الزوائد: بحوالہ طبرانی عن سعید بن جبیر

حضرت زید کے لڑکے حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نکاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت قیس سے فرمایا جو قریشی خاتون تھیں[3] حضرت ضباعہ بنت زہیر بن عبدالمطلب کا نکاح مقداد بن اسود سے فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ مقداد اور زید کا نکاح ہم نے اس طرح اس لئے کیا ہے کہ اخلاق شرافت کا معیار بن جائے "لیکون اشرفکم عند اللّٰہ احسنکم اخلاقاً"[4] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حیات میں اس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں ——

اس لئے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، رہن سہن، دین، حالت، دیانت اور اخلاق یہی چیزیں ہیں جو رشتہ کے انتخاب کے وقت ملحوظ رکھے جانے کے لائق ہیں، یوں انسانی طبیعتوں کے فرق کو سامنے رکھتے ہوئے خاندان، ذریعۂ معاش، معاشی سطح اور اسلام میں قدامت وجدت وغیرہ کو بھی ملحوظ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے[5]

خطبۂ نکاح

اسلام سے پہلے بھی زمانۂ جاہلیت میں نکاح سے پہلے خطبے دیئے جاتے تھے لیکن وہ خطبے فخر وتعلّی اور نسبی تفاخر اور اپنے آباء واجداد کی مبالغہ آمیز مدح سرائی کا مجموعہ ہوتا تھا، اسلام جس کے نزدیک سوائے دین کے کوئی چیز وجہ تفاخر نہیں اور جو انسان سے زندگی کے ہر عمل میں تواضع وفروتنی اور عجز وانکسار کا طالب اور خدا کی حمد وثنا اور اس سے دعا والتجا کا معلم ہے، اس نے خطبۂ نکاح کو تو باقی رکھا لیکن اس کی کیفیت اور مضامین یکسر بدل کر رکھ دیئے اور اس کی جگہ ایسا خطبہ مقرر کیا جس میں خدا کی حمد وثنا ہو، توحید ورسالت کا اعتراف واقرار ہو، قرآن کی وہ آیات ہوں جن کا مقصد زندگی کے

---

t اکثر شارحین حدیث نے اس کو نقل کیا ہے۔

q لعن اللّٰہ المحلل والمحلل لہ، ابوداؤد، باب التحلیل: ۲۸۴/۱

w دیکھئے شرح مھذب: ۲۶۹/۱۶، ھدایہ: جلد ۲

e المغنی: ۱۳۸/۷

C17

معاملات سے متعلق تنبیہ اور رہبری ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس موقعہ کے لئے جو خطبہ منقول ہے وہ یہ ہے:

"الحمد للّٰہ نحمدہ و نستعینہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ۔
اتقوا اللّٰہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون، اتقوا اللّٰہ الذی تساء لون بہ والارحام ان اللّٰہ کان علیکم رقیبا،
اتقوا اللّٰہ وقولوا قولا سدیداً یصلح لکم اعمالکم ویغفرلکم ذنوبکم ومن یطع اللّٰہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیماً۔" 1

D: "تمام تعریف اللہ ہی کے لئے ہے، ہم اسی کی حمد بیان کرتے ہیں اور اسی سے مدد چاہتے ہیں اور ہم اپنے برے اعمال اور نفس کے شرور سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں جسے خدا رہ یاب کردے، اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے خدا گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے بندے اور رسول ہیں۔ اللہ سے ڈرو جو اس کے ڈرنے کا حق ہے اور جان نہ دینا بجز اس کے کہ تم مسلم ہو، اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی (تقویٰ اختیار کرو) بے شک اللہ

q بقرہ، آیت: ۲۳۲ — w بخاری جلد ۲ — e مشکوٰۃ: ۲۹۷/۲

تمہارے اوپر نگراں ہے، وہ تمہارے اعمال کی اصلاح کرتا ہے اور تمہارے گناہوں کو معاف کرتا ہے اور جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے وہی کامیاب وفلاح یاب ہے۔‘‘

اس کو عام طور پر حدیث میں ’’خطبة الحاجة‘‘ ’’تشهد الحاجة‘‘ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، منشا یہ ہے کہ ہر ضرورت کے موقع پر یہ خطبہ پڑھا جا سکتا ہے، لیکن بیہقی کی ایک روایت میں نکاح کا صراحت سے ذکر موجود ہے ’’اذا اراد احدكم ان يخطب لحاجة من النكاح او غيره[1] الخ‘‘ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خصوصیت سے نکاح کے موقع پر یہ خطبہ دیا جانا چاہئے، سلف کا تبرکاً مذکورہ آیات کے بعد نکاح سے متعلق چند حدیثیں اور دعائیہ کلمات بھی پڑھے جانے کا معمول ہے۔

مستحبات وآداب

نکاح کے مستحبات وآداب میں سے یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ’’اعلنوا هذا النكاح‘‘ یہ بھی مسنون ہے کہ نکاح مسجد میں کیا جائے، ارشاد نبوی ہے: ’’واجعلوه في المساجد[2]‘‘ گو اسلام میں کوئی وقت منحوس نہیں لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح اور یکجائی دونوں شوال کے مہینہ میں ہوئی اس لئے بعض اہل علم نے شوال میں نکاح کرنے کو مستحب قرار دیا ہے[1] بعض علاقوں میں لوگ محرم، صفر، ذوقعدہ کے مہینوں کو نکاح کے لئے منحوس اور نامناسب جانتے ہیں یہ قطعاً اسلامی تعلیمات کے خلاف اور اسلامی تصورات کے مغائر ہے۔ اہل علم نے یہ بھی لکھا ہے کہ نکاح کے لئے بہتر اور مستحب دن جمعہ کا ہے[2]

r فرقان، آیت: ۵۴ t فرقان، آیت: ۵۴
q روم، آیت: ۲۱ w بقرہ، آیت: ۱۸۷

کھجور لٹانا

مجلس نکاح میں کھجور اور مصری وغیرہ کا لٹانا ہمارے علاقوں میں مروج ہے اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ فی نفسہ کھجور کا حاضرین کے درمیان لٹانا اور حاضرین کا لوٹنا حلال ومباح ہے اور اس پر اکل حرام کا اطلاق نہیں ہوگا لیکن چونکہ اس لوٹنے میں باہم مزاحمت اور مخاصمت کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، اس لئے امام مالک امام شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام احمد اس کو منع کرتے ہیں، امام ابوحنیفہ اور بعض اہل علم کے نزدیک اس میں کوئی کراہت نہیں، امام احمد کی بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔

جو لوگ جواز کے قائل ہیں ان کے پیش نظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ یا چھ اونٹنیوں کا نحر فرمایا اور فرمایا کہ جو چاہے اس میں سے کاٹ لے، ”من شاء اقتطع [illegible] لٹائی ہوئی چیز میں سے لوٹنے کی اجازت بظاہر ایک ہی درجہ رکھتی ہے۔[3] بعض اہل علم نے اس کے جواز پر ایک انصاری کے واقعۂ نکاح سے استدلال کیا ہے جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میوے لٹائے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس روایت سے استدلال قرین انصاف نہیں کیوں کہ اس میں بشر بن ابراہیم نامی راوی آیا ہے جس کے بارے میں محدثین کا خیال ہے کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔[4]

تاہم اوپر جو باتیں مذکور ہوئیں وہی اس کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں اور تجربہ یہ ہے کہ ایسی تقریبات میں مزاحمت اور مخاصمت اور باہم نزاع کی سی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، محض خوشی کا اظہار مقصود ہوتا ہے، فتاویٰ عالمگیری میں بھی اس موقعہ پر میٹھی چیز یا درہم وغیرہ لٹانے کا جواز نقل کیا گیا ہے۔[1] ہاں اگر کہیں اس کی وجہ سے مجلس میں بدتہذیبی اور ناشائستگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو تقسیم کر دینا بہتر ہے۔

---

q ابوداؤد عن جابر بن عبداللہ، باب الرجل ینظر الی المراۃ وھو یرید تزوجھا: ۲/۲۸۹

B

مبارک باد

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ نکاح کے بعد مبارک باد کے الفاظ کس طرح کہے جائیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کے بعد یوں مبارک باد دیتے:

"بارک اللّٰہ وبارک علیک وجمع بینکما فی خیر[2]۔"

D: ''اللہ برکت دے، تم پر برکت فرمائے اور تم دونوں کو خیر پر جمع کرے۔''

حضرت عقیل بن ابی طالب کی روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں:

"بارک اللّٰہ فیک وبارک لک فیھا[3]۔"

D: ''اللہ تعالیٰ تمہاری ذات کو اور تمہارے لئے اس کی ذات کو مبارک کرے۔''

دف وغیرہ

نکاح میں چوں کہ اعلان اور اظہار مقصود ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دف بجانے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، ارشاد ہے:"واضربوا علیہ بالـ[4] بلکہ عید کے موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم عمر بچیوں کو دف بجانے سے منع نہیں فرمایا[1]۔ بعد کو چل کر حالات زمانہ کو سامنے رکھتے ہوئے گو دف جائز ہونے اور نہ ہونے میں اہل علم کی رائیں مختلف ہوگئیں[2] لیکن زیادہ تر فقہاء کا رجحان اس کے جائز ہونے کی طرف ہے، یہی امام ابو یوسف سے منقول ہے[3] اور اسی طرح کی بات حنابلہ وغیرہ نے لکھی ہے[4]۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ گانا بجانا، مزامیر کا استعمال، تالیاں، طبلے، عورتوں کا برسر محفل پڑھنا، یہ قبیح رسمیں جو ہمارے یہاں رائج

q ابوداؤد عن جابر بن عبداللّٰہ، باب الرجل ینظر الی المراۃ وھو یرید تزوجھا: ۲۸۹/۲

ہوگئی ہیں، قطعاً ناجائز اور حرام ہیں اور فی زمانہ ان غیر شرعی رسوم کے سد باب کے لئے دف کو بھی ممنوع قرار دینا ضروری ہے۔

دلہن کو رخصت کرنا

نکاح کے بعد عورتوں کا لڑکی کو سنوارنا اور شوہر کے ہاں پہنچانا یا رخصت کرنا جس کو ''زفاف'' کہا جاتا ہے، جائز ہے۔ سیدنا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک روایت میں اس کا ذکر موجود ہے۔[5] اور فقہاء نے بھی اس کو جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ کوئی مفسدۂ دینی نہ ہو۔[6] ـــــ لیکن عورتوں کا ایسا اجتماع جس میں بے پردگی اور خلاف شریعت باتوں کا ارتکاب ہوتا ہو، چوں کہ دینی مفسدہ سے خالی نہیں، اس لئے جائز نہ ہوگا۔

ولیمہ

نکاح چوں کہ ایک تقاضہ انسانی کی تکمیل کا حلال و جائز ذریعہ ہے، اس لئے شریعت نے اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر و اظہار کو پسند کیا ہے، اسی تشہیر اور اظہار کا ایک طریقہ ولیمہ بھی ہے جس میں دعوت عام کے ذریعہ مرد و زن کے درمیان تعلق ازدواجی کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ولیمے کئے ہیں اور صحابہ کو بھی اس کی ترغیب دی ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکاح کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی ولیمہ کے لئے تاکید فرمائی اور فرمایا "**اولم ولو بشاة**"۔[1] ـــــ لہٰذا ولیمہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سنتوں میں ہے۔[2]

ولیمہ میں کس طرح کے کھانے بنائے جائیں؟ یہ دعوت ولیمہ دینے والے کی

w حاشیہ ابوداؤد: ۲۸۹/۲، مطبوعہ دھلی
e ردالمحتار: ۲۳۷/۵، باب الحظر والاباحۃ
r المغنی: ۷۹/۷ t مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح

B

معاشی سطح پر موقوف ہے، چنانچہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں حضرت زینب کے نکاح میں بکری ذبح کر کے ولیمہ فرمایا[3] وہیں بعض ازواج مطہرات کا ولیمہ محض تھوڑی سی جو کے ذریعہ فرمایا ہے "بمدین من شعیر[4]" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ولیمہ کا تعلق آدمی کی معاشی حیثیت اور سطح سے ہے۔ ولیمہ میں بہت زیادہ تکلّفات اور حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرنا شریعت میں پسندیدہ نہیں۔

ولیمہ بیوی کے ساتھ تعلق ازدواجی کے بعد ہونا چاہئے۔ ایک روایت میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت زینب کے ساتھ شب عروسی ہوگئی تب آپ نے قوم کو بلایا اوران حضرات نے کھانا تناول فرمایا۔[5] حدیثوں میں دعوت ولیمہ قبول کرنے ک بڑی تاکید آئی ہے، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب کسی کو دعوت ولیمہ دی جائے تو اسے ضرور آنا چاہئے۔[6] بعض روایات میں دعوت ولیمہ قبول نہ کرنے کو نافرمانی اور معصیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔[7] علامہ ابن عبدالبر نے امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی وغیرہ سے دعوت ولیمہ کے قبول کرنے کا واجب ہونا نقل کیا ہے، بشرطیکہ متعین طور پر کسی شخص کو دعوت دی جائے۔[8] لیکن صحیح بات یہی ہے کہ اس دعوت کا قبول کرنا بھی مسنون ہے البتہ شریعت میں اس کی بڑی تاکید واہتمام ہے "وقالت العامة هي السنة[1]" غیر مسلم دعوت دے اوراپنے یہاں تقریب نکاح میں بلائے تو اس میں بھی شرکت جائز ہے، اگر دعوت ولیمہ میں منکرات شرعیہ کا ارتکاب ہو تو اس میں شریک نہیں ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں اصول وہی ہیں جو عام دعوتوں کے سلسلہ میں ہیں اوران کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔[2]

---

q بخاری: ۲/۷۷۳، کتاب النکاح   w ترمذی، کتاب النکاح: ۱/۲۰۷

q ترمذی عن ابی هریرہ: ۱/۲۰۷، باب ماجاء فی من ترضون دینه

w بدائع الصنائع: ۲/۳۱۷

q ابوداؤد، باب التفاخر بالانساب   w بیهقی: ۷/۱۳۹

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلے دن ولیمہ کو حق، دوسرے دن درست اور تیسرے دن ریاکاری قرار دیا ہے۔[3] اس لئے مسلسل دو تین دنوں تک یا اس سے زیادہ ولیمہ کا اہتمام اور دعوت کا سلسلہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہے، ہاں اگر تفاخر کا جذبہ نہ ہو، لوگ زیادہ ہوں اور ایک آدمی ہی بار شریک طعام ہو، دوسرے اور تیسرے دن کے مدعوئین الگ ہوں تو ایک سے زیادہ دنوں بھی ولیمہ کا اہتمام جائز ہے، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیان کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ سے نکاح کے موقعہ پر تین دنوں تک ولیمہ فرمایا ہے[4] بلکہ حفصہ بنت سیرین ناقل ہیں کہ ان کے والد نے تو سات دنوں تک ان کا ولیمہ کیا اور مختلف صحابہ کو مختلف دنوں میں دعوت دی۔[5] ہمارے فقہاء نے عام طور پر یکجائی کے بعد اس دن یا دوسرے دن دعوت ولیمہ منعقد کرنے کو کہا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے بعد ولیمہ نہیں ہوگا۔[6]

مہر

نکاح کہ وجہ سے عصمت انسانی کے احترام کے اظہار کے لئے شریعت نے شوہر پر بیوی کا ایک خاص مالی حق رکھا ہے جس کو مہر کہا جاتا ہے، حدیث میں بعض مواقع پر ''صداق'' یا کسی اور نام سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، ارشاد خداوندی ہے کہ عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کر دیئے جائیں، '' s t wvu''[1] بلکہ اسی مہر کے ذریعہ ایک خاص معاہدہ کے تحت عورت کی عصمت مرد کے لئے حلال ہوتی ہے، '' . /0 1 32 4 5''[2] مرد کو عورت پر ازدواجی زندگی میں جو ایک گونہ بالادستی حاصل ہے اس کی وجہ جہاں مرد کی بعض فطری خصوصیات ہیں وہیں یہ بھی ہے کہ مہر اور دوسری مالی ذمہ داریاں مردوں کے سر رکھی گئی

e بخاری، مسلم r بیھقی: ۱۳۵/۷

t مسئلہ کفاءت کی شرعی حیثیت پر تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی تحریر ''مسئلہ کفاءت پر ایک نظر'' جو ''جدید فقہی مسائل حصہ دوم'' کے تازہ ایڈیشن میں شریک اشاعت ہے۔

ہیں۔[3]

مہر کی مقدار

قرآن مجید نے اس بات کی توصراحت کردی ہے کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ کوئی مقدار متعین نہیں۔[4] حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ثابت ہے کہ آپ نے ایک خاتون سے نکاح کیا تو اسے سو باندیاں بھیجیں اور ہر باندی کے ساتھ ایک ہزار درہم۔[5] مہر کی کم سے کم مقدار کے سلسلہ میں فقہاء کی رائیں مختلف ہیں، بعض فقہاء کے نزدیک کم سے کم کوئی مقدار مقرر نہیں۔[6] بعضوں کا خیال ہے کہ کم سے کم مہر کی مقدار ½ دینار (تقریباً ½۴ ماشہ سونا) ہونا چاہئے۔[7] امام ابوحنیفہ کے نزدیک مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم ہے۔[8] ۲ تولہ ½۷ ماشہ چاندی کے مساوی ہوتا ہے —— ان تمام ہی فقہاء کے پاس اپنی آراء کے لئے مناسب دلیلیں موجود ہیں۔ احناف کے پیش نظر وہ روایت ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ مہر دس درہم سے کم نہ ہونا چاہئے۔ "لا مهر اقل من عشرة دراهم۔"[۹]

مہر کی تعیین میں اعتدال ہونا چاہئے، نہ مہر اتنا معمولی ہو کہ اس کی کوئی قدر باقی نہ رہے، نہ اتنا زیادہ ہو کہ اس کی ادائیگی دشوار ہو جائے اور مرد کی معاشی حالت اس کی متحمل نہ ہو، سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مہر کی کثرت میں غلو کو بہت ناپسند فرمایا ہے۔ اور فرمایا کہ مہر کی کثرت اگر فخر و شرافت کی بات ہوتی تو ازواج مطہرات کا

---

q مجمع الزوائد: ۲۸۸/۴
q نیل الاوطار: ۳۹/۶
w ترمذی: ۱۳۸/۱، وقال هذا حديث حسن غريب
q احیاء علوم الدین: ۳۶/۲ w فتح القدیر: ۱۰۲/۳
e المغنی: ۲۱۹/۷ r مجمع الزوائد: ۲۹۰/۴
q فتاوی عالمگیری: ۳۰۵/۵ w ترمذی: ۱۳۸/۲

مہر زیادہ ہوتا[2] ازواج مطہرات کا مہر بالعموم پانچ سو درہم تھا[3] اور صاحبزادی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ فاطمہ کا مہر چار سو اسی (۴۸۰) درہم [4] ـــــ پانچ سو درہم موجودہ ۱۰ گرام کے تولہ کے حساب سے ڈیڑھ کلو ۳۰ گرام اور نو سو ملی گرام چاندی ہوتا ہے ـــــ ظاہر ہے کہ اس مقدار میں مہر کی تعیین زیادہ بہتر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور حضرات صحابیات کے مہر اسی طرح چاندی یا سونے سے مقرر کئے جاتے تھے، پس روپیہ یا کسی اور شکل میں مہر مقرر کرنے کی بجائے سونے چاندی کی صورت میں مہر کی تعیین سنت سے قریب بھی ہے اور عورت کے لئے قرین انصاف بھی کہ سکوں کی مقدار دن بہ دن گھٹتی جاتی ہے اور سکوں میں مقرر کیا ہوا مہر ایک عرصہ بعد اپنی قدر کھو دیتا ہے۔

مہر کے احکام

اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا گیا تب بھی نکاح درست ہو جاتا ہے جیسا کہ خود قرآن کے بیان سے ظاہر ہے[5] لیکن مستحب طریقہ یہ ہے کہ عقد کے وقت ہی مہر مقرر کر لیا جائے[1] مختلف عورتوں کے لئے مہر کے احکام اس طرح ہیں:

1 نکاح کے وقت مہر مقرر ہو چکا ہے اور عورت کے ساتھ تنہائی بھی ہو چکی ہے تو پورا مقررہ مہر واجب ہوگا[2]

2 نکاح کے وقت مہر مقرر ہو چکا ہے مگر یکجائی سے پہلے ہی علیحدگی ہوگئی تو نصف مہر مقررہ واجب ہوگا[3]

3 نکاح کے وقت مہر مقرر نہیں ہوا تھا اور شوہر کی بیوی کے ساتھ یکجائی بھی ہو چکی،

---

e نیل الاوطار: ۴۰/۶ r ترمذی: ۱۳۸/۱

q بخاری و مسلم عن عائشہ رضی اللہ تعالٰی عنہا

w البحر الرائق: ۴۲۹/۲ e عالمگیری: ۳۵۲/۵ r المغنی: ۲۱۸/۷

t بخاری: ۷۷۵/۲ y درمختار

اب مہر مثل واجب ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک عورت کے حق میں اس طرح کا فیصلہ فرمایا اور حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تائید کی اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بروع بنت واشق کے بارے میں یہی فیصلہ فرمایا تھا۔[4] ـــــ مہر مثل سے مراد اس عورت کے خاندار کی عورتوں کا عمومی مہر ہے جو عمر، تمول، خوبصورتی، عقل و اخلاق اور کنوار پن میں ہمسر ہو۔[5]

4 اگر مہر بھی مقرر نہ ہوا تھا اور مرد و زن کی یکجائی بھی نہ ہوئی کہ نوبت طلاق کی آگئی تو متعہ واجب ہوگا متعہ کی مقدار متعین نہیں بلکہ مرد کی حیثیت اور گنجائش پر منحصر ہے، "علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ۔[6]

متعہ کی کم سے کم مقدار کیا ہو؟ اس سلسلہ میں سلف سے مختلف رائیں منقول ہیں اور یہ سب رائے اور اجتہاد پر مبنی ہیں۔ ابن عمر کہتے ہیں کہ کم از کم تیس درہم یا اس مالیت کا کوئی اور سامان دے دیا جائے۔ عبداللہ بن عباس کی رائے تھی کہ ایک خادم، اس سے کم تر درجہ یہ ہے کہ ایک لباس اور آخری درجہ ہے کہ تھوڑا سا خرچ دے دیا جائے یہی رائے حسن بصری اور مالک کی بھی ہے، حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیوی کو بطور متاع بیس زقاق (اس زمانے کے پیمانے کا نام) شہد دیا تھا، قاضی شریح نے اپنی مطلقہ کو بطور متاع پانچ سو درہم دیئے تھے، امام ابوحنیفہ کے استاذ حماد کی رائے تھی کہ عورت کے خاندانی مہر کی نصف رقم دے دی جائے۔[1] تاہم احناف کے یہاں قول مشہور یہی ہے کہ متاع کی کم سے کم مقدار ایک جوڑا کپڑا ہے۔[2] ''متعہ'' کی زیادہ سے زیادہ کوئی مقدار مقرر نہیں، وہ عورت جس سے مرد لذت اندوز ہو چکا ہو، مہر کے ساتھ ساتھ اس کو بھی ''متعہ'' دینا مستحب ہے۔[3] اور یہ بھی قرآن مجید کے اس منشاء کی

q بخاری: ۲/۲۲۲　w المغنی: ۲۱۲/۷　e بخاری: ۲/۲۲۲
r بخاری: ۲/۲۲۲　t بخاری: ۲/۲۲۲　y بخاری عن ابن عمر
u مسلم، باب زواج زینت بنت جحش ونزول الحجاب واثبات الولیمۃ: ص۴۶۲

تکمیل کا ذریعہ ہے کہ جب عورت سے جدائی ہو تو اس وقت بھی حسن سلوک کا دامن نہ چھوٹے، "فامساک بمعروف او تسریح باحسان۔" 4

ادائیگی مہر کی اہمیت

مہر کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، قرآن نے اس کو مرد کے فرائض میں شمار کیا ہے "فاتوھن اجورھن فریضۃ" حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر پورا مہر پیشگی ادا نہ کر سکے تو مہر کا کچھ نہ کچھ حصہ ہم بستری سے پہلے ادا کر دیا جائے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سیدنا حضرت علی کو وصیت فرمائی:

"یا علی لا تدخل علی اھلک حتی تقدم لھم شیئا۔"5

D: ''اے علی! اپنی بیوی سے ملنے سے پہلے ان کو کچھ دے دو۔''

یہ تصور کہ مہر علاحدگی کے موقع ہی پر ادا ہو یا شوہر کی موت کے بعد ہی اس کے ترکہ میں سے ادا کیا جائے، نہایت غیر اسلامی اور جاہلانہ تصور ہے، مہر بھی دوسرے واجبات اور دیون کی طرح ایک دین ہے جس سے جلد از جلد سبکبار ہو جانا چاہئے۔

افسوس کہ ہمارے معاشرہ میں بہت سے نوجوان مہر کی تعیین کو محض ایک رسمی عمل سمجھتے ہیں اور اس کی ادائیگی کی نیت تک نہیں رکھتے، یہ سخت گناہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مہر مقرر کیا اور اس کی ادائیگی کا ارادہ نہیں ہے تو وہ زانی ہے، بعض روایات میں ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا کے حضور ایک زنا کار کی حیثیت سے پیش ہوگا۔1 قرآن مجید کہتا ہے کہ اگر مہر دے بھی چکا ہے اور نوبت علیحدگی کی آئے تو

---

i المغنی: ۷/۲۱۳

q عالمگیری: ۵/۳۴۳ w درمختار، باب الحظر والاباحۃ

e ابوداؤد: ۲/۱۲۰ r دیکھئے فتح الباری: ۹/۲۱۰ t فتح الباری: ۹/۲۱۰

y لا بأس بان یدعو یومئذ من الغد وبعد الغد ثم ینقطع العرس والولیمۃ، ھندیہ:

ہرگز عورت سے اس کو واپس لینے کے حیلہ بہانے نہ کرے۔[2] ـــــ کاش یہ تنبیہات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات ایسے خدا سے بے خوف لوگوں کے اندر آتش احساس کو سلگانے اور شعور کو جگانے میں ممد ومعاون ثابت ہوں۔ "وباللّٰہ التوفیق ویھدی السبیل"

رسم جہیز

جہیز کی جو بدبختانہ رسم اس وقت ہمارے معاشرہ میں نکاح کا جز و لازم بن چکی ہے وہ خالصۃً نامنصفانہ بھی ہے، اور غیر اسلامی بھی، شریعت نے نکاح کے باب میں اخراجات کی تمام تر ذمہ داری مردوں پر رکھی ہے اور اسی کو ازدواجی مسائل میں مردوں کی قوامیت کی اساس قرار دیا گیا ہے۔

*) (' & % $ # " !

[3] / . - , +

D: ''مرد عورتوں کے نگراں ہیں اس لئے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے اور اس لئے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے۔''

اسی لئے مہر، نفقہ، لباس و پوشاک، دوا، علاج اور دوسری ضروریات ولیمہ، مہر نیز بچوں کی کفالت ساری ذمہ داری مردوں کے سر پر رکھی گئی ہیں۔ اسی لیے کتب فقہ میں یہ مسئلہ تو ملتا ہے کہ لڑکی کے اولیاء لڑکوں سے نکاح کے موقعہ پر جس زائد رقم کا مطالبہ کرتے ہیں وہ جائز ہے یا نہیں؟ وہ رشوت کے حکم میں ہے یا نہیں؟ لیکن لڑکوں کی طرف سے جہیز، گھوڑے جوڑے اور تلک کا مطالبہ جائز ہے یا ناجائز؟ غالباً اس کا ذکر نہیں ملتا کہ فقہاء کی نگاہ میں مردوں کی طرف سے ایسی بے شرمی اور مقام مردانہ کے

۳۹۳/۵

q نساء، آیت: ۹ w نساء، آیت: ۳۹

خلاف دریوزہ گری کا تصور تک نہیں تھا۔

یہ یوں بھی غلط ہے کہ اپنی اولاد میں مساوات ضروری ہے اور لڑکیوں کو رقم خطیر اور کثیر اشیاء مجہوزہ کا دینا اور لڑکوں کو اس سے محروم رکھنا صریح ناانصافی اور عدل کے خلاف ہے اور دراصل یہ رسم برادران وطن سے مسلمانوں میں آئی ہے۔ ہندو مذہب میں چوں کہ عورتوں کے لئے میراث کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ رشتۂ نکاح کے ساتھ ہی عورت کا تعلق اپنے خاندان سے کٹ جاتا ہے، اس لئے لوگ لڑکی رخصت کرتے ہوئے کچھ دے دلا کر بھیجتے تھے۔ اسلام میں نکاح کے بعد بھی عورت کا رشتہ اپنے خاندان سے باقی رہتا ہے اور وہ مستحق میراث بھی رہتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت فاطمہ کو کچھ ضروری سامان دینے کا ذکر بعض روایات میں آیا ہے:

”جهز رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لفاطمة في خميل وقربة ووسادة حشوها اذخر۔“ [1]

D: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی فاطمہ کو ایک گدا، گھڑا، اور ایک تکیہ جس میں اذخر (گھاس) بھری گئی تھی، بطور جہیز عطا فرمایا۔“

لیکن اس پر مروجہ رسم جہیز کا اطلاق کئی وجوہ سے غلط ہے:

اول تو غالباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خود اس زرہ کی قیمت سے بنوائے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے موقع نکاح کے لئے فروخت کی تھی۔

دوسرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت نہ صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے باپ کی تھی بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھی سرپرست اور پرورش

e نساء، آیت: ۳۴ r نساء، آیت: ۲۰

کنندہ کی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ان کی بھی پرورش فرمائی تھی ــــــ صورت حال یہ تھی کہ حضرت علی کا کوئی مکان تھا اور نہ مکان کے لئے مطلوبہ اسباب و سامان۔ ان حالات میں زوجین کے سرپرست اور مربی ہونے کی حیثیت سے ایک نئے گھر بسانے کے لئے جو سامان مطلوب تھا اس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظم فرما دیا، یہ حضرت فاطمہ کا جہیز نہیں تھا بلکہ طرفین کے مربی اور سرپرست ہونے کی حیثیت سے ایک نئی خانہ آبادی کا انتظام تھا ــــــ ایسا سمجھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ حضرت فاطمہ کے علاوہ اور بھی دوسری صاحبزادیاں تھیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کچھ دیا جانا ثابت نہیں۔ پس اگر حضرت فاطمہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جہیز دینا تسلیم کیا جائے تو یہ خلاف عدل محسوس ہوتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سے بعید ہے۔

صنفی تعلق

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں زندگی کے تمام گوشوں میں انسانیت کے لئے روشنی چھوڑی اور اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعہ ان کی رہبری فرمائی، وہیں جلوت کی طرح خلوت کو بھی اپنے نور ہدایت سے تاریک اور محروم نہ رہنے دیا اور ازدواجی زندگی کے اس صنفی عمل کے لئے بھی مہذب و شائستہ اصول و قواعد مقرر فرمائے ــــــ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماع سے پہلے یہ کلمات پڑھے جائیں:

"بسم اللہ اللھم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان ما رزقتنا"

D: ''اللہ کے نام سے، اے اللہ شیطان سے ہماری حفاظت فرما اور ہماری اولاد کی بھی۔''

فرمایا کہ اس کے بعد اس وطی سے حمل ٹھہر جائے تو مولود شیطان کے شر سے محفوظ رہے گا۔

B

گویا اس حال میں بھی خدا کی ذات کا استحضار ہو، اولاد کی طلب ہو اور شیطان کی طرف سے نفور ہو، محض اشتہاءِ نفس کی تکمیل کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔

آداب

جماع اس طرح نہ ہو کہ قبلہ کے استقبال کی نوبت ہو، چنانچہ عمرو بن حزم اور عطاء نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے "لا یستقبل القبلة حال الجماع" وقت زیادہ گفتگو بھی نہ کی جائے "ویکره الاکثار من الکلام" شرم وحیا اور غیرت کا تقاضہ بھی ہے۔ مکمل پردہ کی حالت ہو، نہ کوئی دیکھ سکے، نہ آواز کا احساس کر سکے، نہ بوس وکنار کے مرحلہ میں کسی کی نگاہ پڑنے پائے۔[1] خلوت کے راز دوسروں کے سامنے ظاہر بھی نہ کئے جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بدترین شخص وہ ہے جو اپنی بیوی کے پاس جائے اور ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو، پھر شوہر اس کے راز کا افشاء کر دے۔[2] امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کیفیت جماع، ایک دوسرے سے تلذذ کے طریقے اور عورت کی جانب سے ظاہر ہونے والے افعال یا اقوال کا دوسروں کے سامنے نقل کرنا حرام ہے۔[1]

یہ بات بھی مستحب ہے کہ جماع سے پہلی ودواعی جماع کے ذریعہ عورت کی اشتہا کو پوری طرح برانگیختہ کر لیا جائے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کا بوسہ لیتے اور ان کی زبان چوستے۔ جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاعبت سے پہلے جماع کو منع فرمایا۔ "نهى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن المواقعة قبل الملاعبة۔"[2]

یہ بھی ضروری ہے کہ زوجین جماع میں ایک دوسرے کی رعایت کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شوہر بیوی کو اس عمل کے لئے طلب کرے اور وہ آنے سے

---

t مجمع الزوائد: ۲۸۸/۴، باب الصداق، بحواله طبرانى عن ابن سيرين ورجاله رجال صحيح

انکار کردے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔[3] اسی طرح شوہروں کو حکم دیا کہ جب تک عورت میں بھی اس درجہ کی شہوت نہ جاگ جائے جیسی تمہاری ہے اس وقت تک جماع نہ کرو کہ ایسا نہ ہو کہ تم فارغ ہو چکو اور ابھی اس کی آگ فرو نہ پائے پھر اگر مرد کو فراغت ہو جائے تو بھی فوراً الگ نہ ہو جائے بلکہ عورت کو مزید موقع دے "فلا یعجلها حتی تقضی حاجتها"[4]۔ کثرت جماع اگر عورت کے لئے مضر ہو تو اس سے اِسی قدر ہم بستری کی جائے جو اس کے لئے قابل برداشت ہو "لو تضررت من کثرة جماعه لم تجز الزیادة علی قدر طاقتها۔"[5]

زوجین کا ایک دوسرے کے اعضاء تناسل اور شہوت انگیز حصوں کا مساس بھی جائز ہے، بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا گیا ہے کہ مجھے امید ہے کہ اس پر اجر دیا جائے گا۔ "ارجو ان یعطی الاجر"[1] مباشرت کے وقت بالکل بے لباس ہو جانا مناسب نہیں کہ غیرت وحیا کے خلاف ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ازدواجی ربط کے درمیان بالکل جانوروں کی طرح برہنہ نہ ہو جاؤ۔[2] البتہ یہ حکم اخلاقی ہے ورنہ زن وشوہر کے لئے ایک دوسرے کے پورے جسم کو دیکھنا جائز ہے بلکہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ لذت افزونی کے لئے اس موقع پر ایک دوسرے کی شرم گاہ دیکھی جائے۔[3] ابن عمر کا یہ قول روایت بالا کے خلاف نہیں، مباشرت کا اصل مقصود زوجین کو عفیف رکھنا ہے اگر کسی کے نفس کی تسکین اس کے بغیر نہیں ہو پاتی تو یقیناً اس کے لئے ایسا کرنا ہی بہتر ہوگا۔

---

y المغنی: ۱۹۱/۷ u ترمذی: ۲۱۱/۱ باب ماجاء فی مهور النساء

i بدائع الصنائع: ۲۷۵/۲

q الدرایة فی تخریج احادیث الهدایه: ۳۹۹/۲

w مجمع الزوائد: ۲۸۳/۴، باب الصداق

e مشکوٰۃ: ۲۷۷/۲ r مجمع الزوائد: ۲۸۳/۴

C18

خاص ہدایات

پھر انسانی فطرت مزاج وطبیعت اور مذاق وخواہش کے اختلاف کو پیش نظر رکھ کر کسی خاص طریقہ کی تحدید نہیں کی گئی بلکہ اس کو ہر انسان کے اپنے ذوق وچاہت کے حوالہ کر دیا گیا، ارشاد ہوا" µ ¶ ¸ ¹ º»4 یعنی بیوی جو تمہارے لئے توالد و تناسل کی کھیتی ہے اس سے جس طرح جنسی ملاپ کرنا چاہو کرو، کھڑے ہو کر، بیٹھ کر، لیٹ کر یا کسی اور صورت، سامنے سے یا پشت کی جانب سے یا کسی اور طریق سے[5] البتہ اس کے ساتھ چند ہدایتیں بھی کر دی ہیں:

اول یہ کہ اس کے لئے غیر فطری راہ اختیار نہ کی جائے، یعنی پائخانہ کے مقام کو اس کے لئے استعمال نہ کیا جائے، اس کی طرف ایک لطیف اشارہ خود قرآن مجید میں بھی موجود ہے، چنانچہ بیوی کو کھیتی قرار دیا گیا، ظاہر ہے، اولاد کی پیداوار اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ فطری مقام میں صحبت کی جائے۔ حدیثیں اس سلسلہ میں کثرت سے وارد ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی مرد یا عورت سے پیچھے کی راہ میں ملے، خدا اس کی طرف نظر رحمت نہ ڈالے گا[1] امام نووی کا بیان ہے کہ تمام قابل ذکر علماء متفق ہیں کہ عورت سے دبر میں وطی کرنا حرام ہے، وہ پاک ہو یا حیض کی حالت میں ہو[2] ـــــ بعض سلف صالحین سے جو دبر میں جماع کا جواز نقل کیا گیا ہے وہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے، سلف نے جس بات کو جائز رکھا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کی شرم گاہ ہی میں وطی کی جائے لیکن اس کے لئے ایسی ہیئت اختیار کی جائے کہ مرد عورت کی پشت کی طرف سے صحبت کرے، "فیطا من الدبر لا فی الدبر۔"

---

t نساء، آیت: ۴

q المغنی: ۱۹۰/۷ کتاب الصداق w نساء، آیت: ۲۰، ۲۱

e بقرہ، آیت: ۲۳۷ r ابوداؤد

t ھدایہ: ۳۳۲/۲ y بقرہ، آیت: ۲۳۶

دوسرے یہ کہ حیض کی حالت میں بیوی سے مباشرت نہ کی جائے، خود قرآن مجید میں اس کی ممانعت موجود ہے۔[4] احادیث بھی کثرت سے اس سلسلہ میں وارد ہیں[5] اور اس کی وجہ ظاہر ہے، حیض ایک طرح کی نجاست ہے، انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے بچائے نیز اس کے بڑے طبی نقصانات بھی ہیں جن کا طبی کتب میں ذکر کیا گیا ہے، جو حکم حیض کا ہے وہی نفاس یعنی ولادت کے بعد آنے والے خون کا بھی ہے ''حیض'' کی حالت میں عورت سے کس حد تک استمتاع جائز ہے اور کیا کچھ ممنوع ہے؟ اس کے لئے کتب فقہ ملاحظہ کی جائیں۔

عزل

جماع کی ایک صورت ''عزل'' ہے یعنی اس طرح مباشرت کی جائے کہ عورت کی شرم گاہ میں مادۂ منویہ کا انزال نہ ہونے پائے، اکثر فقہاء اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ روایات کا لب ولہجہ مختلف ہے، بعض سے حرمت، بعض سے اباحت اور بعض سے کراہت کے ساتھ جواز ظاہر ہوتا ہے اور زیادہ صحیح یہی ہے کہ کراہت سے خالی نہیں، شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے بلند پایہ عالم حدیث اور رمز شناس شریعت کا رجحان بھی اسی طرح طرف ہے۔[1]

کیفیت وہیئت

ہر چند کہ شارع نے جماع کے لئے کسی خاص کیفیت اور ہیئت کی تعیین نہیں کی ہے لیکن بعض اہل علم نے یہ ضرور بتانے کی کوشش کی ہے کہ کون سی ہیئت مستحسن اور کون

q البحر المحیط: ۲۳۳/۲، احکام القرآن للجصاص: ۵۳۵/۱
w تفسیر ماجدی: ۹۶/۱ مطبوعہ تاج کمپنی
e ھدایہ: ۳۲۶/۲ r بقرہ، آیت: ۲۲۹
t مجمع الزوائد: ۲۸۳/۵

سی ہیئت قبیح ہے؟ ابن قیم نے لکھا ہے کہ سب سے بہتر ہیئت یہ ہے کہ عورت نیچے ہو اور مرد اوپر۔ اور اس پر بڑا لطیف استدلال کیا ہے کہ حدیث میں ''عورت'' کو مرد کا فراش قرار دیا گیا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ عورت نیچے ہو اور قرآن نے مرد کو ''قوام'' بتایا ہے اور قوامیت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ مرد اوپر رہے۔ نیز قرآن نے زوجین کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے اس ہیئت میں عورت فراش اور مرد لحاف کی صورت میں ہوتا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ لباس کے ہیں۔ پھر اس میں طبی فوائد بھی زیادہ ہیں جب کہ سب سے قبیح صورت یہ ہے کہ مرد پشت کے بل لیٹا رہے اور عورت اوپر ہو کہ یہ مرد وعورت ہی نہیں بلکہ نر و مادہ کی طبعی شکل کے بھی خلاف ہے[2]

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اگر عورت مجبور نہ ہو اور مرد مباشرت کا مطالبہ کرے تو اس کے لئے تعمیل حکم ضروری ہے۔ اس میں بھی اختلاف نہیں کہ صحیح نیت کے ساتھ مرد عورت سے ہم بستر ہو تو باعث ثواب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صدقہ قرار دیا "مباضعتک اھلک صدقۃ" لیکن اشتہاء کے بغیر بیوی سے ملا جائے تو یہ باعث ثواب ہے یا نہیں؟ امام احمد فرماتے ہیں کہ اب بھی باعث ثواب ہے کہ حصول اولاد کی نیت تو ہے اور یہ نیت بھی نہ ہو تو یہ اس کی جوان بیوی کی عفت و پاکدامنی کی حفاظت میں مدد ومعاون تو ہے ہی[1]

جماع میں عورت کا حق

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آیا مرد پر عورت کے تقاضاء وطی کی صورت میں وطی کرنا شرعاً واجب ہے یا نہیں؟ احناف اور شوافع ہم خیال ہیں کہ ایک ہی بار جماع عورت کا حق ہے اگر ایک دفعہ مباشرت ہو گئی تو پھر عورت کا حق مباشرت ہمیشہ کے لئے ساقط ہو گیا۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جماع عورت کا حق ہے اور اگر مرد کو کوئی عذر

q مجمع الزوائد: ۴/۲۹۸ باب فیمن نوی ان لایؤدی صداق امراته
w النساء، آیت: ۲۰، ۲۱ e نساء، آیت: ۳۴

نہ ہوتو اس پر عورت کے تقاضۂ طبع کی تکمیل واجب ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔خلافت فاروقی کے زمانہ کا واقعہ مشہور ہے کہ حضرت کعب نے ایک ایسے ہی شوہر کو حکم فرمایا تھا کہ وہ ہر چوتھے دن ضرور اپنی بیوی سے وطی کیا کرے۔یہی تقاضۂ قیاس بھی ہے کہ ایسا نہ ہوتو عورت کے لئے ضرر شدید اور بے عفتی کا خطرہ ہے۔رہ گئی یہ بات کہ وطی صرف مرد کا حق ہے عورت کا حق نہیں تو یہ کسی طور صحیح نظر نہیں آتا کیوں کہ نکاح کے ذریعہ جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں زن وشوہر دونوں شریک ہیں یہی وجہ ہے کہ آزاد بیوی سے عزل کرنا ہوتو اس سے اجازت لینا ضروری ہے۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کم سے کم چار ماہ میں ایک دفعہ بیوی سے ہم بستری واجب ہے اور ابن منثور نے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ اگر حکم دیئے جانے کے باوجود چار ماہ تک نہ ملے تو زوجین میں تفریق کی جاسکتی ہے۔[3] اگر کسی عذر کی بنا پر شوہر سفر پر ہے تو عورت کا حق وطی ساقط ہو جائے گا، ہاں اگر مرد کے لئے گھر واپس ہونے میں کوئی بڑا مانع نہ ہوتو ٦/ ماہ گزرنے پر شوہر کو حکم دیا جائے گا کہ وہ گھر جائے اور اگر وہ انکار کرے تو زوجین میں تفریق کردی جائے۔[1]

ابدی محارم

شریعت اسلامی میں جہاں نکاح کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے، اس کو انبیاء کا طریقہ بتایا گیا ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے وہیں اس کے لئے مناسب حدیں اور شرطیں بھی مقرر کردی گئی ہیں اور ان شرطوں میں ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ عورت ان لوگوں میں سے نہ ہو جن سے نکاح کرنا حرام ہے،حرمت کی بنیادی طور پر دوصورتیں ہیں۔ 1 ابدی اور دوامی حرمت 2 وقتی اور عارضی حرمت۔

شریعت میں ابدی حرمت کے تین اسباب ہیں، 1 نسب 2 صہر 3 اور رضاعت۔

---

q نسائی عن علی

نسب سے مراد وہ نسبی رشتے ہیں جن کو قرآن مجید نے نکاح میں مانع قرار دیا ہے 1 اصولی رشتہ دار یعنی ماں اور باپ کا پورا سلسلۂ اجداد 2 فروعی رشتہ دار یعنی بیٹے اور بیٹی کا پورا سلسلۂ اولاد۔ باپ کے بھائی بہن، ماں کے بھائی بہن اور خود اپنے بھائی بہن [2]

''صہر'' سے مراد سسرالی رشتہ دار ہے، سسرالی رشتہ داروں میں شوہر اور بیوی کے اصول یعنی آبائی سلسلہ اور فروع یعنی اولادی سلسلہ حرام ہے، البتہ اس سلسلہ میں ایک تفصیل یہ ہے کہ کسی عورت سے نکاح کرنے کے ساتھ ہی اس کی ماں مرد پر حرام ہو جاتی ہے چاہے ہم بستری کی نوبت آئی ہو یا نہ آئی ہو، لیکن جس عورت سے نکاح کیا جائے اس کی بیٹی اسی وقت حرام ہوگی جب کہ اس عورت سے ہمبستری کر لے، اگر ہم بستری سے پہلے ہی بیوی سے علیحدگی ہوگئی تو اس کی بیٹی سے نکاح کرنا جائز ہوگا [3]

''رضاعت'' یعنی دودھ کی وجہ سے حرمت کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورت کے تمام اصول یعنی آبائی سلسلہ اور فروع یعنی اولادی سلسلہ نیز شوہر دودھ پینے والے پر حرام ہوں گے لیکن دودھ پینے والے کے دوسرے بھائی بہن اور رشتہ دار سے کوئی حرمت قائم نہ ہوگی، گویا دودھ پینے والے کی حرمت اس کی ذات اور اولاد ہی تک محدود ہوگی اور دودھ پلانے والی کی حرمت متعدی ہوگی اور پھیل جائے گی [1]

یہ تمام ہی احکام ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہ ہیں، دو نکات پر اختلاف ہے، اول یہ کہ احناف کے نزدیک کسی عورت کے ساتھ فطری راہ میں زنا یا بلا انزال دواعی زنا کا ارتکاب بھی حرمت مصاہرت کو ثابت کرتا ہے [2] اور اس کا سلسلہ مادری و فروعی وغیرہ اس زانی اور مرتکب کے لئے حرام قرار پاتا ہے، لیکن عام فقہاء کے نزدیک نکاح صحیح ہی اس کی حرمت کو ثابت کرتا ہے [3]

---

q المغنی: ۲۲۸/۷ آداب الجماع

دوسرا اختلاف اس بات میں ہے کہ دودھ کی کتنی مقدار سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی، احناف اور مالکیہ کے نزدیک ایک گھونٹ بھی حرمت کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک کم سے کم پانچ گھونٹ سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔[4] نیز راجح اور صحیح قول یہی ہے کہ رضاعت اور دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔[5] دوسال کے اندر بچہ دودھ پی لے تب ہی حرمت ثابت ہوگی اس کے بعد دودھ پئے تو حرمت پیدا نہیں ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ مدت ڈھائی سال ہے اور اس مدت کے اندر دودھ پینا حرمت رضاعت کا باعث ہے۔[6] ان رشتوں کے حرام قرار دینے کی حقیقی وجہ تو خدا ہی کو معلوم ہے البتہ چند باتیں ایسی ہیں جن کو عقل عام بھی سمجھ سکتی ہے۔

اول یہ کہ کچھ قریبی رشتے ایسے ہیں کہ فطرت انسانی خود ان سے ازدواجی اور جنسی تعلقات سے اباء کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لامذہب، خدا سے بے خوف اور محض اپنی عقل کو فیصل بنانے والے گروہ بھی ماں، بہن، بہو، بیٹی، ساس، پھوپھی، اور دادی نانی وغیرہ سے ازدواجی تعلقات کو شرف وحیا کے مغائر سمجھتے ہیں، پوری انسانی تاریخ میں چند ہی ایسے بے حیا اور فطرت کے باغی پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے حرمت وحجاب کی اس دیوار کو بھی گرانے میں کوئی عار محسوس نہیں کی ہے اور ایسے لوگوں کو کبھی یا کسی قوم میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ دوسرے اگر اتنے قریبی رشتہ داروں میں بھی حرمت کی یہ دیوار قائم نہ ہو، بھائی بہنوں، ماں بیٹیوں، سسر اور بہو وغیرہ کے درمیان بھی ازدواجی رشتہ جائز ہو تو کسی شوہر کے لئے اپنی بیوی کی عصمت وعفت اور پاکدامنی پر اعتبار اور اعتماد کرنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ حرمت ذہن کو اس طرح کے عمل کے بارے میں سوچنے بھی نہیں دیتی اور ایک فطری حجاب وحیا کو قائم رکھتی ہے جس سے باہمی

---

w مسلم: ۱/۵۶۴ باب تحریم افشاء سر المراۃ

q نووی علی مسلم: ۱/۵۶۴

اعتبار و اعتماد بھی باقی رہتا ہے۔ اگر چہ یہ حجاب نہ ہوتو دن رات ساتھ رہنے والے نوجوان بھائیوں اور بہنوں کے درمیان برائی سے مامون نہیں رہا جا سکتا۔

تیسرے جدید ماہرین طب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نہایت قریبی خاندانی رشتہ داروں کے درمیان ازدواجی تعلقات پیدا ہونے والی اولاد کے لئے انتہائی مضر اور شدید قسم کے امراض بالخصوص جنون اور عقلی توازن سے محرومی کا باعث ہوسکتے ہیں۔

عارضی محارم

کچھ اقرباء وہ ہیں جن سے عارضی طور پر نکاح حرام ہے اور اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ پہلے سے جو عورت نکاح میں ہے اس کی رشتہ دار دوسری عورت جو اس کے محرم کے درجہ کی ہو اور اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو مرد کو فرض کرلیا جائے تو ان دونوں کے درمیان باہم نکاح جائز نہ ہو، سے نکاح نہیں کیا جاسکتا مثلاً ایک بہن کی موجودگی میں دوسری بہن سے، یا پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی وغیرہ کو نکاح میں جمع کرنا جائز نہیں۔ ہاں اگر ان میں سے ایک سے علیحدگی ہوجائے تو دوسری سے نکاح کیا جاسکتا ہے، قرآن مجید نے دو بہنوں کے جمع کرنے کو منع فرمایا ہے۔[1] حدیث میں پھوپھی، بھتیجی اور خالہ بھانجی کے جمع کرنے کی ممانعت ثابت ہے۔[2]

ان رشتوں کو باہم نکاح میں جمع کرنے کی ممانعت قطع رحمی کے سدباب کے لئے ہے۔ سوکنوں کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہے جس میں فطری طور پر باہم نفرت، عداوت اور مخاصمت و منافست پیدا ہوجاتی ہے۔ شریعت اسلامی نہیں چاہتی کہ الفت و محبت اور غم خواری وغم گساری کے رشتوں کو قطع رحمی اور باہمی نفرت کے آگ میں سلگائے اور محبت و مودت کا خون کردے۔

کتابیہ سے نکاح

شرک وکفر کا ایک ایسا فاصلہ جو اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق اہل ایمان سے رشتۂ نکاح کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے، البتہ اس سے صرف اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی عورتوں کا استثناء ہے کہ مسلمان مرد ان سے نکاح کرسکتے ہیں۔قرآن خود ناطق ہے:

Ä Ã Â Á À ¿ ¾ [3]

D: ''اوران کی پارسائیں جن کو تم سے قبل کتاب مل چکی ہے، تمہارے لئے حلال ہیں۔''

اس لئے اہل کتاب عورتوں سے اصولی طور پر نکاح کے جائز ہونے پر کہنا چاہئے کہ اجماع ہے۔خود حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ''نائلہ'' نامی عیسائی خاتون سے نکاح کیا ہے جو بعد کو مسلمان ہوگئیں اور حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام کی ایک یہودی خاتون سے۔[1] البتہ سوال یہ ہے کہ دارالکفر میں رہنے والی کتابیہ عورت سے نکاح اور اسلامی ملک میں رہنے والی کتابیہ عورت کے درمیان فرق ہے یا نہیں؟

حضرت عبداللہ بن عباس تو دارالکفر کی کتابیہ سے نکاح کو بالکل ہی منع کرتے ہیں، لیکن عام فقہاء اس کی کراہت کی طرف مائل ہیں۔اور یہی فقہاء احناف کی رائے ہے۔''واصحابنا یکرھون مناکحات الحرب من اھل الکتاب۔[2]

وہ کتابیہ خواتین جو مسلم ممالک میں رہتی ہوں، عبداللہ بن عمر، ان سے بھی نکاح کو مکروہ قرار دیتے تھے۔[3] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ حضرت حذیفہ نے ایک یہودی خاتون سے نکاح کیا تو انہیں مکتوب لکھا اور طلاق دینے کا حکم

w زادالمعاد: ۱۲۳/۳، ھدیہ فی الجماع

e بخاری، باب اذا باتت المرأۃ مھاجرۃ

r المغنی: ۲۲۸/۷

فرمایا[4] اس سے احساس ہوتا ہے کہ مسلم ممالک میں بھی اہل کتاب خواتین سے نکاح کراہت سے خالی نہیں، اس لئے علامہ شامی نے لکھا ہے کہ دارالکفر میں کتابیہ سے نکاح مکروہ تحریمی ہے اور دارالاسلام میں مکروہ تنزیہی "(والاولٰی ان لا یفعل) یفید کراھة التنزیه فی غیر الحربیة وما بعده یفید کراھة التحریم فی الحربیة۔" [5]

پس اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی ناپسندیدگی کی وجہ ظاہر ہے۔ مرد کے نہ صرف عمل بلکہ فکر ونظر پر بھی بیوی جس درجہ اثر انداز ہوتی ہے، بچوں کی ذہنی نشو ونما میں ماں کا جو طاقت کردار ہوتا ہے اور سماج اور سوسائٹی کے اصلاح وفساد میں خواتین کا جو حصہ ہے وہ محتاج اظہار نہیں۔ پھر ہمارے زمانہ میں اہل کتاب خواتین اور ان کی سوسائٹی میں جو اباحیت اور اخلاقی انار کی ہے وہ بھی محتاج اظہار نہیں، ان حالات میں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

1 وہ عیسائی اور یہودی عورتیں جو خدا کے وجود اور نبوت کے نظام پر یقین رکھتی ہوں اور دہریہ اور مذہب کی منکر نہ ہوں ان سے نکاح کرنا جائز ہے۔

2 لیکن یہ نکاح کراہت سے خالی نہیں، مسلم ممالک میں ہوتو مکروہ تنزیہی ہے اور غیر مسلم ملکوں میں ہوتو قریب بہ حرام۔

3 وہ عورتیں جو نام کی عیسائی یا یہودی ہیں لیکن درحقیقت دہریہ اور لا مذہب ہوں، ان سے نکاح جائز نہیں۔

4 وہ عورتیں جو اسلام سے مرتد ہوکر عیسائی یا یہودی بن گئی ہوں ان سے بھی نکاح

---

t درمختار، باب القسم

q خلاصة الفتاوى: ۳۶۷/۲، كتاب الكراهية الفصل السادس فی النكاح والجماع

w ابن ماجه عن عتبه بن عبدسلمی، باب التستر عند الجماع: ۱۳۸/۱

e ردالمحتار: ۲۳۸/۵ فصل فی النظر واللمس

جائز نہیں۔

قادیانی سے نکاح

رہ گیا قادیانی عورتوں سے مسلمان مردوں کا نکاح تو وہ قطعاً حرام اور ناجائز ہے اور وہ اہل کتاب میں نہیں بلکہ زندیق کے حکم میں ہیں۔ راقم سطور نے اس سلسلہ میں ایک استفتاء کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے اس کا نقل کر دیا جانا مناسب محسوس ہوتا ہے۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت نے رشتہ مناکحت اور ذبیحہ کی حلت وحرمت کے لحاظ سے اہل کفر کے دو درجے قرار دیئے ہیں۔ اہل کتاب اور کفار ومشرکین۔ اہل کتاب سے نکاح کو جائز قرار دیا گیا اور اہل کفر سے ناجائز، اسی طرح اہل کتاب کا ذبیحہ حلال قرار دیا گیا اور دوسرے اہل کفر کا ذبیحہ حرام۔ پھر اہل کتاب سے وہ لوگ مراد ہیں جو اسلام کے سوا کسی ایسے دین پر ایمان رکھتے ہوں جو سماوی ہو اور جن کے پاس ایسی کتاب منزل ہو کہ بعد میں ہونے والی تحریف وتصحیف سے قطع نظر قرآن فی نفسہٖ ان کے نزول کی تصدیق کرتا ہو۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

''وكل من يعتقد ديناً سماوياً له كتاب منزل كصحف ابراهيم والشيث وزبور داود عليهم السلام فهو من اهل الكتاب فيجوز مناكحته واكل ذبائحه۔''

اس طرح اہل کتاب اور اہل کفر جو اپنے کفر کے برملا معترف ہوں، کا معاملہ بالکل واضح ہے، لیکن مسئلہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور اپنے معتقدات کے لحاظ سے اصلاً وہ کافر ہیں۔ ان کو کس زمرہ میں رکھا جائے گا؟ مسلمانوں میں یا اہل کتاب میں یا وہ عام کفار کے حکم میں ہوں گے؟

یہ تو ظاہر ہے کہ ان کے عقائد کفریہ کی وجہ سے مسلمانوں میں ان کا شمار نہ ہوگا اور

فقہی نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شمار اہل کتاب میں بھی نہ ہوگا بلکہ وہ عام کفار کے حکم میں ہوں گے، نہ ان سے رشتۂ نکاح درست ہوگا اور نہ ان کا ذبیحہ حلال ہوگا، فقہاء نے ایسے لوگوں کو ''زندیق'' سے تعبیر کیا ہے اور زندیق کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''ھو الذی یظھر الاسلام ویستصر بالکفر وھو المنافق وکان یسمی فی عصر النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم منافقاً ویسمی الیوم زندیقاً۔''[2]

D: ''جو اسلام تو ظاہر کرتا ہو مگر بباطن کفر پر مصر ہو وہ منافق ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا شخص منافق کہلاتا تھا اور اسی کو اب زندیق کہا جاتا ہے۔''

اسلامی حکومت کے لئے اہل کتاب اور کھلے ہوئے کافروں کا وجود قابل برداشت ہے لیکن ایسے منافقین برداشت نہیں، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے گا اور کھلے مرتد کی توبہ تو قبول کی جائے گی لیکن ایسے زندیق شخص کی توبہ بھی قبول نہیں کی جائے گی۔

''وقتل الزندیق بعد الاطلاع علیہ بلا استتابۃ وھو من اسر الکفر واظھر الاسلام، وکان یسمی فی زمن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم واصحابہ منافقاً بلا قبول توبۃ من حیث قتلہ ولا بد من توبتہ لکن ان تاب قتل حداً والاکفراً۔''[1]

چنانچہ فقہاء نے زندیق کو عام بت پرستوں اور کافروں کے حکم میں رکھا ہے علامہ ابن نجیم نے فتح القدیر کے حوالہ سے لکھا ہے:

r بقرہ، آیت: ۲۲۳ t تفسیر ماجدی: ۸۹/۱

"ویدخل فی عبدة الاوثان والصور التی استحسنوها والمعطلة والزنادقة والباطنیة والاباحیة وفی شرح الوجیز وکل مذهب یکفر به معتقده فهو یحرم نکاحها لان اسم المشرک یتناولهم جمیعا۔"[2]

:"بتوں اور تصاویر کے پرستاروں میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو انہیں بہتر سمجھتے ہیں، اور معطلہ زنادقہ، باطنیہ اور اباحیہ بھی، شرح وجیز میں ہے کہ ہر وہ مذہب جس کے ماننے والے کی تکفیر کی جائے، اس کی عورتوں سے نکاح حرام ہے اس لئے کہ مشرک کا لفظ سب کو شامل ہے۔"

اسی بناء پر بعض علماء نے از راہ احتیاط اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان معتزلہ کے اہل قبلہ میں ہونے کے باوجود مناکحت کو ناجائز قرار دیا ہے:"المناکحة بین اهل السنت واهل الاعتزال لا یجوز، کذا اجاب الشیخ الامام الرستغفنی"[1] فتاویٰ عالمگیری میں بھی بعض ایسے فرقے مثلاً مبیضہ وغیرہ کو کافر قرار دیا گیا ہے[2] اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی شرح موطا کی عبارت جس میں ختم نبوت کے بالواسطہ انکار کرنے والوں کو زندیق قرار دیا گیا ہے، نے تو اس بات کو بالکل واضح اور بے غبار کر دیا ہے کہ قادیانی بھی زندیق کے حکم میں ہیں اور ان کا حکم نکاح اور ذبیحہ کے معاملہ میں اہل کتاب کا نہیں بلکہ عام کافروں کا ہے اور یہ نہ صرف فقہاء کی تصریحات کے مطابق ہے بلکہ شریعت کی اس روح کے بھی موافق ہے کہ ایسے تمام مسائل میں ایمان کا تحفظ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس لئے جہاں اہل کتاب سے فتنہ کا اندیشہ ہو وہاں فقہاء نے کتابیہ سے بھی نکاح کی اجازت نہیں دی ہے۔"

تعدد ازدواج

[1] ترمذی: ۱۹۸/۱ [2] شرح مسلم: ۴۹۳/۱

اسلام سے پہلے تعدد ازدواج کی کوئی تحدید نہیں تھی، اسلام نے اس کو چار تک محدود کردیا اور یہ پابندی بھی عائد کردی کہ اگر عدل وانصاف کرنے پر خود کو قادر نہ پاتا ہو تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے، ایک سے زیادہ نکاح نہ کرے۔

﴿d e f g h﴾ [3]

D: ''اگر انصاف نہ کرسکو تو صرف ایک ہی نکاح کرو۔''

اس لئے اگر کوئی شخص اپنے بارے میں اس پر مطمئن نہیں ہو کہ وہ اپنی تمام بیویوں کے ساتھ مساوات برت سکے گا تو اس کے لئے دوسری شادی کرنا جائز نہیں ہے۔ سیّد قطب شہید نے اس سلسلہ میں علماء سلف وخلف کا مسلک نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اگر کوئی شخص اپنے آپ کو اس انصاف سے عاجز محسوس کرے اور اسے خوف ہو کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا تو صرف ایک ہی نکاح درست ہے اور اس سے زیادہ نکاح جائز نہیں۔'' [1]

اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک تو اگر ایک عورت نکاح کے وقت یہ شرط لگادے کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی نہ کرے گا تو شوہر کو اس معاہدہ کی پابندی کرنی ہوگی اور اگر اس نے دوسرا نکاح کرلیا تو نکاح تو ہو جائے گا لیکن اس عورت کو علیحدگی کا اختیار حاصل ہوگا۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ بعض حالات میں عفت وعصمت کی حفاظت، بیواؤں اور یتیموں کی پرورش اور عورتوں کی شرح پیدائش میں اضافہ اور کثرت کے حل کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ مردوں کو ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دی جائے، خود منصف مزاج علماء مغرب بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں، مشرقی تمدن کے ماہر مستشرق عالم ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتے ہیں:

---

e زاد المعاد: ۱۷۹/۳ r البقرہ، آیت: ۲۲۲

''مغرب میں بھی......ایک ہی شادی کی رسم کا وجود صرف کتابوں میں ہے، اور میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ یہ رسم ہماری واقعی معاشرت میں نہیں پائی جاتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مشرقیوں کا جائز تعدد کس امر میں مغربیوں کے ناجائز تعدد ازدواج سے کم تر سمجھا جاتا ہے بلکہ میں کہوں گا کہ اول کو ہر طرح دوسرے پر ترجیح ہے۔'' [3]

زنا کی شناعت

ایک طرف جہاں اسلام نے نکاح اور نکاح کی بنا پر مرد و زن کے حلال و جائز اختلاط کو صدقہ و عبادت کا درجہ دیا ہے وہیں اس کی نگاہ میں زنا بدترین گناہ ہے۔ قرآن مجید نے نہ صرف زنا سے روکا ہے بلکہ زنا کے قریب بھی جانے کو بے حیائی اور بدراہی قرار دیا۔[1] قرآن نے عورتوں کے لئے جن امور پر بیعت اور عہد و پیمان کو عورتوں کے لئے ضروری قرار دیا ہے ان میں سب سے اول یہی برائی ہے۔[2] ایک اور جگہ شرک اور قتل انسانی کے ساتھ اس برائی کی مذمت کی گئی ہے۔[3] حدیثوں میں حالت زنا کو ایمان کے مغائر قرار دیا گیا ہے "لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن۔" [4]

ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زنا چہرے کی دل کشی کو ختم کر دیتا ہے اور رزق کو کاٹ دیتا ہے۔[5] کبرسنی کے باوجود جو زنا کا مرتکب ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ کبھی جنت میں داخل نہیں ہوگا اور اللہ کی رحمت کبھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوگی۔[6] ارشاد ہوا کہ جب کسی قوم میں زنا کی کثرت ہوتی ہے تو ان پر قحط سالی مسلط کر دی جاتی ہے۔[7] یہ بھی ارشاد فرمایا کہ زنا کے عموم سے کثرت سے موت واقع ہوگی "ولا فشی الزنا فی قوم الا کثر فیھم الموت"[8]

t ترمذی عن ابی ھریرۃ، باب ماجاء فی کراھیۃ اتیان الحائض: ۳۵/۱، بخاری عن عائشہ: ۹۹/۱

مہلک اور جان لیوا امراض کا ظہور ہے۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ آتشک، سوزاک، کینسر کی بعض قسمیں اور ایک نو پیدا لاعلاج خطرناک بیماری ایڈز عام طور پر اسی اجنبی بے راہ روی اور بے اعتدالی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اسلام نے زنا کی شناعت کو دیکھتے ہوئے زنا پر نہایت سخت سزائیں مقرر کی ہیں، جو غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے سو کوڑے "321 0 / . -"[1] شادی شدہ مرد و عورت کے لئے سنگسار کر دینا ہے۔[2] ـــــ واقعہ یہ ہے کہ زنا ایک ایسا جرم ہے جس سے پیدا ہونے والی بیماریوں کی سزا پورے سماج کو بھگتنی پڑتی ہے، جس کی وجہ سے پوری سوسائٹی میں بے حیائی عام ہوتی ہے جو ایک عورت اور مرد کے لئے نہیں بلکہ دو خاندانوں کے لئے باعث ننگ و عار ہوتی ہے، جو پیدا ہونے والی بے نسب اولاد کے ساتھ بھی ناکردہ گناہوں کی سزا کے درجہ میں ہے، یہ قانون فطرت سے بھی بغاوت اور انسانی شرافت کے ساتھ بھی کھلواڑ ہے اور ان سب سے بڑھ کر رب کائنات کی عدول حکمی اور نارضا جوئی نیز اس کے غیض و غضب کی دعوت ہے۔ "اعاذنا اللّٰہ منہ"

فعل خلاف فطرت

جنسی بے اعتدالی کی اس سے بھی بدترین شکل لواطت اور استلذ اذ بالمثل ہے۔ یہ نہایت خلاف فطرت اور اسلام کی نگاہ میں مبغوض اور قبیح فعل ہے۔ قرآن کے بیان

---

q حجۃ اللّٰہ البالغہ: ۱۲۳/۲، آداب المباشرہ
w زاد المعاد: ۱۲۹/۲
q المغنی: ۲۳۲/۷ w المغنی: ۲۳۱/۷ e المغنی: ۲۳۱/۷
q المغنی: ۲۳۲/۷ w نساء، آیت: ۲۳ e نساء، آیت: ۲۳
q درمختار: ۶۰۶/۲ w درمختار: ۲۷۶/۲e ھدایہ: ۳۰۸/۲
r ھدایہ: ۳۵۰/۲ t درمختار: ۶۰۳/۲ y ھدایہ، درمختار: ۶۰۳/۲

کے مطابق حضرت لوط کی قوم پر محض اسی وجہ سے سخت بھیانک اور عبرت ناک عذاب نازل ہوا، زمین پر پتھر کی سخت بارش ہوئی اور اس کی سطح پلٹ کر رکھ دی گئی۔[3] ــــــ ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص پر تین دفعہ لعنت بھیجی ہے۔[4] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ چار اشخاص کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی صبح و شام اللہ کی غضب اور ناخوشنودی کی حالت میں ہوتی ہے۔ان میں ایک اس فعل کا مرتکب بھی ہے۔[5]

اس جرم کی شناخت کی وجہ سے فقہاء مضطرب ہیں کہ آخر ایسے مجرم کو کیا سزا دی جائے؟ بعض کہتے ہیں کہ پہاڑ سے گرا کر ہلاک کر دیا جائے،بعض زانی کی سزا جاری کرنے کے قائل ہیں،بعض قتل کے اور بعض قاضی کی صوابدید پر رکھتے ہیں۔حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایماء پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غیر شادی شدہ لوطی پر زانی کی سزا سو کوڑے جاری کرائی ہے۔[1] خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دینے کی ہدایت فرمائی ہے۔[2] اور اکثر فقہاء کا رجحان اسی طرف ہے کہ ایسے مجرم کو قتل کر دیا جائے۔[3] البتہ یہ ''تعزیر'' کے قبیل سے ہے اور تعزیر میں عدالت کو حالات و واقعات کے اعتبار سے کمی و زیادتی کا حق حاصل ہوتا ہے۔

جن اقوام میں یہ برائی عام ہے ان کو خود قدرت جان لیوا اور عبرت ناک امراض کی صورت میں جیتے جی بھیانک سزا دے رہی ہے اور آخرت کی پکڑ اس سے سوا ہے کہ "ان بطش ربک لشدید''

جانوروں سے تکمیل ہوس

---

q نساء، آیت: ۳۲

w نیل الاوطار: ۵۸/۶ بحوالہ صحاح ستہ عن ابی ھریرہ

e مائدہ، آیت: ۵

q احکام القرآن للجصاص: ۳/۳۲۸

C19

ایسے ہی قبیح افعال میں جانوروں کے ذریعہ جنسی خواہش کی تکمیل وتسکین ہے اور واقعہ ہے کہ یہ ایسا عمل ہے کہ اس پر حیوانیت اور بہمیت کی جبین حیا بھی عرق آلود ہے ـــــ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شدید مذمت فرمائی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جانور کے ساتھ بدفعلی کرنے والے شخص اور خود جانور دونوں کو قتل کر دو۔[4] فقہاء نے گو اس فرمان کو شدت وتوبیخ پر محمول کیا اور از راہ تعزیر عادی مجرم کے لئے قتل کی گنجائش رکھی ہے تاہم ایسا شخص قابل سرزنش ہے اس پر اتفاق ہے، جانور بھی ذبح کر دیا جائے گا اور زندہ ومردہ اس سے کوئی نفع نہیں اٹھایا جائے گا۔[1] بعض روایات میں جانور ذبح کے بعد جلا دینے کا بھی ذکر ہے۔[2] لیکن ایسا کرنا واجب نہیں۔[3] کیوں کہ اصل مقصود یہ ہے کہ برائی کے نشان کو باقی نہ رہنے دیا جائے کہ ایسا نہ کیا جائے تو انگشت نمائی ہوگی، برائی کا ذکر پھیلے گا اور اس سے خود ایک برائی کی طرف ذہن انسانی منتقل ہوگا۔

جنسی بے راہ روی کا سد باب

شریعت نے ناجائز چیز کو روکنے اور عفت وعصمت کی حفاظت کے لئے اور شرم و حیا کی بقا کے لئے مختلف تدبیریں کی ہیں۔ جن میں سب سے اول تو نکاح ہے لیکن اس کے علاوہ بعض اور احتیاطی تدبیریں بھی کی گئی ہیں، ان میں بدنگاہی کی ممانعت اور استیذان خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بدنگاہی آنکھوں کا زنا ہے۔[4] ارشاد ہوا کہ شرم گاہ کے ذریعہ تو آخری درجہ کی تصدیق ہوتی ہے ورنہ آنکھیں، ہاتھ، پاؤں اور زبان یہ سب زنا کرتے ہیں، یعنی اس فعل زنا میں معاون

---

w احکام القرآن للجصاص: ۳۲۶/۳

e احکام القرآن للجصاص: ۳۲۸/۳

r رواہ ابن ابی شیبہ بسند لا بأس بہ

t رد المحتار

ہیں۔[5] اس لئے کہ برائی کا اولین خیال یہی نگاہ دل میں پیدا کرتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم فرمایا کہ اپنی نگاہوں کو پست رکھیں "قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم" یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا کہ نگاہیں پست رکھیں اور اپنی زیبائش وآرائش کا اظہار نہ کریں۔[6] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نگاہ کو شیطان کے تیروں میں سے ایک زہر آلود تیر قرار دیا ہے۔

عورتیں اگر بضرورت گھر سے باہر نکلیں تب بھی ان کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ تبرج اور آرائش کا اظہار نہ کریں۔[1] عام گزرگاہ سے بچ کر کنارے چلا کریں۔ مسجد میں آئیں تو ان کی صف سب سے آخری ہو، گفتگو ایسی نہ کریں جس میں لوچ ہو۔[2] آواز میں شیرینی اور جاذبیت نہ ہو جس سے اجنبی مردوں کا دل ان کی طرف کھنچے۔[3] اجنبی مرد و عورت کا تخلیہ نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں تیسرا شیطان ہوتا ہے "لا یخلون رجل بامراۃ الا کان ثالثھما الشیطان"[4] اصل میں یہ ساری قدغنیں اسی لئے ہیں کہ آخری درجہ کی برائی بیک خیال نہیں آتی، یہ زہر بتدریج پروان چڑھتا ہے۔ پہلے نگاہیں ملتی ہیں، پھر نگاہ کا تیر دل میں اترتا ہے اور دل میں آگ سلگتی ہے پھر اول زبان دامن حیا کو تارتار کرتی ہے اور اپنا مدعائے ہوس رکھتی ہے، پھر تنہائی اور ماحول کا اختلاط اس فتنہ کی آنچ کو اور تیز کرتا ہے زیبائش وآرائش کا اظہار، جاہلانہ تبرج اور زبان کی حلاوت اس آتش فتنہ کو اور سلگاتی اور بڑھاتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ نوبت یہاں تک آپہنچتی ہے کہ انسان آخری درجہ کی برائی میں مبتلا ہو جاتا ہے، جب انسان بالخصوص عورت کے جسم سے ایک بار حیا کی چادر اترتی ہے تو پھر اس کا آشفتہ ہوس اور وارفتۂ نفس بدن کبھی اس چادر کو اوڑھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کل

---

q عالمگیری: ۸/۲   w مجمع الفقہ الحنبلی: ۱۴۴/۱

q الشرح الصغیر: ۴۳۸/۴   w البحر الرائق: ۱۱۰/۳

q خلاصۃ الفتاوی: ۶/۲   w عالمگیری: ۸/۲   e نساء، آیت: ۳

جس کی نگاہ اٹھتے ہوئے شرماتی تھی اور جس کو زبان کھولنے میں بھی حجاب آتا تھا۔ آج اسے رقص گاہوں میں تھرکنے اور ناچنے اور محفلوں میں اپنے مدح سراؤں کے ساز دل کو چھیڑنے اور تار نفس کو بجانے میں لطف آنے لگتا ہے، اسی لئے شریعت اسلامی اس فتنہ کے آغاز ہی پر روک لگاتی ہے اور اس فتنہ کی چنگاری کو سلگنے اور شعلہ و آتش بننے کی اجازت نہیں دیتی۔

جنسی بے راہ روی ہی کی ایک صورت جلق اور استمناء بالید کی ہے، اسلام کی نگاہ میں انسان کا پورا وجود اور اس کی تمام تر صلاحیتیں اللہ کی امانت ہیں، قدرت نے ان کو ایک خاص مقصد کے تحت جنم دیا ہے جو شخص جسم کے کسی حصہ کا غلط استعمال کرتا ہے وہ دراصل خدا کی امانت میں خیانت اور خلق اللہ میں من چاہے تغیر کا مرتکب ہوتا ہے۔ انسان کے اندر جو جنسی قوت اور مادۂ منویہ رکھا گیا ہے وہ بھی بے مقصد اور بلا وجہ نہیں ہے بلکہ اس سے نسل انسانی کی افزائش اور بڑھوتری مقصود ہے اور اس قسم کا عمل چاہے جلق و استمناء بالید ہو یا اغلام بازی یا خود اپنی بیوی سے لواطت، اس مقصد کے عین مغائر اور اس سے متصادم ہے۔

اس لئے یہ عمل بھی ممنوع اور حرام ہے۔ آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسے شخص کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن توجہ نہیں فرمائیں گے۔[1] ایک اور روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص پر اللہ اور اس کے فرشتوں کی لعنت بھیجی ہے۔[2] اس کی حرمت پر سورۂ المؤمنون کی آیت ۵ تا ۷ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جس میں جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے دو ہی راستوں کی تحدید کر دی گئی ہے، ایک بیوی، دوسرے لونڈی، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک تیسری صورت ہے، فقہاء احناف نے اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے۔

---

q فی ظلال القرآن: ۸۲/۱ w فی ظلال القرآن: ۸۲/۱

e تمدن عرب: ص ۳۶۶

قضاء شہوت کی نیت سے ایسا کرنا قطعاً جائز نہیں، ہاں اگر شہوت کا غلبہ ہو، زنا سے بچنے اور شہوت میں سکون اور ٹھہراؤ پیدا کرنے کے لئے ایسا عمل کیا جائے تو لکھتے ہیں کہ امید ہے کہ اس پر وبال اور عذاب نہ ہوگا۔[3] چنانچہ ایسے حالات میں ابن عباس، عبداللہ بن عمر، مجاہد، حسن بصری وغیرہ سے اس کا جواز نقل کیا گیا ہے۔[4] اسی ضرورت کے ذیل میں علاج اور میڈیکل جانچ کی غرض سے مادۂ منویہ کا نکالنا بھی ہے، تاہم ان سب کا تعلق اتفاق سے ہے۔ عادتاً تو کسی بھی طرح اجازت نہ دی جائے گی، کہ یہ نہ صرف اخلاق کو متأثر کرتا ہے اور فطرت سے بغاوت کے مترادف ہے بلکہ صحت انسانی کے لئے بھی سخت مضر ہے۔

عورتوں میں ہم جنسی

جس طرح مردوں کے درمیان فعل خلاف فطرت حرام ہے اسی طرح عورتوں کے درمیان بھی فعل خلاف فطرت جس کو ''سحق'' کہا جاتا ہے، ناجائز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں نہ رہے۔[1] حضرت واصلہ سے مروی ہے کہ عورتوں کے درمیان باہم لذت اندوزی زنا ہے۔[2] ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے علامات قیامت میں سے قرار دیا ہے کہ مرد مرد سے، عورت عورت سے اپنی ضرورت پوری کرے۔[3]

قدرت نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کی ضرورت اور تکمیل ضرورت کا سامان بنا کر پیدا کیا ہے اور اس کا مقصد بھی مجرد شہوت اور ہوس کی تکمیل نہیں، نسل انسانی کی افزائش اور اس کے بقاء میں تسلسل ہے، ہم جنسی فطرت کے ان مقاصد میں مخل ہے اور قطعی غیر فطری عمل ہے۔

---

q اسراء، آیت: ۴ w ممتحنہ، آیت: ۲ e الفرقان، آیت: ۶

r مشکوٰۃ عن ابی ھریرہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ: ۱۲/۱

t مجمع الزوائد: ۲۵۵/۶ باب ذم الزنا

ثبوتِ نسب

اسلام میں نسب کے تحفظ اور شناخت کو خاص اہمیت دی گئی ہے کہ یہی انسان اور حیوان کے درمیان ایک واضح نقطۂ امتیاز ہے، اسی مقصد کے لئے پہلے شوہر سے علیحدگی کے بعد دوسرے نکاح سے پہلے عدت گزارنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے زنا کی حرمت میں سخت شدت برتی گئی، نسب کے تحفظ کے فقدان کی دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں، کوئی شخص اپنے بچہ کے نسب کا انکار کر دے یا کوئی بچہ اپنے کو ماں باپ کی طرف منسوب کرنے کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کر لے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں ہی باتوں کی مذمت فرمائی۔ ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے بچہ کے نسب کی نفی کی تا کہ دنیا میں اسے ذلیل کرے، اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کو ذلیل فرمائیں گے۔[1] ایک اور روایت میں ہے کہ ایسا باپ اور باپ کی نسبت کا انکار کرنے والا بیٹا دونوں ان لوگوں میں ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ ان سے گفتگو فرمائیں گے اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کریں گے اور نہ ان کی طرف نگاہ رحمت اٹھائیں گے۔[2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول مقرر فرما دیا کہ جس عورت کو ولادت ہو اس کا شوہر بچہ کا باپ ہوگا، زانی کا بچہ سے نسب ثابت نہ ہوگا "الولد للفراش وللعاهر الحجر"[3] مزاج شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء کا قاعدہ یہ ہے کہ ممکن حد تک بچہ کا نسب صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی اور کسی مسلمان کی طرف زنا یا نتیجۂ زنا ہونے کی نسبت سے بچا جائے گا، اسی لئے فقہاء نے زیادہ سے زیادہ مدت حمل مقرر کرنے میں غایت درجہ احتیاط بلکہ بعض فقہاء نے تو مبالغہ سے کام

---

[1] مجمع الزوائد: ۲۵۵/۶ باب ذم الزنا

[2] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الحدود

[3] مشکوٰۃ عن مالک: ۴۵۹/۲

لیا ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک مدت حمل دو سال ہے۔[4] اس طرح شوہر کے طلاق دینے یا وفات پانے کے بعد دو سال کے اندر اندر بچہ پیدا ہو جائے تب بھی نسب ثابت ہو جاتا ہے۔

ٹسٹ ٹیوب سے تولید

موجودہ سائنسی ترقیات اور انکشافات نے تولید و تناسل کے لئے بعض نئے مسائل کو ممکن بنا دیا ہے، انہیں میں سے ایک ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ تولید کا عمل ہے بنیادی طور پر ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ تولید کی دو شکلیں ہیں:

اول یہ کہ اجنبی مرد وعورت کے مادۂ منویہ اور بیضۃ المنی کو باہم خلط کر کے تولید عمل میں آئے۔ چاہے یہ دو اجنبی مادے کسی ٹیوب میں خلط کئے جائیں یا خود اس عورت کے رحم میں یا کسی اور عورت کے رحم میں، یا خود اس مرد کی قانونی اور شرعی بیوی کے رحم میں —— یہ صورت بہرحال ناجائز ہوگی کہ اس کی وجہ سے نسب میں اختلاط ہوتا ہے اور زنا کی ممانعت کی اصل وجہ یہی اختلاط نسب ہے۔ اس سلسلہ میں صریح نصوص موجود ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”لا یحل لامرئ یؤمن باللّٰہ والیوم الاخر ان یسقی ماء ہ زرع غیرہ۔“ [1]

D: ”خدا و آخرت پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کے لئے روا نہیں کہ اپنے پانی سے دوسرے کی کھیتی سیراب کرے۔“

دوسری صورت یہ ہے کہ خود شوہر بیوی کے مادۂ حیات کو خلط کر کے تولید عمل میں

---

q نور، آیت: ۲ w مشکوٰۃ عن جابر، کتاب الحدود: ۳۱۲/۱

e ھود، آیت: ۷

r مجمع الزوائد: ۲۷۲/۶ باب ماجاء فی اللواط

t مجمع الزوائد: ۲۷۲/۶ باب ماجاء فی اللواط

آئے، اس کی بھی کئی شکلیں ہوسکتی ہیں:

1 شوہر کا مادہ انجکشن وغیرہ کے ذریعہ عورت کے رحم تک پہنچا دیا جائے۔

2 شوہر و بیوی کے مادے حاصل کئے جائیں اور کسی ٹیوب میں مخصوص مدت تک ان کی پرورش کی جائے، پھر اسی عورت کے رحم میں اس کو منتقل کر دیا جائے۔

3 شوہر اور اس کی ایک بیوی کا مادہ حاصل کیا جائے اور اس آمیزے کو اسی شوہر کی دوسری بیوی کے رحم میں منتقل کر دیا جائے، اس لئے کہ اس کی پہلی بیوی زچگی کی متحمل نہ ہو یا طبی اسباب کی بنا پر تولید کی اہل نہ ہو۔

راقم سطور کا خیال ہے کہ گو ان صورتوں میں شوہر کے لئے جلق، عورت کے لئے دایہ کے سامنے بے ستری اور ایک گونہ استقرار حمل کے لئے غیر فطری طریق کے استعمال کی نوبت آتی ہے لیکن اگر طبی اعتبار سے عورت استقرار حمل کی صلاحیت نہیں رکھتی ہو اور حصول اولاد کا شدید داعیہ ہو تو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ یہ ایک طریقۂ علاج ہے اور شریعت میں علاج کے باب میں ان امور میں نرم روی کی گنجائش موجود ہے۔ ہاں بہتر ان طریقوں سے اجتناب ہی برتنا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اس مولود کا باپ وہی ہوگا جس کا مادہ تھا۔ ثبوت نسب کے لئے شوہر کے نطفہ سے بیوی کا حاملہ ہوجانا کافی ہے، جسمانی طور پر مباشرت ضروری نہیں۔[1] ہاں اگر مرد کی ایک بیوی کا بیضۃ المنی حاصل کیا گیا اور دوسرے کے رحم میں پرورش و پرداخت ہوئی اور اس نے ولادت کی تکلیف برداشت کی، تو ظاہر ہے کہ یہ دوسری عورت اس کی ماں ہوگی اس لئے کہ قرآن نے بچہ جننے والی کو ماں قرار دیا ہے لیکن چوں کہ اس پہلی عورت کا بیضۃ المنی بھی اس کی تکوین کے لئے اصل اور اساس بنا ہے اس لئے اس کو بھی ماں قرار دیا جانا چاہئے فقہاء کے یہاں بعض صورتوں میں ایسی نظیریں موجود ہیں کہ ایک بچہ کا نسب دو اشخاص سے ثابت کیا جائے۔[2]

q مجمع الزوائد: ۴/۲۷۴

لعان

شریعت نے مسلمانوں کی عزت وآبرو کی حفاظت وصیانت کو واجب قرار دیا ہے۔اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خانۂ کعبہ کے ہم درجہ بتایا ہے۔اسی لئے تجسس کو منع کیا گیا اور اسی وجہ سے بے محل شک وشبہ کو بھی ناپسند کیا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ خواتین کی لغزشوں کا پیچھا کیا جائے۔[3] سفر سے واپسی پر حکم فرمایا گیا کہ رات میں گھر آنے کے بجائے شہر سے باہر ٹھہر جائے اور گھر اپنے آمد کی طلاع پہلے ہی کر دے۔[1] اس لئے بیوی کے کردار پر اعتماد واعتبار کرنا چاہئے اوبے بنیاد شکوک سے خود کو بچانا چاہئے۔

لیکن ایسا بھی نہ ہو کہ شوہر غیرت وحیا سے بالکل محروم ہوجائے اور اپنی بیوی کے معاملہ میں ہر طرح کی بے غیرتی کو برداشت کرلے۔اس لئے شریعت میں وہ تمام احتیاطی تدبیریں کی گئی ہیں جو اوپر ذکر ہوچکی ہیں،لیکن اگر ان سب کے باوجود عورت سے آخری درجہ برائی یعنی زنا کا صدور ہوجائے تو اب مرد کیا کرے؟

شریعت کے عام اصول کے مطابق اسے چار گواہ فراہم کرنے چاہئیں۔اور اگر یہ فراہم نہ کریں تو خود کو بہتان کی سزا یعنی اسی کوڑے کھانے کے لئے تیار رہنا چاہئے، لیکن صورت حال یہ ہے کہ ایسے معاملات میں چار عینی گواہوں کی دستیابی مشکل ہے اور معاملہ صرف دوسرے کی زندگی پر الزام دھرنے کا نہیں بلکہ خود اپنی زندگی میں اعتماد و اعتبار کے باقی رہنے اور نہ رہنے کا ہے کیونکہ شادی شدہ عورت کی بے عفتی براہ راست شوہر کی تذلیل،اس کی اولاد کے نسب کو مشکوک کرنا اور اس کے سکون کو درہم برہم کرنا

---

w نصب الرایہ: ۹۳/۲، بحوالہ مستدرک حاکم عن ابن عمر

e التشریع الجنائی الاسلامی: ۴۸۸/۱

r مجمع الزوائد: ۲۷۲/۶ باب فیمن اتی بھیمۃ

q درمختار: ۲۳/۳ w امام محمد، کتاب الآثار: ص۹۲ e المبسوط: ۱۰۲/۹

ہے۔

اس لئے شریعت نے اس صورت میں ایک خصوصی استثنائی صورت پیدا کی ہے اور وہ یہ کہ شوہر اور بیوی سے الزام کے صحیح ہونے اور نہ ہونے کے سلسلہ میں چار چار دفعہ قسم کھلائی جائے پانچویں بار مرد سے کہلایا جائے کہ اگر میں اپنی بات میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو، اسی طرح عورت سے چار بار قسم کھلانے کے بعد پانچویں بار کہلایا جائے کہ اگر میرا شوہر اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو[2]

شوہر اگر بچہ کی ولادت کے فوراً بعد اس بات سے انکار کردے کہ وہ اس کا بچہ ہے یا اس وقت انکار کردے جب مبارک باد وغیرہ دی جاتی ہے تو قاضی جہاں لعان کے ذریعہ میاں بیوی میں علیحدگی کردے گا وہیں یہ بھی ہوگا کہ بچہ کا نسب اس مرد سے ثابت نہیں ہوگا اور وراثت وغیرہ اس سے نہیں ملے گی لیکن اگر مبارک باد وغیرہ کا وقت گزر گیا اور اس کے بعد اس نے بچے کے ولد الزنا ہونے کا دعویٰ کیا تو لعان کے ذریعہ ان دونوں میں علیحدگی کرادی جائے گی مگر بچہ کا نسب اسی شخص سے ثابت ہوگا[1] تاہم خیال رہے کہ محض شک اور احتمال و امکان کی بنا پر بیوی پر اتنا بڑا الزام دھرنا سخت گناہ ہے اور مبغوض عمل ہے۔ لعان اسی وقت ہے جب کہ ایک شخص اپنی بیوی کو عین زنا میں دیکھے اور اس بدکاری میں ملوث پائے۔

ایلاء وظہار

رشتۂ ازدواج میں جو چیزیں حرام اور باعث گناہ ہیں ان میں ایلاء اور ظہار بھی ہے۔ ایلاء سے مراد بیوی سے تعلق ازدواج نہ رکھنے کی قسم کھالینا ہے ایسی صورت میں اگر چار ماہ تک بیوی سے صحبت نہیں کی تو بیوی پر از خود طلاق واقع ہوجاتی ہے[2] ——— ظہار یہ ہے کہ اپنی بیوی یا اس کے کسی حصہ کو محرم رشتہ دار یا اس کے کسی ایسے حصہ سے

---

۲ مجمع الزوائد: ۲۵۶/۶، باب زنا الجوارح عن علقمة من اصحاب رسول اللّٰہ

تشبیہ دے جس کو دیکھنا حرام ہے، ظہار چوں کہ ایک گناہ اور بیوی کو اذیت پہنچانا ہے اس لئے گناہ اور معصیت ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ مقررہ کفارہ جب تک ادا نہ کرے بیوی سے مباشرت نہیں کرسکتا۔ ظہار کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام یا باندی کو آزاد کرے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے روزہ رکھے، یہ بھی نہ ہوسکتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے[3] ——— یہ سزاؤں کا متعین کیا جانا اور کفارات کا واجب ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ایلاء وظہار گناہ اور اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ باتیں ہیں[4]۔

خاندانی منصوبہ بندی

موجودہ زمانے کے سماجی مسائل میں ایک اہم مسئلہ ضبط ولادت اور خاندانی منصوبہ بندی کا ہے، بعض مغربی مفکرین نے معاشی وسائل اور مسائل کے درمیان توازن باقی رکھنے کے لئے ضبط تولید کے نظریہ کو ایک ضرورت کا درجہ قرار دے کر پیش کیا ہے۔ اسلام بنیادی طور پر معاشی وجوہ کے تحت خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں نہیں ہے، اس کا ایقان ہے کہ جو خدا کائنات میں ضرورت مند انسانوں اور حیوانوں کو پیدا کرتا ہے وہی خدا مناسب حال وسائل معاش اور غذائی پیداوار میں بھی اضافہ کرتا رہتا ہے کہ وہ رزاق بھی ہے اور علیم وقدیر بھی۔

ہاں بعض اوقات خصوصی طبی ضروریات کے تحت یہ بات درست ہے کہ متعلق افراد ضرورۃً ضبط ولادت کی بعض صورتیں اختیار کرلیں۔ ضبط ولادت کی مختلف صورتیں ہیں اور ان کے احکام بھی الگ الگ ہیں اس لئے مختلف صورتوں کے بارے میں الگ الگ احکام لکھے جاتے ہیں۔

---

t مجمع الزوائد: عن سهل بن امامه y نور، آیت: ۵
q احزاب، آیت: ۵ w احزاب، آیت: ۵

مستقل منع حمل

منع حمل کی ایسی صورت جو مستقل طور پر قوت تولید کو ختم کر دے جس کے لئے ہمارے زمانے میں مردوں کی نسبندی اور عورتوں کا آپریشن کیا جاتا ہے، اصلاً حرام ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کے لئے ''اختصاء'' کی صورت اختیار کی جاتی تھی۔ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے خود کو خصی کرنا چاہا تا کہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت عبادت کے لئے یکسو کر سکیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہوتی تو ہم لوگ خصی ہو جاتے ''رد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی عثمان بن مظعون التبتل ولو اذن لاختصینا''[1] اسی بنا پر فقہاء نے بھی ''اختصاء'' کو حرام قرار دیا ہے۔ قاضی ابوالحسن ماوردی لکھتے ہیں: ''ویمنع من خصاء الآدمیین والبھائم ویؤدب''[2] حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اختصاء بلکہ ایسی ادویہ کے استعمال کو بھی حرام قرار دیا ہے جو قوت تولید کو ختم کر دے اور اس پر اتفاق نقل کیا ہے:

''والحجۃ فیہ انھم اتفقوا علی منع الجب والخصاء فیلحق بذلک ما فی معناہ من التداوی بالقطع اصلاً۔''[3]

نفخِ روح کے بعد اسقاط

اسقاط حمل کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ہمیں اس کے دو مرحلوں پر غور کرنا چاہئے، ایک صورت یہ ہے کہ حمل میں جان پیدا ہو چکی ہے۔ حدیث کے مطابق استقرار حمل کے چار ماہ یعنی ۱۲۰ دن بعد روح پیدا ہوتی ہے، غالباً ''علم الجنین'' کے جدید ماہرین بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ روح پیدا ہونے کے بعد اسقاط حمل

بالاجماع حرام ہے، احمد علیش مالکی فرماتے ہیں: "والتسبب فی اسقاطہ بعد نفخ الروح فیہ محرم اجماعا وھو من قتل النفس" [4]

اور فتاویٰ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ میں ہے:

"اسقاط الحمل حرام باجماع المسلمین وھو من الواد الذی قال تعالٰی فیہ وَاِذَا الْمَوْؤدَۃُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ" [5]

البتہ اگر بچہ بطن مادر میں زندہ ہو اور اس کے ساتھ اسقاط کے بغیر ماں کی زندگی بچانا ممکن نہ ہو تو اس وقت اسقاط کی اجازت ہونی چاہئے اس لئے کہ ان دو ضرر میں سے ماں کی موت بڑا ضرر ہے اور بچہ کی موت کم تر ضرر۔ نیز ماں کا زندہ وجود مشاہد و معائن ہے اور بچہ کا مظنون جیسا کہ فقہاء نے استحساناً ان مسلمانوں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے جنہیں کفار اپنے لشکر کے آگے ڈھال بنائے رہیں کہ مملکت اسلامیہ کا اہل اسلام کے ہاتھ سے نکل جانا چند مسلمانوں کی موت کے مقابلہ بڑا ضرر ہے۔

یہاں ان عبارتوں سے شبہ ہوسکتا ہے جن میں ایک شخص کی جان لے کر دوسرے کی جان بچانے کو فقہاء نے منع کیا ہے مثلاً ابن نجیم کی یہ عبات کہ "لان احیاء نفس بقتل نفس اخری لم یرد فی الشرع"[1] یا شرح السیر الکبیر کی یہ عبارت کہ "ان المسلم لا یحل لہ ان یقی روحہ بروح من مثلہ فی الحرمۃ"[2]

اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب دونوں زندگیاں اور دونوں وجود ایک درجہ کے ہوں اور یہاں ماں کا وجود مشاہد ہے جب کہ بچہ کی زندگی موہوم ہے۔

---

e رد المحتار: ۲۸۸/۱ r مشکوۃ: ۲۶۹/۲

q کنز العمال: ۱۹۲/۸ w کنز العمال: ۱۹۸/۸

e خلاصۃ الفتاوی: ۲۶۰/۱ کتاب الصوم

نفخِ روح سے قبل اسقاط

نفخِ روح سے پہلے اسقاطِ حمل کے متعلق بعض فقہاء کی عبارتوں سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو مطلقاً جائز اور درست سمجھتے ہیں، اس طرح کی تحریریں احناف شوافع اور حنابلہ تینوں ہی کے یہاں موجود ہیں البتہ مالکیہ اور شوافع میں امام غزالی نے نفخِ روح سے پہلے بھی اسقاطِ حمل کو مطلقاً ناجائز قرار دیا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ احناف شوافع اور حنابلہ کے ہاں بھی یہ جواز اس صورت میں ہے جب کوئی عذر درپیش ہو، بلا عذر اسقاط ممنوع اور گناہ کا باعث ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: "لا یخفی انها تاثم اثم القتل لو استبان خلقه ومات بفعلها"[1] (ظاہر ہے کہ اگر اس کی تخلیق ظاہر ہو جائے اور عورت کے کسی فعل کی وجہ سے اس کی موت ہو تو اس کو قتل کا گناہ ہوگا)۔

اعضاء کے ظہور سے پہلے اور استقرارِ حمل کے بعد بھی اسقاط جائز نہیں "انه یکره فان الماء بعد ما وقع فی الرحم ماله الحیاة فیکون له حکم الحیاة کما فی بیضة صید الحرم"[2] (اعضاء کے ظہور سے پہلے بھی اسقاط مکروہ ہے کیوں کہ مادۂ منویہ کے رحم میں جانے کے بعد اب اس کا مآل حیات اور زندگی ہے لہٰذا وہ زندہ وجود کے حکم میں ہوگا جیسا کہ حرم کے شکار کے انڈے کا حکم ہے)۔

پس یہ بات قریب قریب بے غبار ہے کہ نفخِ روح سے قبل بھی اسقاطِ حمل جائز نہیں، البتہ کسی ایسے عذر کی بنا پر جو عند الشرع معتبر ہے، اسقاطِ حمل جائز ہوگا اور ظہیریہ اور عالمگیری وغیرہ میں جہاں مطلقاً اسقاطِ حمل کا جواز مذکور ہے، وہاں حالتِ عذر ہی میں اسقاطِ حمل مراد ہے۔ یہ اعذار دو طرح کے ہو سکتے ہیں، ایک وہ جن کا تعلق خود جنین سے ہو۔ مثلاً خلقی نقص، جسمانی اعتبار سے عدل اعتدال یا خطرناک موروثی امراض کا

۲ دیکھئے اعلاء السنن: ۲۷۷/۱۱، باب ماورد فی استمناء الید بکفه

وجود۔ ان اعذار کی بنا پر اسقاط کی اجازت دی جاسکتی ہے اس لئے کہ جب ''استبانت خلق'' سے پہلے بعض شرائط کے ساتھ اس مقصد کے لئے بھی اسقاط کی اجازت دی ہے کہ زیر پرورش بچہ کی رضاعت متأثر نہ ہو اور زیر بحث صورت میں خود پیدا ہونے والے بچہ کو پیدائش کے بعد جس ضرر قوی کا اندیشہ ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے رضاعت والے ضرر سے بڑھ کر ہے اس لئے ان صورتوں میں بدرجۂ اولیٰ اسقاط جائز ہونا چاہئے۔

دوسری قسم کے اعذار وہ ہیں جن کا تعلق ''ماں'' سے ہو، مثلاً ماں کی جان کو خطرہ ہو، دماغی توازن متاثر ہونے کا اندیشہ ہو۔ جسمانی یا دماغی طور پر معذور ہونے کی وجہ سے بچہ کی پرورش کرنے کی اہل نہ ہو اور دوسرے رشتہ دار بھی نہ ہوں جن سے توقع ہو کہ وہ اس بچہ کی پرورش کریں گے، زنا بالجبر سے حاملہ ہوگئی ہو، ان تمام صورتوں میں نفخ روح سے پہلے اسقاط جائز ہوگا۔ کیونکہ فقہاء نے اس سے کم تر قسم کے اعذار پر بھی اسقاط کی اجازت دی ہے، البتہ اگر ماں باپ یوں ہی اولاد نہ چاہیں اور اس غرض کے لئے اسقاط کرائیں یا ماں کی عام صحت پر اثر پڑنے کا اندیشہ ہو لیکن کسی غیر معمولی مرض کا امکان نہ ہو تو ایسی صورتوں میں نفخ روح سے قبل بھی اسقاط حمل درست نظر نہیں آتا۔

مانع حمل ادویہ

عارضی منع حمل کی یہ صورت کہ ایسی ادویہ استعمال کی جائیں کہ مرد کا مادۂ منویہ عورت کے جسم کے داخلی حصہ میں پہنچ جائے لیکن تولید کے لائق باقی نہ رہے، یہ بھی بلا عذر جائز نہیں۔ شمس الائمہ سرخسی حنفی فرماتے ہیں:

''ثم الماء فی الرحم مالم یفسد فھو معد للحیاۃ فیجعل کالحی فی ایجاب ذلک الضمان باتلافہ کما یجعل بیض الصید فی حق المحرم فی ایجاب الجزاء علیہ بکسرہ[1]

q المحلی: ۳۹۱/۱۱

D: ''مادۂ منویہ رحم میں جب تک فاسد نہ ہو اس وقت تک زندگی قبول کرنے کا اہل ہوتا ہے لہٰذا اس کو ہلاک کرنے پر تاوان واجب کئے جانے کے مسئلہ میں وہ زندہ وجود کی طرح ہے جیسا کہ محرم شکار کا انڈا توڑ دے تو وہ جزا واجب ہونے کے حق میں خود شکار کے درجہ میں ہے۔''

شیخ احمد علیش مالکی لکھتے ہیں:

''لا یجوز استعمال دواء لمنع الحمل واذا امسک الرحم المنی فلا یجوز للزوجین ولا لاحدھما ولا للسید التسبب فی اسقاطه قبل الخلق علی المشھور[1]''

D: ''منع حمل کے لئے ادویہ کا استعمال جائز نہیں اور جب رحم منی کو قبول کرلے تو زوجین یا ان میں سے ایک یا آقا کے لئے اعضاء کی تخلیق سے پہلے بھی قول مشہور کے مطابق اسقاط کی تدبیر کرنا جائز نہیں۔''

مانع حمل کے خارجی ذرائع

عارضی منع حمل کے لئے نرودھ کا استعمال کرنا یا عورت کے رحم پر کوئی غلاف چڑھا دینا بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ اوائل اسلام میں ''عزل'' کا ذکر ملتا ہے عزل کی اباحت اور کراہت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے اور اکثر شروح حدیث میں اس کی تفصیل موجود ہے، تاہم اکثر صحابہ اور سلف صالحین اس کو مکروہ ہی سمجھتے تھے۔[2] احناف کی طرف منسوب ہے کہ وہ اس کو بلا کراہت مباح سمجھتے ہیں لیکن ابن ہمام کا بیان ہے کہ مشائخ احناف میں بھی بعض اس کی کراہت کے قائل ہیں۔ ''فی بعض اجوبة المشائخ الکراھیة وفی بعضھا عدمھا'' مشہور حنفی محدث علی قاری نے عزل کے متعلق حدیث کے اس فقرہ ''ذلک الواد الخفی'' کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''لا یدل علی حرمة العزل بل یدل علی

w مجمع الزوائد: ۲۵۶/۶، بحواله طبرانی وابویعلی باب زنا الجوارح

الکراھۃ“۔ حقیقت یہ ہے کہ احادیث کے لب ولہجہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

نر دودھ کا عزل کے حکم میں ہونا تو واضح ہے، لوپ بھی، اسی حکم میں ہے اسی لئے فقہاء نے مرد کے عزل کرنے کے درست ہونے کو جس طرح عورت کی رضامندی پر مشروط رکھا ہے اسی طرح عورت کے فم رحم کے کسی طرح بند کرنے کو بھی مرد کی رضا مندی پر مشروط کیا ہے۔”یجوز للمرأۃ ان تسد فم الرحم منعا من وصول ماء الرجل الیہ لاجل منع الحمل واشترط صاحب البحر لذلک اذن الزوج[1] غور کیا جائے تو مقام مخصوص پر مانع حمل دواؤں کا لگانا بھی اسی حکم میں ہے، اس لئے کہ عزل اور لوپ کے استعمال سے...... مادۂ منویہ عورت کے رحم میں داخل ہی نہیں ہو پاتا اور اس قسم کی ادویہ کے استعمال سے بھی مرد کے مادۂ منویہ کے تولیدی جراثیم مرجاتے ہیں اور عورت کے رحم تک پہنچ نہیں سکتے ـــــ پس چوں کہ عزل مکروہ ہے اس لئے بلاعذر منع حمل کے ان ذرائع کا استعمال بھی مکروہ ہے اس سلسلہ میں بعض اعذار خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مثلاً:

ماں کے لئے ہلاکت کا خطرہ ہو، ان کی دماغی صحت یا جسمانی کمزوری یا کسی شدید مرض کا اندیشہ ہو، ماں بچہ کی پرورش کے لائق نہ ہو اور کوئی متبادل نظم نہ ہو، بچہ کے شدید امراض میں ابتلاء کا امکان ہو، دو بچوں کے درمیان مناسب فاصلہ رکھنا مقصود ہو، یہ اور اس طرح کے اعذار ہیں کہ ان کی وجہ سے ایسے عارضی موانع کا استعمال درست ہے، اس لئے کہ فقہاء نے اس سے کمتر امر مثلاً بچوں سے متوقع نافرمانی اور بدسلوکی کے خوف سے بھی عزل کی اجازت دی ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

---

e مجمع الزوائد بسند ضعیف: ۳۳۲/۸

q مجمع الزوائد: ۱۵/۵ عن ابن عمر باب فی من یبرأ عن ولدہ ووالدہ

C20

"رجل عزل عن امرأته بغير اذنها يخاف من الولد السوء فی ھذا الزمان فظاھر جواب الکتاب ان لا یسعه وذکر ھنا یسعه لسوء الزمان[2]۔"

چھوٹا خاندان رکھنے کے لئے اس کا استعمال درست نہیں کہ "تزوجوا الودود الولود[3]"، سماجی دل چسپی کے لئے سلسلۂ تولید پر تحدید بھی صحیح نہیں اور یہ اسلام کے منشأ اور صنف نازک کے فرائض مادری کے خلاف ہے، حسن و جمال کے تحفظ کے لئے لوگوں نے اس کو جائز رکھا ہے مگر جذبۂ حسن آرائی کو عورت کے فطری فرائض پر تفوق دینا بھی صحیح نہیں نظر آتا، اس لئے یہ اعذار عندالشرع ناقابل اعتبار ہیں، ہاں اگر خصوصی حالات کی وجہ سے ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے عورت کسب معاش پر مجبور ہو تو اس کو اجازت دی جاسکتی ہے، اسی طرح اقتصادی نقطۂ نظر سے اس وقت جو تحریک تحدید نسل کی چل رہی ہے وہ بے شک جاہلیت قدیمہ کی صدائے بازگشت ہے اور "لا تقتلوا اولادکم خشیة املاق" ناجائز ہے کیوں کہ آیت کریمہ میں صرف "قتل اولاد" ہی کی ممانعت نہیں ہے بلکہ "خشیة املاق" کے تصور کو بھی مذموم قرار دیا گیا ہے۔

فطری طریقہ

عارضی منع حمل کی یہ صورت کہ اس کے لئے کسی فعل کا ارتکاب نہیں کیا جائے بلکہ ان مخصوص ایام میں مجامعت سے باز رہا جائے جن میں طبی تحقیق کے مطابق استقرار کا زیادہ امکان ہو، فی نفسہٖ جائز ہے لیکن اگر ایسی نیت ہو جس کو شریعت کا مزاج قبول نہ کرتا ہو تو مکروہ ہوگا۔

ضبطِ تولید میں تعاون

w مجمع الزوائد: ۱۵/۵ عن ابن عمر باب فی من یبرأ عن ولده ووالده

’’منع حمل‘‘ کی جو صورتیں جائز نہیں، مسلمان ڈاکٹروں کے لئے ان میں تعاون کرنا درست نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ معصیت میں تعاون کی ممانعت فقہاء کے نزدیک مسلمہ ہے۔ خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے ”ولو اجر نفسه من ذمي ليعصر له فيتخذ خمرا يكره“[1] اس معاملہ میں مسلمان اور کافر کے درمیان تفریق صحیح نظر نہیں آتی، اس لئے کہ معصیت میں تعاون خود کافروں کے ساتھ درست نہیں گو ان کے دین میں اس کی اجازت ہو۔ فقہاء نے لکھا ہے:

”رجل له اب ذمي او امرأة ذمية ليس له ان يقوده الى البيعة وله ان يقوده من البيعة الى منزله لان الذهاب الى البيعة معصية والى المنزل لا۔“[۴]

طلاق

شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک پاکیزہ، ٹھوس اور پائیدار رشتہ ہے، اسلام چاہتا ہے کہ جن دو مرد و عورت نے نکاح کی صورت میں ایک ساتھ زندگی بسر کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھی بن کر رہنے کا عہد کیا ہے وہ ہمیشہ اس پر قائم رہیں اور معمولی معمولی باتوں اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی وقتی الجھنوں کی وجہ سے اس مضبوط رشتہ کو ڈھا نہ دیں۔

طلاق چوں کہ اسی رشتہ کے توڑنے کا نام ہے۔ اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا۔ حدیث میں ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی پیدا کر دی جائے۔[2] حضرت ثوبان سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو عورت بلا وجہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔[3] آپ نے نکاح کا حکم دیا اور طلاق سے منع فرمایا ہے۔ اس

e دیکھئے مجمع الزوائد: ۵/۱۳ باب الولد للفراش

لئے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح مزہ چکھنے اور ایک عورت یا مرد کی لذت اٹھا کر پھر اس سے جدائی اختیار کرنے والے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا۔[4] ایک اور روایت میں آپ نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں طلاق سے زیادہ کوئی شئے مبغوض نہیں۔[1] اسی لئے فقہاء نے بھی شدید ضرورت کے بغیر طلاق دینے کو ناجائز قرار دیا ہے، علامہ ابن قدامہ مقدسی فرماتے ہیں کہ بلاضرورت طلاق دینا مکروہ ہے۔ ایک اور بزرگ سے طلاق کا حرام ہونا نقل کرتے ہیں کیوں کہ یہ خود اس مرد کے لئے اور اس کی بیوی دونوں کے لئے نقصان کا باعث ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہ اپنا نقصان کرو اور نہ دوسرے کو نقصان پہنچاؤ۔ "لا ضرر ولا ضرار"[2] مشہور حنفی عالم علامہ سرخسی فرماتے ہیں:

"لا يباح ايقاع الطلاق الا عند الضرورة لقوله عليه السلام لعن اللّٰه كل ذواق مطلاق وقال ايما امرأة اختلعت من زوجها من نشوز فعليها لعنة اللّٰه والملئكة والناس اجمعين وقد روى مثله في الرجل يخلع امرأته ولان فيه كفران النعمة۔"[3]

D: "محض ضرورت ہی کے موقع پر طلاق دینا جائز ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ذائقہ چشی کرنے والے اور بہت زیادہ طلاق دینے والے پر اور جس عورت نے اپنے شوہر سے ناواجبی خلع کا مطالبہ کیا اس پر خدا اور تمام فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے اور اس طرح کے الفاظ اس مرد کے بارے میں بھی مروی ہیں جو اپنی

---

r هدایه: ۴۳/۲، باب ثبوت النسب

q سنن ترمذی

q دیکھئے عالمگیری: ۳۴۳/۳، مطبوعہ دیوبند

w دیکھئے البحر الرائق: ۱۱۹/۳ ----- تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی تحریر "ٹسٹ ٹیوب سے تولید اور

بیوی سے خلع کرے کہ یہ نعمت خداوندی کی ناشکری ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ وہ ضرورت کون سی ہے جس کی وجہ سے طلاق دی جا سکتی ہے؟ ارشاد ہوا: ''لا تـــطـــلـــق الـــنـســـاء [4] عورتوں کو طلاق نہ دی'' جائے مگر اس وقت جب کہ اس کا کردار مشکوک ہو۔ یوں صرف کردار کے مشکوک ہونے پر ہی موقوف نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی طلاق اور میاں بیوی کی جدائی ایک ضرورت اور مجبوری بن جاتی ہے۔ کسی وجہ سے زندگی کی راہ پر ایک ساتھ چلنا ممکن نہیں ہوتا اور حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے علیحدہ رہ کر ہی زندگی بسر کرنے میں دونوں کے لئے عافیت رہتی ہے، ان حالات میں جیسا کہ مذکور ہوا شریعت ایک ناپسندیدہ ضرورت سمجھ کر اس کی اجازت دیتی ہے۔

ابتدائی تدبیریں

تاہم قرآن یہ بھی ہدایت دیتا ہے کہ طلاق پہلے ہی مرحلہ میں نہیں دینی چاہئے، بلکہ ایسی تمام صورتوں کو عمل میں لانا چاہئے جن کے ذریعہ اصلاح حال ہو سکے اور آپسی اختلاف دور ہو جائے، اگر اس طرح بناؤ ہو جائے تو طلاق نہ دے، ارشاد ہے:

> ''جن عورتوں سے تم کو نافرمانی کا اندیشہ ہو ان کو سمجھاؤ اور بستروں پر ان کو علیحدہ کر دو، پھر اگر وہ تمہای فرمانبردار ہو جائیں تو ان پر سختی کے لئے بہانہ نہ ڈھونڈو۔'' [1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے وعظ و نصیحت اور سمجھاؤ سے کام لیا جائے اگر یہ کافی نہ ہو تو اپنی ناراضگی کے سنجیدہ اظہار کے لئے اپنی خوابگاہ اور بستر علیحدہ

اس کے احکام'' جدید فقہی مسائل حصہ دوم۔

e تخریج احیاء العلوم للعراقی: ۶۵/۲ بحوالہ طبرانی عن جابر

q تخریج احیاء العلوم للعراقی: بحوالہ مسلم w نور، آیت: ۹

کرلو۔یعنی وقتی طور پر پراس سے مباشرت کرنا چھوڑ دو۔ پھر اگر یہ گریز بھی عورت کی اصلاح نہ کر سکے تو مناسب حدوں میں اس کی فطری کمزوری اور نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے تھوڑی سی مار پیٹ بھی کر سکتے ہو۔اب اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو ایک بہتر رفیق زندگی کی طرح اس کے ساتھ رہو ـــــ ان تمام صورتوں کو اختیار کرنے کے باوجود اصلاح حال نہ ہو سکے اور عورت بے جا نافرمانی وزیادتی پر آمادہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ آپس میں اس بگاڑ کو دور کرنے سے قاصر ہیں۔لہٰذا ان حالات میں قرآن کا حکم ہے:

''اگر ان دونوں میں اختلاف کا شدید اندیشہ ہوتو مرد اور عورت دونوں کی طرف سے ایک ایک پنچ (حکم) کو بھیجو اگر یہ دونوں واقعی اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا، بے شک اللہ علیم وخبیر ہے۔'' 1

یعنی دوسرے سمجھدار، دیندار اور ہمدرد افراد کے ذریعہ باہم مصالحت کی کوشش کی جائے گی اور اس طرح آپسی خلش دور ہو جائے تو دونوں میاں بیوی کی طرح زندگی بسر کریں گے ـــــ لیکن اگر اس ثالثی اور پنچوں کی کوششوں کے باوجود دونوں میں موافقت پیدا نہ ہو سکے، ایک دوسرے سے متنفر ہوں اور عورت کی طرف سے نامناسب حد تک مسلسل عدول حکمی اور نافرمانی ہو رہی ہو تو اب شریعت طلاق کی اجازت دیتی ہے۔

طلاق کے سدِباب میں خواتین کا کردار

عورتیں بھی طلاق کے واقعات کم کرنے میں بڑا اور مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں ان کو چاہئے کہ مختلف طریقوں سے شوہر کو اپنی طرف راغب اور مائل رکھیں اور کوئی ایسی

q هدایه: ۴۲۰/۲ w بقره، آیت: ۲۲۸ e مجادله، آیت: ۳

بات پیش نہ آنے دیں جو باہمی نفرت اور آپسی اختلاف کا باعث بن سکتی ہے اس کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ پوری طرح شوہر کی مزاج شناس ہوں، وہ زندگی کے ہر گوشہ میں اس بات کا اندازہ لگاتی رہیں کہ وہ کس بات اور کس عمل سے خوش ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناخوش؟ پھر اگر کبھی ناراض ہو جائے تو اس کی کیا مرغوب چیز ہے جس کا سہارا لے کر اس کو خوش کیا جا سکتا ہے؟ کس بات اور کس ضرورت کے اظہار کے لئے مناسب وقت کیا ہے؟ جن خواتین نے اس رمز کو جان لیا اور اپنی ازدواجی زندگی میں اس کا خیال رکھا۔ ان کی زندگی ہمیشہ خوشگوار رہے گی اور انشاء اللہ طلاق کی نوبت نہ آئے گی۔

یہ تو ایک اصولی بات ہے اس کے علاوہ چند عمومی باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہئے:

اول یہ کہ مرد جب تھک کر اپنے کام سے واپس آئے، اس وقت پوری خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرے اور فوراً اپنی کوئی ایسی ضرورت نہ پیش کر دے جو مرد کے لئے پریشانی کا باعث ہو۔ حدیث میں نیک بیوی کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ شوہر اس کی طرف دیکھے تو وہ شوہر کو خوش کر دے ـــــ عورت اس حدیث کا مصداق اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس پر عمل کرے۔

دوسرے یہ کہ مرد کے لئے اپنے آپ کو سجا سنوار کر رکھے اور پوری طرح زیبائش و آرائش کرے۔ شریعت دوسروں کے لئے زیبائش و آرائش کی اجازت نہیں دیتی جبکہ شوہر کے لئے اس کو پسند کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے شوہر عفیف و پاکدامن رہتا ہے، بدنگاہی سے بچتا ہے اور دوسری عورتوں کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی۔

تیسرے اس بات کا خاص خیال رکھے کہ ایسے مردوں سے انتہائی بے توجہی برتے جن سے تعلق شوہر کو ناپسند گزرے، غیر محرم سے تو یوں بھی شریعت پردہ کا حکم

۲ ایلاء وظہار کے احکام کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی تالیف "طلاق و تفریق": ص ۴۸ تا ۵۳

دیتی ہے، لیکن خصوصاً ان لوگوں سے جائز حدوں میں بھی ربط نہیں رکھنا چاہئے جو شوہر کو ناپسند ہوں، اس معاملہ میں مرد کی طبیعت فطری طور پر بہت حساس واقع ہوتی ہے۔

چوتھے، شوہر سے اپنی ضروریات کے مطالبہ میں ایسا رویہ نہ اختیار کرے جس سے خودغرضی کا اظہار ہوتا ہو یا ایسا محسوس ہوتا ہو کہ گویا وہ شوہر کی حریف ہے، مثلاً شوہر کے پاس کپڑے ہوں یا نہ ہوں، اپنے لئے کپڑوں کا مطالبہ یا اگر شوہر کپڑا لائے تو اس کا مقابلہ۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ قناعت اور کفایت شعاری کی راہ اختیار کرے اور اپنے مقابلہ میں شوہر اور دوسرے اہل خانہ کی ضرورت کو مقدم رکھے، اس طرح جب وہ شوہر کے دل میں اپنا گھر بنالے گی تو خود بخود مرد وہ کام کرے گا جو وہ چاہتی ہے۔

ان کے علاوہ کھانے اور پکوان میں ایسا تنوع کہ مرد کا رجحان ہوٹلوں کی طرف نہ رہے۔ نیز اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ دوسروں کے پاس شوہر کی شکایت نہ کرے بلکہ اگر کبھی رنجش اور کبیدگی پیدا ہوگئی تو اپنے ہی حد تک اس کو محدود رکھے۔

طلاق کس طرح دی جائے؟

پھر اب بھی ایک دفعہ تین طلاقیں نہ دے دے بلکہ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ پاکی کی حالت میں (جس بیوی سے مباشرت نہ کی ہو) لفظ ''طلاق'' کے ذریعہ صرف ایک طلاق دی جائے۔ اس طلاق کے بعد اس کو یہ حق رہے گا کہ عدت گزرنے سے پہلے پہلے تک اگر اپنے فیصلہ پر پشیمانی یا عورت کی طرف سے ندامت کا اظہار اور بہتر زندگی کا وعدہ ہو تو بیوی کو لوٹا لے اور اگر وہ علیحدگی کے فیصلہ پر اٹل رہے تو یوں ہی چھوڑ دے، عدت گزرنے کے بعد خود بخود یہ رشتہ ختم ہو جائے گا۔

اگر اب بھی پشیمانی ہوئی اور زوجین کو خیال آیا کہ اس رشتہ کو باقی رہنا چاہئے تو از سرنو نکاح کر سکتا ہے۔ اگر پھر طلاق کی نوبت آئی تو پھر بھی بیوی کو لوٹانے کی گنجائش

باقی رہے گی لیکن اگر اس کے باوجود اصلاح حال نہ ہو پائے تو آخری چارۂ کار کے طور پر تیسری بار طلاق دے سکتا ہے لیکن یہ اجازت بالکل آخری درجہ میں ہے۔ ایک ہی دفعہ تین طلاقیں دے دینا سخت گناہ اور معصیت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بار ایک ہی شخص کو بیک وقت تین طلاق دینے کی اطلاع دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جوشِ غضب میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میں ابھی تمہارے درمیان موجود ہوں اور کتاب اللہ کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر خفا تھے کہ ایک صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ کیا میں اس کو قتل ہی نہ کر ڈالوں؟ [1] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو ایسے شخص کو کوڑے بھی لگائے ہیں۔[2]

لیکن اگر ایک ہی مجلس میں یا عورت کے ایک ہی طہر میں تین مختلف اوقات میں تینوں طلاقیں دے ہی دی جائیں تو تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی، حضرت حفص بن مغیرہ نے اپنی بیوی فاطمہ بنت قیس کو عہد رسالت ہی میں ایک ہی کلمہ میں تین طلاقیں دے دیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوی کو ان سے علیحدہ کر دیا۔[3] حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیوی عائشہ کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دیں۔ بعد کو بیوی کے ملال کا علم ہوا تو رونے لگے اور فرمایا کہ اگر میں نے اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات نہ سنی ہوتی کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ دوسرے شخص سے شادی کر لے تو میں اس سے رجوع کر لیتا۔[4]

جب طلاق دینا ممنوع ہے!

ایسا طہر یعنی پاکی کی حالت میں جس میں صحبت کر چکا ہو، طلاق دینا جائز نہیں، طلاق ایسے طہر میں دی جائے جس میں ہم بستری کی نوبت نہ آئی ہو۔
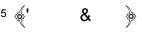
D:''عورت کی عدت کا لحاظ کرتے ہوئے طلاق دو۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس آیت کی شرح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ طلاق ایسے طہر میں دی جائے جس میں صحبت نہ کی گئی ہو۔" الطلاق فی طهر غیر جماعٍ'' 1

نیز حالت حیض میں طلاق دینے پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت تنبیہ فرمائی ہے، اس لئے کہ اِس زمانہ میں عورتوں کے مزاج میں فطری طور پر تیزی اور چڑ چڑاہٹ پیدا ہوتی ہے اور جسمانی ربط جو دونوں کی باہمی دلچسپی اور ایک دوسرے سے وابستگی کا بڑا ذریعہ ہے، بھی وقتی طور پر معطل رہتا ہے، اس لئے یہ سوچنے کی گنجائش موجود ہے کہ شاید ایسے ہی وقتی نزاع کی وجہ سے طلاق دے دی گئی ہو۔ عین ممکن ہے کہ یہ اوقات بیت جائیں اور پھر ان کے تعلقات معمول پر آ جائیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن عمر نے اپنی بیوی کو حیض کے زمانے میں طلاق دے دی۔ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن کر برہم ہوئے اور فرمایا کہ اسے حکم دے دو کہ رجوع کرے اور جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تب طلاق دے۔ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عمر کو اس فعل پر توبیخ فرمائی اور طلاق کے طریقہ کی اس طرح تعلیم دی:

''ابن عمر! تم نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ طہر کا انتظار کرو پھر ایک ایک طہر پر ایک ایک طلاق دو۔ پھر جب وہ تیسری مرتبہ پاک ہو تو اس وقت یا طلاق دے دو یا اس کو روک لو۔'' 2

q بخاری ومسلم عن سعد بن وقاص رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ
w الاحکام السلطانیة e فتح الباری: ۹/۹۸
r فتح العلی المالکی: ۱/۳۹۹ t فتاوی ابن تیمیہ: ۶/۲۱۸

پس اثرات اور نتائج کے لحاظ سے طلاق تین طرح کی ہوتی ہے، 1 طلاق رجعی 2 طلاق بائن 3 طلاق مغلظہ۔

طلاق رجعی

طلاق رجعی وہ طلاق ہے جس میں رشتۂ نکاح عادت گزر جانے کے بعد ختم ہوتا ہے۔عدت کے درمیان شوہر اپنی بیوی کو نئے نکاح کے بغیر لوٹا سکتا ہے اس کے لئے بیوی کی رضا مندی بھی ضروری نہیں ہے، شوہر کی طرف سے یکطرفہ اقدام کافی ہے۔[1]

رجعت کا طریقہ

طلاق رجعی کا مقصد ہی یہی ہے کہ اس طلاق کے بعد پھر سے غور وفکر کا موقع رہے۔اس لئے شوہر کو چاہئے کہ عدت گزرنے تک بار بار اس پر غور کرے، کوشش کرے کہ بیوی کی جو کچھ کمزوریاں ہیں وہ دور ہو جائیں اور اس کی چھوٹی اور معمولی کمزوریوں سے درگزر کر جائے۔ بیوی بھی کوئی ایسی بات نہ پیش آنے دے جو کشیدگی اور اختلاف کو بڑھاوا دے اور ایک دوسرے کے درمیان نفرت کی خلیج وسیع کر دے، بلکہ بناؤ سنگار اور زیب وزینت کرے، اپنی اداؤں سے شوہر کو لبھانے اور اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے اور اپنی غلطیوں کا اعادہ نہ کرنے کا عزم کر لے۔

اب اگر شوہر عدت کے درمیان رجعت کرنا چاہے تو اس کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے کہہ دے کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی مگر اب نادم ہوں اور اسے لوٹاتا ہوں۔یہی رجعت کا بہترین طریقہ ہے۔

ویسے اگر گواہ بنائے بغیر تنہائی میں یہ جملہ کہہ دے یا عورت کے ساتھ کوئی ایسی حرکت کر گزرا جو بیوی ہی کے ساتھ کی جاسکتی ہے مثلاً بوسہ لے لیا، مباشرت کر لی یا

---

q البحر الرائق: ۲۰۵/۸ w شرح السیر الکبیر

q رد المحتار: ۵۱۹/۵ w رد المحتار: ۵۵۲/۵

اس کے جسم کے شہوت انگیز حصوں کو شہوت کے ساتھ چھوئے یا اس کی شرم گاہ کو شہوت کے ساتھ دیکھے تو بھی رجعت کے لئے کافی ہے اور اس عمل کے بعد وہ اس کی بیوی برقرار رہے گی۔[1]

طلاق بائن

طلاق بائن یہ ہے کہ اس کی وجہ سے عورت اور مرد کے درمیان فوراً جدائی پیدا ہو جائے اور طلاق کے ساتھ ہی یکسر رشتۂ نکاح ختم ہو جائے۔ اس طلاق کے بعد عدت کے درمیان تو بیوی کو لوٹایا نہیں جا سکتا البتہ جب کبھی چاہیں آپسی رضا مندی اور آمادگی سے نیا نکاح کر سکتے ہیں۔

یہ طلاق اس وقت واقع ہوتی ہے جب الفاظ کنایہ سے طلاق دی جائے۔ یا یوں کہا جائے میں نے تم کو طلاق بائن دے دی، طلاق رجعی بھی عدت گزرنے کے بعد طلاق بائن بن جاتی ہے اور عدت گزرتے ہی فوراً میاں بیوی میں مکمل علیحدگی ہو جاتی ہے۔ چوں کہ طلاق بائن واقع ہونے کے بعد نکاح بالکل ختم ہو جاتا ہے اور عورت اس کی بیوی باقی نہیں رہتی اس لئے اگر ایک دفعہ کے بعد دوبارہ طلاق بائن دے یا عدت میں پھر طلاق بائن دینا چاہے تو یہ دوسری طلاق واقع نہیں ہوگی مثلاً کہا جائے میں نے تجھے طلاق بائن دی، میں نے تجھے طلاق بائن دی۔ تو ان دونوں میں سے صرف پہلی طلاق واقع ہوگی اور اگر ایک ہی لفظ میں ایک سے زیادہ طلاق دے دے جیسے ''میں نے تجھ کو دو طلاق بائن دے دی'' تو دونوں طلاق واقع ہو جائیں گی، ہاں اگر طلاق بائن کے بعد صریح لفظوں میں عدت ہی کے درمیان پھر طلاق دے دے (جسے طلاق رجعی کہتے ہیں) تو یہ طلاق بھی واقع ہو جائے گی۔[2]

---

q مبسوط: ۸۲/۲۹

یکجائی سے پہلے طلاق

وہ عورت جس سے مرد نے ابھی مباشرت نہ کی ہو اگر اس کو صریح لفظ طلاق سے بھی ایک طلاق دے دے تو یہ طلاق بائن ہوگی۔ اس کے بعد نکاح کے بغیر بیوی کو لوٹانے کی گنجائش نہیں رہے گی اور اس لئے اگر الگ الگ جملوں میں اس کو دو یا تین طلاق دی جائے تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔ دوسری اور تیسری طلاق واقع نہ ہوگی، مثلاً کہے، ''میں نے تجھے طلاق دی، میں نے تجھے طلاق دی۔'' تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔ ہاں اگر ایک ہی جملہ میں دو طلاق دے دی تو دونوں پڑ جائیں گی۔ جیسے کہے میں نے تجھ کو دو طلاق دی۔

تیسری طلاق نہ پڑنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ دونوں اگر پھر نکاح کرنا چاہیں تو حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی اور دوسری طلاق نہ پڑنے کی وجہ سے آئندہ اگر پھر آپسی رضا مندی سے نکاح ہوا تو شوہر کے لئے مزید دو طلاقوں کی گنجائش رہے گی اور دو طلاق کے بعد بیوی پر طلاق مغلظہ پڑ جائے گی۔

خلوتِ صحیحہ

وہ عورت جس سے مرد نے مباشرت تو نہ کی ہو مگر اس طرح یکجا اور تنہا ہو چکے ہوں کہ جنسی عمل کے لئے کوئی شرعی یا طبعی رکاوٹ باقی نہ رہ گئی ہو تو یہ بھی مباشرت ہی کے درجہ میں ہے اور اس کا حکم انہی عورتوں کا ہے جن سے ہم بستری ممکن نہ رہے ایسی یکجائی کو فقہ کی اصطلاح میں ''خلوت صحیحہ'' کہتے ہیں۔

طلاقِ مغلظہ

---

q فتح العلی المالکی: ۳۹۹/۱ w المحلی: ۳۹۱/۱۱، ۳۹۲

e مرقاۃ المفاتیح: ۴۹۱/۳

طلاق مغلظہ سے ایسی طلاق مراد ہے جس کے نتیجہ میں مرد اس عورت سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا جب تک کہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے مرد سے نہ ہو جائے اور وہ دوسرا شوہر مباشرت کے بعد طلاق دے دے یا مر جائے اور عورت اس کی طلاق یا موت کی عدت بھی گزار لے، اب وہ اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال ہو سکتی ہے اور نکاح کر کے پھر سے میاں بیوی کی طرح رہ سکتی ہے۔[1]

طلاق رجعی میں عدت گزرنے کے بعد اور طلاق بائن اور طلاق مغلظہ میں طلاق دینے کے ساتھ ہی میاں بیوی کی حیثیت ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی شخص کی ہو جاتی ہے۔ ان عورتوں کو اپنے ان سابق شوہروں سے پردہ کرنا چاہئے اور عدت گزرتے ہی شوہر کے گھر سے چلا جانا چاہئے۔

حلالہ

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ طلاق مغلظہ کے بعد وہ عورت اپنے شوہر کے لئے اس وقت حلال ہو گی جب:

1. ابھی اس وقت جو طلاق واقع ہوئی ہے اس کی عدت گزر جائے۔
2. پھر کسی اور مرد سے صحیح طور پر نکاح کرے۔
3. نکاح کے بعد وہ مرد اس سے جنسی ملاپ کرے۔
4. پھر وہ اپنے طور پر طلاق دے دے یا اس کی موت ہو جائے۔
5. اور عورت اس شوہر کی موت یا طلاق کی عدت گزار لے۔

اسی کو ''حلالہ'' بھی کہتے ہیں۔[2]

آج کل ایک غلط رسم یہ چل پڑی ہے کہ لوگ اسی نیت سے نکاح کرتے یا کراتے ہیں کہ مباشرت کے بغیر یا مباشرت کے بعد طلاق دے دیں گے اور عورت پھر اپنے سابق شوہر کے لئے حلال ہو جائے گی ــــــ تو اگر مباشرت کے بغیر ہی

طلاق دے دی تب تو وہ اپنے سابق شوہر کے لئے حلال ہی نہیں ہوگی اس لئے کہ دوسرے شوہر کا ہم بستر ہونا ضروری ہے اور حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔[3]

اور اگر مباشرت کے بعد طلاق دی تو وہ اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال تو ہو جائے گی مگر جس شخص نے حلالہ کی نیت سے نکاح کیا تھا اور جس نے کرایا تھا دونوں ہی سخت گناہ گار ہوں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت ہو۔[1] ہاں اگر کسی نے ایسی نیت کے بغیر نکاح کیا اور یوں ہی کسی وجہ سے طلاق دے دی تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

خلع

جس طرح مرد کے لئے طلاق کا حق دیا گیا ہے اسی طرح عورت کے لئے خلع کی گنجائش فراہم کی گئی ہے، خلع یہ ہے کہ عورت مرد کو کچھ مال دے کر یا مرد کے ذمہ اس کا جو کچھ باقی ہے اس کو معاف کر کے بدلہ میں طلاق حاصل کر لے اور اس طلاق کے لئے خلع کا لفظ استعمال کرے، اس کی وجہ سے طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے۔[2]

خلع شریعت میں ایک ناپسندیدہ چیز ہے، اس لئے کہ میاں بیوی کی علیحدگی کی وجہ سے خاندان کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، بال بچوں کی پرورش اس طرح نہیں ہو پاتی جس طرح ہونی چاہئے۔ اکثر اوقات ان کو باپ کی شفقت یا ماں کی ممتا میں سے کسی ایک سے محروم ہونا پڑتا ہے اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس سے بچنا چاہئے اور اس بات پر نظر رکھنی چاہئے کہ عین ممکن ہے اس ظاہری شر میں اللہ تعالیٰ نے کوئی خیر اور بھلائی رکھی ہو۔

---

q ردالمحتار: ۵۱۲/۲ — w عالمگیری: ۱۱۲/۵ — e حدیث

q خلاصۃ الفتاوی: ۵/ ۳۵۹

q خلاصۃ الفتاوی: ۵/ ۳۵۸ — w صحیح مسلم

حدیث میں ہے کہ جو عورت بلا وجہ خلع کا مطالبہ کرے اس پر خدا، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہوتی ہے۔[3] ایک اور حدیث میں ہے کہ جس عورت نے کسی خاص اور ضروری سبب کے بغیر شوہر سے طلاق کا مطالبہ کیا، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہوگی۔[4] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاضرورت خلع کا مطالبہ کرنے والی عورت کو منافق قرار دیا ہے۔[1] اس لئے معمولی شکایتوں، چھوٹی چھوٹی باتوں یا محض تجدید لذت اور نیا مزہ چکھنے کی خاطر شوہر سے طلاق کا مطالبہ سخت گناہ کی بات ہے۔ اسی طرح ایسی چیزوں پر خلع کا مطالبہ جو شرعاً جائز ہیں، نہایت نامناسب اور ناپسندیدہ ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں عام طور پر شوہر کی دوسری شادی کر لینے کی وجہ سے عورتیں طلاق کا مطالبہ کرنے لگتی ہیں حالاں کہ یہ دوسری شادی اس کی طرف سے ظلم اور ناانصافی کا باعث نہ بنے تو جائز اور درست ہے اور اس پر طلاق کا مطالبہ غلط ہے۔

ہاں اگر کسی وجہ سے اس بات کا قوت اندیشہ ہو کہ وہ دونوں ایک ساتھ زندگی بسر نہ کر سکیں گے، آپس میں سخت نفرت اور تناؤ کی فضا پیدا ہوگی اور تعلقات اس مرحلہ میں آئیں گے کہ ایک دوسرے کے حقوق میں کوتاہی کا اندیشہ پیدا ہو تو اب شریعت اس کی اجازت دیتی ہے اور جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو مرد کا بھی فریضہ ہے کہ وہ بیوی کے مطالبہ پر اسے طلاق دے دے اور اپنے لئے کسی نئی ساتھی کا انتخاب کرلے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ شوہر کے زدوکوب کرنے یا اس کے بدصورت ہونے کی بنا پر بیوی نے خلع کی خواہش کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر میں دیا ہوا سامان بیوی سے واپس دلا کر شوہر کو حکم دیا کہ وہ طلاق دے دیں۔[2] اور ہمارے ہندوستانی سماج میں تو عموماً عورتیں اسی وقت اس قسم کے مطالبات کرتی ہیں جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے اور آپسی تناؤ اور کشیدگی حد سے درجہ بڑھ جاتی ہے۔

e ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، باب ماجاء فی المختلعات

خلع میں دو باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ ایک تو شوہر کا طلاق پر آمادہ ہو جانا، دوسرے عورت کی طرف سے اس کا کچھ معاوضہ۔ اگر شوہر طلاق پر آمادہ نہ ہو تو عورت یکطرفہ اس طرح خلع نہیں کر سکتی جیسے مرد کو طلاق کا اختیار حاصل ہے البتہ اس کے لئے یہ گنجائش رہتی ہے کہ مرد کی واقعی زیادتی اور علیحدگی کے لئے معقول وجہ ثابت کر کے قاضی شرع کے یہاں سے اپنا نکاح توڑ ڈالے۔

خلع میں عورت کی طرف سے دیئے جانے والے معاوضہ کی حیثیت یوں تو آپسی معاہدہ کی ہے اور وہ دونوں باہم اس کی جو کچھ قیمت طے کریں وہی معاوضہ ہوگا لیکن شریعت نے اس کے لئے کچھ مناسب حدیں مقرر کر دی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے کہ اگر زیادتی خود مرد کی جانب سے رہی ہو تو اس کو طلاق کا کچھ معاوضہ نہیں لینا چاہئے اور یوں ہی طلاق دینا چاہئے، اس لئے کہ شریعت نے شوہر کے لئے دو ہی راہ رکھی ہے۔ ایک خوش اسلوبی کے ساتھ رکھنا (امساک بالمعروف) یا بھلے طور پر شائستگی کے ساتھ چھوڑ دینا (تسریح بالاحسان) اب چوں کہ وہ پہلے طریقہ پر عمل نہیں کر پا رہا ہے تو اسے اس دوسرے راستہ کا انتخاب کر لینا چاہئے اور اگر خود عورت ہی کی طرف سے زیادتی ہو تو زیادہ سے زیادہ اتنا معاوضہ لینا چاہئے جو بطور مہر مرد نے اس کو دیا ہے اس سے زیادہ بہر حال نہ لے اور اگر ابھی مہر ادا ہی نہ کیا ہو تو اس کی معافی کی شرط پر طلاق دے دے۔[1]

عدت

شوہر سے علیحدگی یا اس کی موت کے بعد شریعت نے ایک مخصوص مدت متعین کی ہے جس میں عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کر سکتی، اسی مدت کا نام عدت ہے عدت کا مقصود شوہر سے جدائی پر غم و افسوس کا اظہار، اس کی موت پر سوگ اور اس بات

۲ ان اللّٰہ لا یحب الذواقین والذواقات، مجمع الزوائد: ۳۳۵/۴ باب فیمن یکفر الطّلاق

کا اطمینان کر لینا ہے کہ اب اس عورت کے رحم میں پہلے شوہر کا مادہ بالکل نہیں ہے اس لئے اب اگر وہ دوسری شادی کرے تو اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ نسب میں اختلاط پیدا ہو اور اشتباہ ہو جائے کہ نہ جانے بچہ کس مرد کا ہے؟

عدت دو طرح کی ہوتی ہے، طلاق کی عدت اور وفات کی عدت۔

طلاق کی عدت

یہ عدت مختلف عورتوں کے لئے مختلف ہے:

اگر حاملہ ہو تو عدت بچہ کی پیدائش تک ہے، بچہ پیدا ہوتے ہی اس کی عدت مکمل ہو گئی[1] حاملہ نہ ہو مگر ماہواری کا سلسلہ جاری ہو تو جس پاکی میں طلاق دی گئی ہے اس کے بعد تین حیض تک عدت گزارے گی اور اگر مسنون اور بہتر طریقہ کے خلاف ناپاکی کی حالت میں طلاق دی ہے تو اس ناپاکی کے علاوہ مزید تین حیض عدت گزارنی ہوگی[2] حاملہ نہ ہو اور بچپن کی وجہ سے ابھی خون آنے کی ابتدا ہی نہ ہوئی ہو یا درازی عمر کی وجہ سے ماہواری کا سلسلہ بند ہو گیا ہو تو اس کی عدت تین مہینے ہے[3] اگر طلاق پہلی تاریخ کو دی ہو تو قمری مہینہ کے حساب سے تین ماہ عدت گزاری جائے گی اور اگر مہینہ کے درمیان میں ایسی نوبت آئے تو نوے دن عدت کے شمار کئے جائیں گے[4] اس عورت کو جس کے ساتھ مرد کی یکجائی کی نوبت ہی نہ آئی ہو، طلاق کی عدت گزارنے کی ضرورت ہی نہیں ہے[5]

طلاق رجعی کی عدت میں عورت کو خوب بناؤ سنگار اور زیب و زینت کرنا چاہئے تاکہ اس کی طرف مرد کی طبیعت کا میلان ہو، نیز چوں کہ طلاق رجعی کے بعد عدت ختم ہونے تک وہ پہلے ہی شوہر کی زوجیت میں رہتی ہے اس لئے صراحۃً یا اشارۃً کسی دوسرے مرد کے لئے درست نہیں کہ اسے نکاح کا پیغام دے[6]

---

q ابوداؤد عن ابن عمر باب کراھیة الطّلاق: ۲۹۶/۲

طلاق بائن اور مغلظہ کے بعد عورت فوراً زوجیت سے نکل جاتی ہے اور بیوی باقی نہیں رہتی، لہٰذا اس جدائی پر اظہار افسوس کے لئے اسے زیب و زینت سے مکمل احتراز کرنا چاہیئے، خوشبو نہ لگائے، شوخ کپڑے نہ پہنے، زیورات بھی استعمال نہ کرے، کریم، پاؤڈر، سینٹ اور عطریات وغیرہ سے پرہیز کرے اور اسی مکان میں عدت گزارے جس میں طلاق کا واقعہ پیش آیا ہے، کہیں دوسری جگہ نہ جائے اور نہ اس کو نکاح کا پیغام دیا جائے۔[1]

وفات کی عدت

اسلام سے پہلے ایام جاہلیت میں عدت گزارنے کے بڑے بھیانک، انسانیت سوز اور دردناک طریقے رائج تھے، ایسی عورتوں کو پورے سال ایک تنگ و تاریک اور بدبودار کمرہ میں بند کر دیا جاتا تھا اور ان پر جانوروں کی غلاظتیں ڈالی جاتی تھیں نیز ان بدنصیب اور مصیبت زدہ بیوہ عورتوں کو منحوس اور نامبارک تصور کیا جاتا تھا، ان پر زندگی بھر کے لئے بیوگی کی حالت میں دنیا کی تمام نعمتیں حرام ہو جاتی تھیں، ہندو مذہب میں تو بیوی اپنے آپ کو شوہر کے ساتھ جلا ڈالنا مذہبی اور منصبی فریضہ ہی سمجھتی تھی، اسلام نے آکر اس غیر مہذب اور غیر انسانی وحشیانہ طریقہ کی اصلاح کی، ایک طرف انسانیت کی اس مظلوم صنف عورت پر ہونے والے مظالم کا سد باب کیا، دوسری طرف شوہر کے احسانات کی رعایت اور اس کے بلند درجہ کا احترام ملحوظ رکھا۔ عورت کو ہونے والے فطری غم واندوہ کے اظہار کی جائز صورت نکالی اور نسب کو اختلاط سے محفوظ رکھا۔

شوہر کے انتقال کے بعد سوگ کے بطور جو عدت واجب ہوتی ہے وہ بالغہ اور

---

w المغنی: ۷/۳۳۶   e المبسوط: ۶/۲

r مجمع الزوائد: ۴/۳۳۵ باب فیمن یکثر الطّلاق وسبب الطّلاق

q نساء، آیت: ۶

q نساء، آیت: ۳۵

نابالغہ دونوں پر ہے، چاہے ابھی یکجائی کی نوبت آئی ہو یا نہیں [2]

اس عدت میں بھی بالغہ عورتوں کے لئے زیبائش و آرائش، زیور، خوشبو، کنگھی کے ذریعہ مانگ نکالنا، بلاضرورت و بیماری سر میں تیل ڈالنا یا سرمہ لگانا، پان کھانا وغیرہ ممنوع ہے [1]

اس عدت کی مدت ان عورتوں کے لئے جو حاملہ نہ ہوں چار مہینے دس دن ہیں [2]
اور حاملہ کی عدت یہ ہے کہ ولادت ہو جائے یعنی جب تک اتنا وقت نہ گزر جائے وہ نہ دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور نہ گھر چھوڑ کر ادھر ادھر جا سکتی ہے [3]

چار مہینے دس دن تک سوگ کی اجازت صرف شوہر کی موت پر ہے اور کسی رشتہ دار کی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ جائز نہیں، سر کے درد کی وجہ سے تیل اور آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے سرمہ لگانے کی اجازت ہے البتہ اگر رات میں سرمہ لگانا کافی ہو جائے تو دن میں نہ لگائے اور سفید سرمہ سے کام چل جائے تو سیاہ سرمہ کا استعمال نہ کرے۔

موت کی عدت کے درمیان اشارۃً نکاح کا پیغام دے سکتے ہیں، اشارۃً پیغام کی صورت یہ ہے کہ کہے میں نکاح کرنا چاہتا ہوں یا یہ کہ میں ایسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں جس میں یہ باتیں ہوں اور وہ باتیں بیان کرے جو اس عورت میں ہوں، شوہر کی موت کے وقت عورت جس مکان میں رہا کرتی تھی اسی میں عدت گزارنی چاہئے ہاں کسی مجبوری کی وجہ سے دوسرے مکان میں منتقل ہو سکتی ہے۔ مجبوری کی صورت یہ ہے کہ مثلاً شوہر کے ورثاء گھر سے نکال دیں یا کرایہ کا مکان ہو، مالک مکان کرایہ طلب کرے اور اتنی گنجائش نہ ہو کہ کرایہ ادا کر سکے [4]

موت کی عدت میں اگر باہر جانے کی ضرورت ہو اور کوئی لانے والا نہ ہو تو باہر جا سکتی ہے مگر ضرورت سے زیادہ باہر نہ ٹھہرے اور رات اپنے گھر آ کر گزارے اس طرح

۹ نسائی عن محمود بن لبید، باب الثلث المجموعہ وفیہ من التغلیظ: ۹۹/۲

کہ رات کا اکثر حصہ اپنے گھر پر بسر ہو۔[5]

عورت اپنے میکے یا کہیں اور چلی گئی ہو تو بلا تاخیر فوراً واپس آ جانا چاہئے اور شوہر کے دیئے ہوئے مکان میں عدت گزارنی چاہئے، عدت اسی مکان میں گزارنی ہوگی جو اسے شوہر کی طرف سے ملا تھا، طلاق یا خلع یا کسی اور وجہ سے تفریق ہوئی ہو تو بالغہ عورت کے لئے گھر سے نکلنا جائز نہیں، نابالغہ طلاق رجعی کی عدت میں شوہر کی اجازت سے اور طلاق بائن میں بلا اجازت جاسکتی ہے۔

طلاق بائن اور مغلظہ کی عدت میں ضروری ہے کہ مکمل پردہ ہو اور ایک دوسرے کے سامنے بالکل نہ آئے۔ عورت کا اس کے سامنے بدن چھپانا کافی نہیں، اس لئے کہ گزشتہ تعلقات کی بناء پر دونوں میں حجاب کم رہ گیا ہے اور فتنہ کا اندیشہ بڑھ گیا ہے ہاں طلاق رجعی میں پردہ کی ضرورت نہیں ـــــ طلاق دی ہوئی عورت کو چاہے وہ ابھی عدت ہی میں ہو شوہر سفر میں ساتھ نہیں لے جاسکتا۔

زانیہ کے احکام

عدت کا مقصد چوں کہ سابق رشتہ کا احترام اور اس تعلق کی رعایت ہے اور زنا ایک بدترین اور ناروا تعلق کی صورت ہے، اس لئے زنا کی کوئی عدت نہیں ہے یہاں تک کہ اگر وہ حاملہ ہو تو اس حالت میں بھی نکاح کر سکتی ہے۔ اب اگر اس نے اسی زانی سے نکاح کیا ہے تو وہ کسی انتظار اور مہلت کے بغیر مباشرت بھی کر سکتا ہے اور اگر اس کے ساتھ کسی اور شخص نے نکاح کیا تو نکاح درست ہوگا مگر مباشرت اس وقت تک جائز نہ ہوگی جب تک ولادت نہ ہو جائے۔[1]

%

w بیھقی e دار قطنی

r بیھقی t الطّلاق، آیت: ۱

دسواں باب

کسبِ معاش

انسان کو اس دنیا میں اللہ کی بندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور یہی اس کا اصل مقصود ہے لیکن رب کائنات نے اس کو ادراک و احساس اور شعور و جذبات کی زبردست قوتوں سے بھی سرفراز فرمایا ہے اور نوع بہ نوع ضرورتیں اور تقاضے بھی اس کے جسم کے ساتھ لگا دیئے ہیں آنکھوں کو خوش کن مناظر کی تلاش ہے، شامہ عطر بیز اور روح افزا بو کا طالب ہے، زبان چاہتی ہے کہ اپنے نطق و گویائی کے جوہر ظاہر کرے اور اس کے لئے بہتر سے بہتر وسائل اختیار کرے، پیٹ اور بھوک کے تقاضے ان سب سے سوا ہیں کہ کیا پانی اور کیا خشکی بلکہ فضا ہر جگہ اس نے اپنی آسودگی کا سامان دریافت کیا ہوا ہے۔ ایک اہم داعیہ فطرت صنفی ونفسانی جذبات کا بھی ہے جس پر نسل انسانی کی افزائش اور اس کی بقا موقوف ہے اس کے علاوہ قلب ونظر اور عقل وخرد کے دسیوں تقاضے ہیں جو اس کی زندگی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، ان سے منہ موڑنا اور ان کے گلے گھونٹنا بظاہر اس کے لئے ممکن نہیں۔

دنیا کے بعض مذاہب نے انسان کو اسی انہونی پر مجبور کیا لیکن چوں کہ یہ ایک غیر فطری بات تھی، اس لئے مذہب کے بعض غالی اور پرجوش معتقدین نے کچھ دن تو ضرور اس بیڑی کو پہننے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی اس بوجھ کو کاٹ پھینکا، اس کے لئے

q مجمع الزوائد: ۴/۳۳۶ باب طلاق السنة بحوالہ طبرانی
w بخاری و مسلم عن ابن عمر باب تحریم طلاق الحائض: ۴۷۵/۱

انھوں نے یہ تدبیر نکالی کہ زندگی کو دین و دنیا کے دو خانوں میں تقسیم کر دیا، عبا داتی رسوم میں دین کو حکم بنایا اور زندگی کے عمومی معاملات میں مذہب کو مداخلت سے روک دیا، اس کے مقابلہ میں وہ نظام ہائے حیات ہیں جن کی تاسیس وترکیب انسانی عقل ودانش کے ہاتھوں ہوئی۔ان لوگوں نے انسانی عقل و جذبات کو حکم اور فیصل مانا اور کسی قید و بند کے بغیر بظاہر انسان کو آزاد اور حقیقتاً اس کی خواہشات کا غلام بنا کر رکھ دیا۔

اسلام نے اپنے خاص مزاج کے مطابق دونوں کے درمیان اعتدال وتوازن قائم کیا اور اس کے لئے دین و مذہب اور عبادت و بندگی کے مفہوم میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کر کے انسانیت کو متوازن، فطرت سے ہم آہنگ اور انقلابی تصور حیات عطا کیا —— اس نے کہا کہ انسانی جسم اللہ کی امانت ہے اور اس کی فطرت خالق کائنات کا عطیہ ہے، اس لئے مناسب حدود میں اس کی رعایت اور حفاظت خالصۃً مذہبی عمل ہے۔ایک مسلمان مسجد میں ہو یا گھر میں، بازاروں میں ہو یا کارخانوں میں، دفتروں میں ہو یا انصاف گاہوں میں، وہ رکوع اور سجدہ میں مشغول ہو یا سڑک پر تپتی ہوئی دھوپ میں، رکشا چلا رہا ہو، آہ سحر گاہی سے اپنی صبحوں کو گرم رکھتا ہو یا صبح دم اللہ کا نام لے کر اس کی زمین میں ہل جوتتا ہو، تسبیح و وظائف میں مشغول ہو یا اپنے بوڑھے والدین اور کمزور بچوں کی آنتوں کو ٹھنڈی رکھنے کے لئے گرم پسینے بہا رہا ہو، اس کے ہاتھ بارگاہ خداوندی میں عرض و نیاز کے لئے اٹھے ہوئے ہوں یا حلال روزی کے حصول کے لئے سخت کاموں کی وجہ سے کھردرے ہو گئے ہوں، بہر کیف و بہر طور اگر خدا کی مقدر کی ہوئی حلال وطیب رزق کی تلاش مقصود ہو اور خدا کے واجب کئے ہوئے حقوق کی ادائیگی پیش نظر ہو اور ہر موقع اور ہر گام پر خدا کے عدول حکمی سے بچتا ہو، اسی کی رزاقیت پر بھروسہ ہو تو وہ عین حالت عبادت میں ہے اور ایک کار دین میں مشغول ہے کہ جس خدا کی خوشنودی کی تلاش میں اس نے مسجد میں جبین بندگی زمین پر رکھ دی تھی، اسی کی اطاعت اور فرماں برداری کے لئے وہ تجارت گاہوں اور زراعت گاہوں

میں اپنے پسینے بھی نثار کر رہا ہے ـــــ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے غالباً دست بوسی کا ایک ہی واقعہ منقول ہے اور وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے ہاتھ کو بوسہ دیا جس کی ہتھیلیاں محنت ومشقت کی وجہ سے سخت ہوگئی تھیں۔

اسلام میں کسبِ معاش کی اہمیت

اسی لئے اسلام میں کسب معاش کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے خود یہ ارشادفرمایا کہ دین کی یہ روشنی اسی لئے ہے کہ تلاش معاش میں سہولت ہو ﴿ G H I J﴾[1] زمین کے بارے میں ارشادفرمایا کہ وہ بھی تمہارے لئے حصول معاش کا ذریعہ ہے۔ ﴿ ¤ ¥ ¦ § ¨﴾[2] طلب معاش کو جائز اور درست قرار دیا گیا ہے۔[3] کسب معاش کے لئے سفر کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی۔[4] بلکہ کسب معاش اور اس کے لئے تگ ودو کا حکم فرمایا گیا ﴿ ;< = > ? @ A﴾[5]

احادیث بھی کسب معاش کی فضیلت کے سلسلہ میں بھری پڑی ہیں، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچے اور امانت دار تاجر کو فرمایا کہ اس کا حشر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔[6] آپ نے فرمایا کہ بہتر آدمی کے لئے مال حلال بہتر شئی ہے۔[7]

یہی مزاج بعد میں سلف صالحین کا رہا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں بے کار آدمی کو ناپسند کرتا ہوں، چاہے امور دنیا میں ہو یا امور آخرت میں۔[8] زید بن مسلمہ کاشت کاری کیا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی تعریف کی اور فرمایا کہ اس طرح تمہارے دین کی حفاظت ہوگی اور لوگوں کے سامنے تمہاری شرافت باقی رہے گی۔[1] ابراہیم نخعی سے پوچھا گیا کہ سچا تاجر زیادہ بہتر ہے یا وہ شخص جس نے خود کو عبادت کے لئے فارغ کرلیا ہو؟ فرمایا: سچا تاجر! کیوں کہ وہ ناپ تول اور لین دین میں گویا شیطان سے جہاد کرتا ہے۔[2] امام احمد رحمہ

اللہ تعالیٰ سے ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو گھر یا مسجد میں بیٹھا رہے اور کہے کہ میں کچھ نہیں کروں گا تاآنکہ میری رزق خود میرے پاس آجائے، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسا شخص جاہل ہے۔[3]

گداگری کا سدباب

اسی لئے اسلام نے قناعت اور توکل کے جاہلانہ اور رہبانی تصور کو رد کردیا، ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ جانور باندھ لوں پھر توکل کروں یا جانور کو کھلا چھوڑ دوں پھر توکل کروں؟ ارشاد فرمایا کہ جانور کو باندھ لو پھر توکل کرو۔[4] یعنی اسباب ظاہری کو اختیار کیا جائے اور اس کے نتیجہ کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے جیسا کچھ بھی نتیجہ ظاہر ہو اس پر راضی رہا جائے، نہ یہ کہ اسباب ہی نہ اختیار کئے جائیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خوب فرمایا ہے کہ بعض لوگ کسب معاش نہیں کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ روزی دے حالانکہ تم جانتے ہو کہ آسمان سونا چاندی نہیں برساتا۔[5]

اسلام گداگری اور بھیک منگی کا سخت مخالف ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات کہ تم میں سے ایک شخص اپنی پشت پر لکڑی کا گٹھا اٹھائے اس بات سے بہتر ہے کہ دوسرے کے سامنے دست سوال دراز کرے اور چاہے تو اسے دے یا نہ دے۔[1] اس لئے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔[2] ایک اور روایت میں ہے کہ سوال ایک زخم ہے جس سے

q بدائع الصنائع: ۹۴،۹۳/۳
q ھدایہ: ۳۷۵،۳۷۴/۲ باب الرجعۃ
w خلاصۃ الفتاوی: ۸۷/۲، الصریح یلحق البائن
q البقرہ، آیت: ۲۰۳ w البقرہ، آیت: ۲۳۰
e حدیث میں حضرت رفاعہ اور ان کی بیوی کا واقعہ صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ بخاری عن عائشہ باب

انسان اپنے چہرے کو زخمی کرتا ہے، سوائے اس کے کہ امیر اور بیت المال سے مانگا جائے یا بحالت مجبوری سوال کیا جائے۔[3] ایک صحابی خدمت اقدس میں آئے جو مانگ کر اپنی ضرورت پوری کیا کرتے تھے، ان کے پاس صرف پیالہ اور ٹاٹ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سامان منگایا، ڈاک لگائی اور دو درہم میں اس کو فروخت کیا۔ ایک درہم اس کی ضروریات کے لئے دیا اور ایک درہم میں کلہاڑی بنادی تاکہ لکڑی کاٹ سکے اور بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر سکے۔[4]

اسی لئے فقہاء اسلام نے بیت المال میں ایسے مجبور اور مفلوک لوگوں کا حق رکھا ہے تاکہ مسلمانوں کے سماج کو اس لعنت سے محفوظ رکھا جا سکے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسے سائلین اور فقراء کے لئے مستقل حق رکھا[5] کہ ایسے ضرورت مندوں کو بار بار ہاتھ نہ پھیلانا پڑے ——— نیز نفقہ اور کفالت کا ایک ایسا جامع قانون بنایا کہ سماج کا کوئی بوڑھا اور بچہ، عورت اور اپاہج نیز بے روزگار بالکل بے سہارا نہ ہو جائے۔

کسب معاش میں اعتدال

جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسب حلال کی تلقین فرمائی ہے اس کو سراہا ہے اور حوصلہ افزائی فرمائی ہے وہیں یہ بھی ہدایت دی ہے کہ اس میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کی حرص اور طمع بعض اوقات انسان کے ذہن ودماغ پر جنون وآسیب کی طرح سوار ہو جاتی ہے اور وہ اس میں ایسا اندھا ہو جاتا ہے

من اجاز طلاق الثلاث: ص۲۹۱

q ابن ماجه w فتح القدير: ۱۹۹/۳ e ابوداؤد r ابوداؤد، باب الخلع

q نسائی باب ماجاء فی الخلع: ۱۰۷/۲

w ابوداؤد باب الخلع: ص۳۰۳

کہ حلال وحرام کی ساری حدوں کو پھلانگ جاتا ہے، تہذیب واخلاق کی دیواروں کو ڈھا دیتا ہے اور خدافراموشی اور خودفراموشی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دولت مال کی کثرت کا نام نہیں بلکہ قلب کے استغناء کا نام ہے، جو کچھ مقدر میں ہے وہ مل کر رہے گا اس لئے طلب معاش میں اعتدال سے کام لو"فاجملوا فی الطلب"غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے خصوصیت سے اس کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ جیسے موت انسان تک پہنچ کر رہتی ہے اسی طرح رزق انسان تک پہنچ کر رہتا ہے[2] اسی لئے قرآن مجید نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے جن کے لئے تجارت اور کاروبار دنیا نماز وزکوۃ اور ذکر الٰہی کے لئے رکاوٹ نہیں بنتی تھی ﴿ ! " # $%& ' ( ) * + , - . ﴾[3] اور اسی لئے حدیثوں میں بازار کو خراب جگہ قرار دیا گیا ہے"ابغض البقاع الی اللّٰہ الاسواق"[4]

کسب معاش میں اعتدال یہ ہے کہ فرائض وواجبات سے غفلت نہ ہو، حرام اور ممنوع طریقوں کا ارتکاب نہ ہو، حسد اور رقابت کی آگ سے اپنے سینوں کو نہ جلائے اور دین وآخرت کی فکر کے بجائے صرف طلب دنیا کو اپنی تمام فکر اور عمل کا مقصود ومطلوب نہ بنالے۔"اللھم لا تجعل الدنیا اکبر ھمنا۔"

بہتر ذریعہ معاش

مشہور عالم علامہ ماوردی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ بنیادی طور پر کسب معاش

q در مختار: ۵۵۸/۲

q الطّلاق، آیت: ۴ w البقرہ، آیت: ۲۲۸ e الطّلاق، آیت: ۴

r الکواکب المشرقہ: ص ۳۷، فتاوی عالمگیری: ۱۳۵/۲

t الفتاوی الھندیہ: ۱۳۴/۲

y الفتاوی الھندیہ: ۱۳۷/۲، الباب الرابع عشر

کے تین ذرائع ہیں، 1 زراعت 2 تجارت 3 اور صنعت، ان میں سے کونسا ذریعہ معاش زیادہ بہتر ہے، علماء نے اپنے خیال کے مطابق اس کو بھی متعین کرنے کی سعی کی ہے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا خیال ہے کہ تجارت سب سے افضل ہے۔ خود ماوردی کی رائے ہے کہ زراعت کی فضیلت زیادہ ہے۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی جگہ ایسی حدیثیں جمع کر دی ہیں جو تجارت و زراعت اور صنعت کی اسلام میں اہمیت اور پیغمبر اسلام کی نگاہ میں شرف و فضیلت بتاتی ہیں۔[2]

خیال ہوتا ہے کہ فقہاء نے مختلف ذرائع معاش کے افضل اور بہتر طریقہ کی تعیین کے لئے ناحق مشقت اٹھائی ہے، اصل میں شریعت کی نگاہ میں اہمیت ذریعہ معاش کے انتخاب کی نہیں بلکہ طلب معاش میں حلال و حرام کے حدوں پر قائم رہنے کی ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "قد یختلف باختلاف الاحوال والاشخاص" یعنی حالات اور اشخاص کے فرق کے ساتھ احکام میں بھی فرق ہوسکتا ہے۔[3]

تجارت کی اہمیت

دوسرے ذرائع معاش کی طرح تجارت کو بھی اسلام میں بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، گزر چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت دار تاجر کو انبیاء، شہداء اور صدیقین کا ہم درجہ قرار دیا، تجارت کی فضیلت کے لئے یہی کافی ہے کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت فرمائی ہے، اکثر اکابر صحابہ کا ذریعہ معاش بھی تجارت تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب تک خلیفہ نہیں ہوئے، تجارت ہی کو اپنا

---

q الفتاوی الھندیہ: ۱۳۸،۱۳۷/۲ الباب الرابع عشر w خلاصۃ الفتاوی: ۱۱۷/۲

q قدوری: ص۸۸ کتاب العدۃ w البقرہ، آیت: ۲۳۴

e المیزان الکبری: ۱۵۳/۲ r الفتاوی الھندیہ: ۱۳۸/۲ t الفتاوی الھندیہ:

ذریعۂ معاش رکھا[1] سورۂ جمعہ کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت اور اس میں ملک و بیرون ملک کاروبار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عام معمول تھا، ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بہتر ذریعۂ معاش کیا ہے؟ ارشاد ہوا صحیح طریقہ پر تجارت اور اپنے ہاتھ کی محنت "عمل الرجل بیدہ وکل بیع مبرور[2]" ـــــ اسلام سے پہلے تو لوگ تاجر کو "سماز" یعنی دلال کہا کرتے تھے جو ایک قبیح تخاطب تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بجائے "تجار" کے لئے بہتر نام "تاجر" کا عطا فرمایا[3]

جہاں ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی اس درجہ فضیلت بیان فرمائی اور تاجروں کی حوصلہ افزائی کی وہیں دوسری طرف چوں کہ اس پیشہ میں جھوٹ دھوکہ دہی وغیرہ کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں اس لئے تنبیہ بھی فرمائی اور فرمایا کہ جو تجار بے خوف جھوٹے اور بد معاملہ ہوں وہ قیامت میں فاجروں کی صورت میں اٹھائے جائیں گے[4]

سامان فروخت کی خامیاں چھپائی نہ جائیں

ہر چند کہ شریعت اسلامی میں تجارت اور خرید و فروخت کے احکام بڑی تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں اور ان کی تفصیلات پر اصول و کلیات سے لے کر عام اور چھوٹی چھوٹی جزئیات تک سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن کچھ ہدایات ایسی ہیں جو بنیادی اور اساسی حیثیت کی حامل ہیں، پہلے ان کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

اس میں پہلی قابل ذکر چیز یہ ہے کہ شریعت میں سامان کے عیوب اور خامیوں کو چھپانا بہت ہی ناپسندیدہ بات ہے۔ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دانے کے ایک

۱۳۸/۲

q ھدایہ: ۳۱۲/۲، "طلاق" کے احکام راقم الحروف کی کتاب "طلاق و تفریق" کے ایک حصہ کی تلخیص ہے۔

ڈھیر پر گزر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر ہاتھ ڈالا، اس میں تراوٹ محسوس کی، فرمایا: یہ کیا ہے؟ تاجر نے عرض کیا کہ بارش میں بھیگ گیا ہے، ارشاد ہوا کہ پھر اس بھیگے ہوئے دانے کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ سکیں، پھر فرمایا: جو دھوکا دے، ہم میں سے نہیں۔" من غش فلیس منا"[1] حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مسلمان ہوئے اور جانے لگے تو کپڑا پکڑ کر کھینچا اور فرمایا کہ ہر مسلمان کے لئے بھلا سوچنا!" النصح لکل مسلمٍ"

چنانچہ حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی سامان فروخت کرتے تو عیب زدہ حصہ سامنے رکھ دیتے اور اختیار دیتے کہ چاہے تو لے اور چاہے تو چھوڑ دے۔ حضرت واثلہ بن اسقع کے متعلق مروی ہے کہ ایک شخص نے تین سو دینار میں اونٹنی فروخت کی پھر ابھی وہ شخص نکلا ہی تھا کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چیخ کر آواز دی اور دریافت فرمایا کہ اونٹنی کس چیز کے لئے لئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ سواری کے لئے، حضرت واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس کے کھر میں سوراخ ہے اور وہ تیز نہیں چل سکتی، اس شخص نے اونٹنی واپس کر دی اور بیچنے والے نے سو درہم کمی کر دی، تاجر واثلہ سے کہنے لگا کہ آپ نے میرے معاملہ کو خراب کر دیا۔ حضرت واثلہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی سامان کو بیچنا جائز نہیں جب تک کہ اس کی خامی کا اظہار نہ کر دیا جائے اور جو کوئی اس خامی سے واقف ہو اس پر بھی اس خامی کا اظہار واجب ہے۔[2] یہاں تک کہ اگر کوئی شخص عیب چھپا لے اور خریدار کو اندھیرے میں رکھے، بعد کو چل کر خریدار اس سے واقف ہو تو خریدار کو اس معاملہ کے

---

q نباء، آیت: ۱۱ w اعراف، آیت: ۱۰ e بقرہ، آیت: ۱۹۸

r مزمل، آیت: ۲۰ t جمعہ، آیت: ۱۰

y ترمذی عن ابی سعید الخدری، کتاب البیوع، باب ماجاء فی التجار الخ

u مجمع الزوائد: ۴/۹۸، باب اتخاذ المال

باقی رکھنے یا ختم کر دینے کا اختیار حاصل ہوتا ہے جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''خیار عیب'' کہا جاتا ہے۔

جھوٹ اور دھوکہ

اسی سے قریب تر دوسرا حکم یہ ہے کہ خرید وفروخت کے کسی معاملہ میں دھوکہ دہی سے کام نہ لیا جائے اور اپنا سامان فروخت کرنے کے لئے جھوٹ نہ بولے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو جھوٹ بول کر اپنا سامان فروخت کرے، اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نگاہ رحمت نہیں فرمائیں گے۔[1]

خرید وفروخت کی مختلف صورتیں ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وجہ سے منع فرمایا مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''تلقی جلب'' سے منع فرمایا۔[2] ''تلقی جلب'' یہ ہے کہ قافلۂ تجارت کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس سے سامان کم دام میں خرید کر لیا جائے اور اسے بازار کی قیمت کے بارے میں غلط باور کرایا جائے۔ظاہر ہے یہ اصحاب مال کے ساتھ دھوکہ ہے۔اسی قسم کے ایک معاملہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''نجش'' یا ''تناجش'' سے تعبیر کیا ہے۔[3] یعنی خریدنے کا ارادہ تو نہ ہو، لیکن دوسرے گاہکوں کو دھوکہ دینے کی غرض سے ایک شخص خواہ مخواہ قیمت بڑھا کر بولے کہ یہ خریداروں کے ساتھ دھوکہ دہی ہے۔[4] جانور کے دودھ نہ دوہے جائیں کہ خریدار دھوکہ کھا جائے اس کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کیوں کہ یہ بھی صریح دھوکہ دہی ہے۔[5]

دھوکہ کی وجہ سے خرید وفروخت کی ممانعت کی بہت سی صورتیں ہیں جو حدیث و فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں، اکثر اوقات اس سے شریعت نے صرف حکم اخروی یعنی

---

i مجمع الزوائد: ۶۳/۴، باب الکسب والتجارۃ
q احیاء العلوم مع الاتحاف: ۲۵۸/۶

آخرت کے ثواب و عذاب کو متعلق کیا ہے لیکن بعض اوقات اس سے احکام دنیا بھی متعلق ہیں مثلاً کسی شخص نے ایک سامان خرید کیا اور دوسرے کو یہ کہہ کر فروخت کیا کہ میں اپنی قیمت خرید ہی پر تم سے بیچ رہا ہوں لیکن قیمت خرید کے بتانے میں دروغ گوئی سے کام لیا اور زیادہ بتادی یا کہا کہ قیمت خرید پر اتنا نفع لیتا ہوں حالاں کہ اصلاً اس نے زیادہ پیسے لئے تھے تو ان دونوں صورتوں میں جن کو فقہاء کی اصطلاح میں ''تولیہ'' اور ''مرابحہ'' کہا جاتا ہے، خریدار کو اس معاملہ کے ختم کردینے یا اس سے زیادہ رقم کے واپس لینے کا حق حاصل ہوگا۔[1]

گراں فروشی

اسلام کے قانون تجارت میں اس بات کی بھی رعایت کی گئی ہے کہ ان دروازوں کو بند کیا جائے جن سے گراں فروشی پیدا ہوتی ہے اور مصنوعی مہنگائی وجود میں آتی ہے۔ ان میں بنیادی چیز ''احتکار'' کی نہایت شد و مد سے ممانعت ہے۔ ''احتکار'' سے مراد اشیاء ضروریہ کی ذخیرہ اندوزی اور بازار میں اس کی مصنوعی قلت پیدا کرنا ہے تاکہ قیمتیں بڑھیں۔[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احتکار کرنے والا خطا کار محض ہے۔[3] ایک اور روایت میں ہے کہ جس نے چالیس دنوں احتکار کیا اس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہے۔[4] ایک روایت میں آپ نے ذخیرہ اندوزوں کا مزاج یہ بتایا کہ اس کو ارزانی سے افسوس اور گرانی سے خوشی ہوتی ہے۔

بعض فقہاء کے نزدیک احتکار اور ذخیرہ اندوزی صرف غذائی اشیاء میں ممنوع ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام ہی اشیاء میں ذخیرہ اندوزی کی

w احیاء العلوم مع الاتحاف: ۲۵۹/۹
e احیاء العلوم مع الاتحاف: ۲۶۰/۹
r مشکوٰۃ شریف
t احیاء العلوم مع الاتحاف: ۲۵۸/۹

ممانعت ہے۔[1] یہی رائے مالکیہ کی بھی ہے۔[2] اور واقعہ ہے کہ یہی رائے زیادہ صحیح ہے ــــــ فقہاء نے اس بات کی بھی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص ذخیرہ اندوزی کرے اور اس سے عام لوگوں کو مشقت ہو تو حکومت جبراً ان کا مالی ذخیرہ فروخت کرا سکتی ہے۔[3]

اسی طرح حدیث میں ایک خاص صورت ''بیع حاضر للباد'' کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔[4] ''بیع حاضر للباد'' سے مراد یہ ہے کہ اہل دیہات اپنا مال لے کر شہر میں آئیں اور شہر کے تجار ان کا مال لے کر خود شہر میں بیچ دیں کہ یہ دیہاتی کم دام میں سامان فروخت کریں گے اور نتیجہ میں قیمت اتر جائے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی منع فرمایا کہ اس میں عام لوگوں کے لئے مضرت ہے۔

اسباب نزاع کا سدباب

اسی طرح خرید و فروخت یا ایسی تمام صورتیں جو مستقبل میں جھگڑے اور نزاع کا سبب بن سکتے ہوں، شریعت نے اس کو روک دیا ہے، اسی وجہ سے ایسی چیز جو آدمی کے قابو میں نہ ہو، قبضہ میں نہ ہو یا معاملہ کے وقت موجود نہ ہو، کو بیچنے سے منع فرمادیا[5] کیوں کہ یہ چیز مستقبل میں فریقین کے درمیان اختلاف اور نزاع کا باعث بن سکتی تھی، اسی طرح ضروری ہے کہ سامان اور قیمت اچھی طرح متعین ہو جائے۔[6] اگر سامان ادھار ہو تب تو ضروری ہے کہ اس سامان کی جنس اس کے اوصاف، مقام ادائیگی اور مدت وغیرہ تمام متعلقات پوری طرح متعین اور مشخص کردیئے جائیں۔[1] اسی

---

q بخاری عن ابی ھریرہ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ، باب کسب الرجل وعملہٖ بیدہ
w ترمذی، کتاب الزکوۃ، باب ماجاء فی النھی عن المسئلۃ
e ترمذی، باب مذکور
r ترمذی نے مختصراً اس روایت کو نقل کیا ہے، کتاب البیوع باب ماجاء فی بیع من یزید

طرح سامان فروخت سے غیر متعین اور مبہم استثناء کی اجازت نہیں دی گئی۔[2] اگر مختلف قسم کے سکوں کا یکساں رواج ہے تو قیمت میں سکوں کی نوعیت کا متعین کرنا ضروری سمجھا گیا۔[3] معاملہ خرید وفروخت اس وقت تک قطعی اور مکمل نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ خریدار اس کو دیکھ نہ لے، اسی کو فقہ کی اصطلاح میں ''خیار رؤیت'' کہتے ہیں۔ معاملہ کے نفع ونقصان کو اچھی طرح پرکھ لینے کے لئے تین دنوں کی خصوصی مہلت دی گئی جو فریقین میں سے ہر ایک دوسرے سے حاصل کرسکتا ہے، اس کو فقہ کی اصطلاح میں ''خیار شرط'' کہتے ہیں ـــــ یہ اور اس طرح کے بہت سے احکام ہیں جو ممکن اختلاف اور نزاع کو روکنے کے لئے پیش بندی اور ابتدائی احتیاط کا درجہ رکھتے ہیں۔

اسی طرح ایسی باتیں جو باہم منافست اور رقابت پیدا کرتی ہوں ان کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ اس سلسلہ میں حدیث میں دو باتوں کی خصوصیت کے ساتھ ممانعت آئی ہے [1] ''سوم علی سوم اخیہ''[2] ''بیع علی بیع اخیہ'' ـــــ ''سوم علی سوم اخیہ'' ہے کہ ایک شخص کسی قیمت پر خریدی کا معاملہ طے کررہا ہو کہ دوسرا شخص آپہنچے اور اس سے زیادہ قیمت خرید کی پیش کش کرے، ''بیع علی بیع اخیہ'' کہ ایک شخص کوئی چیز بیچ رہا ہو کہ دوسرا شخص اس سے کم قیمت میں وہی سامان دینے کی پیش کش کرے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں باتوں سے منع فرمایا کہ اس سے باہم منافست، جذبۂ رقابت اور تکدر پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔[1] البتہ یہ ممانعت اسی وقت ہے جب کہ سامان کے خریدنے

---

t دیکھئے ترمذی کتاب الزکوۃ، باب ماجاء فی حق السائل

q مجمع الزوائد: ۴/۱۷ باب الاکتساب فی طلب الرزق

w مجمع الزوائد: ۴/۱۷ باب الاکتساب فی طلب الرزق

e نور، آیت: ۳۷

r تخریج عراقی علی حدیث احیاء: ۸۶/۲

یا بیچنے کی طرف اس دوسرے شخص کا میلان ہو چکا ہو۔[2] نیز اس حکم میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں مساوی ہیں۔[3]

ہاں! اس سے ڈاک والی صورت مستثنیٰ ہے جس میں ایک شخص زیادہ سے زیادہ قیمت کے حصول کے لئے بولی لگاتا ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح خرید وفروخت ثابت ہے۔[4]

تجارت کے معاملہ میں بلکہ تمام ہی معاملات اور معاہدات میں شریعت کا عمومی مزاج یہ ہے کہ فریقین کی مکمل رضا مندی کے بغیر معاملہ طے نہ ہو اور اس کو ایسی آزادی حاصل ہو جو دوسروں کے لئے نقصان اور ضرر کا باعث نہ ہو، اسی لئے ایسی تمام صورتیں جس میں صاحبِ معاملہ کی رضا مندی کے بغیر کوئی معاملہ اس پر تھوپا جائے شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور ممنوع ہے۔ اسلام سے پہلے خرید وفروخت کی متعدد صورتیں رائج تھیں، جن میں مکمل رضا مندی کے بغیر آدمی پر کوئی سودا لازم ہو جاتا تھا جس کو ''ملامسہ'' اور ''منابذہ'' کہا کرتے تھے، اسلام نے ایسی تمام صورتوں کو منع کر دیا اور قیمت کے معاملہ میں بھی! اسلام کا عمومی مزاج یہی ہے کہ حکومت دخل نہیں دے اور طبعی رفتار اور افتاد کے مطابق قیمتوں میں کمی وبیشی ہو۔ ایک بار بعض لوگوں نے خصوصیت سے خواہش کی کہ قیمتیں متعین کر دی جائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور فرمایا کہ قیمتوں میں گرانی اور ارزانی کرنے والا اللہ ہے۔[5]

لیکن بعض دفعہ لوگ اخلاقی ہدایات کا اثر قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے ہیں اور ان کے لئے قانون کی تلوار استعمال کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، ایسے ہی لوگوں کی نفسیات کو

---

q عینی علی البخاری: ۱۸۶/۶
w بخاری کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ
e فتح الباری: ۴/۳۰۴

سامنے رکھ کر فقہاء نے گراں فروشی کے بہت بڑھ جانے کی صورت میں تعیین قیمت کا حکومت کو حق دیا ہے کہ حکومت اصحاب رائے کے مشورہ سے تاجروں کو متعینہ قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔[1]

غبن فاحش

گو شریعت نے نفع کے لئے کوئی خاص مقدار متعین نہیں کی ہے لیکن اتنا نفع لینا جو ''غبن فاحش'' کے درجہ میں آجائے، مکروہ ہے غبن فاحش سے مراد یہ ہے کہ مختلف واقف کار لوگ ایک سامان کی جو قیمت لگاتے ہوں، قیمت ان سب سے بڑھ جائے، اتنا کثیر نفع لینا مزاج شریعت کے خلاف ہے، شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے خوب لکھا ہے کہ تاجرانہ نفع کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ محتاج کی ضرورت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے خوب گراں بیچا جائے، دوسرے یہ کہ معمولی نفع لیا جائے اور جلد جلد اس کو استعمال میں لایا جائے، نفع کی یہ دوسری شکل تمدنی تقاضوں کے مطابق بھی ہے اور برکت کا باعث بھی۔[2]

تجارت عبادت میں خلل انداز نہ ہو

تجارت کی ان صورتوں میں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے، یہ بھی ہے کہ وہ خالص عبادت میں خلل کا باعث بنتی ہو، قرآن مجید نے جمعہ کے بارے میں خصوصیت سے تاکید کی کہ جب اذان جمعہ ہو جائے تو نماز کے لئے دوڑ پڑو ﴿ $ %

q بخاری کتاب البیوع باب کسب الرجل و عملہ بیدہ
w مجمع الزوائد عن رافع بن خدیج: ۴/۹۰
e نسائی کتاب الایمان باب فی الحلف والکذب الخ
r ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی التجار الخ
q ترمذی کتاب البیوع باب فی کراھیۃ الغش فی البیوع

& ') ( ) * + , - . / 0﴾[3] جمعہ کے لئے چوں کہ زیادہ وقت مطلوب ہوتا ہے اور نماز کے علاوہ خطبہ بھی ہوتا ہے اس لئے خاص اہتمام سے توجہ دلائی گئی، ورنہ ہر نماز اور عبادت کے لیے یہی حکم ہے۔

اسی طرح مساجد خالصۃً اللہ کے ذکر، دین کی دعوت وتذکیر اور عبادت کی جگہ ہے، یہاں خرید وفروخت میں اندیشہ ہے کہ دوسروں کی نماز اور عبادت میں خلل نہ پیدا ہو جائے اس لئے مسجدوں میں خرید وفروخت کو روکا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی کو مسجد میں فروخت کرتے یا خرید کرتے ہوئے دیکھو تو کہہ دو کہ خدا تمہاری تجارت کو نفع سے محروم کردے۔"لا اربح اللّٰہ تجارتک"[1]

ایفاءعہد اور دوسرے فریق کی رعایت

تمام معاملات کی طرح اسلام کا تصور یہ ہے کہ خرید وفروخت اور تجارت کے معاملہ میں بھی ایثار، نرمی، دوسروں کو ترجیح، دیانت وایمانداری، صدق وراستی، وعدہ کی پابندی اور ایفاءعہد کی ڈگر پر انسان قائم رہے۔

سوید بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں اور ایک صاحب کپڑا فروخت کررہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، پاجامہ خرید کیا، میرے پاس ایک شخص تھا جو قیمت تولنے اور وزن کرنے پر مامور تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمت ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ جھکا کر تولو،"زن وارجح"[2] یعنی وزن میں کچھ زیادہ تو ہو کمی نہ ہو۔ ناپ تول کے پیمانے والوں سے فرمایا کہ تم لوگ دو ایسی چیز کے ذمہ دار بنائے گئے ہو جس میں اس سے پہلے کی امتیں ہلاک ہوچکی ہیں۔[3] کسی کے یہاں قیمت باقی ہو اور اسے مہلت دی جائے یا معاف کردیا جائے تو ارشاد خداوندی ہے کہ

w احیاء العلوم: ۷۹/۲، وقال العراقی اخرجہ الحاکم وقال صحیح الاسناد

q ترمذی عن ابی ذر، کتاب البیوع باب ماجاء فی من حلف علی سلعۃ

قیامت کے دن اسے عرش باری کا سایہ حاصل ہوگا۔[1] ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص کے پاس کوئی نیکی نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ دولت مند تھا اور اپنے غلاموں کو حکم دیا کرتا تھا کہ تنگدست لوگوں سے درگزر کا معاملہ کرو، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ کہہ کر معاف کردیا کہ ہم معاف کرنے کے زیادہ لائق ہیں اس لئے اسے معاف کردو۔[2]

وفاء عہد کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا تین دنوں تک انتظار فرمایا ہے۔[3] ایسا شخص جو قیمت ادا کرنے پر قادر ہو لیکن ٹال مٹول اور وعدہ خلافی کرتا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مذمت فرمائی ہے اور اس کے عمل کو ظلم قرار دیا ہے۔[4]

ایسی تجارت جو معصیت میں معاون ہو؟

اسی طرح جو خرید وفروخت معصیت میں تعاون کا ذریعہ ہو، ان کے ذریعہ گناہ کے کاموں کو فروغ ہوتا ہو، یا شریعت جن چیزوں کو حرام وممنوع اور ناقابل استعمال قرار دے کر ناقابل احترام ٹھہراتی ہو، ان کے ذریعہ ان کی تعظیم وتوقیر ہوتی ہو، ایسی تمام صورتوں کو بھی شریعت نے منع کیا ہے کہ اسلام سے وفاداری اور ایمان پر استواری کا یہی تقاضا ہے۔

چنانچہ سور کی خرید وفروخت کو منع کیا گیا ہے، خون اور مردار کی بیع کو نادرست قرار دیا گیا ہے، شراب نوشی کی اجازت نہیں دی گئی، تصاویر اور ذی روح کے مجسمے جو ہر زمانہ میں شرک کا اولین سبب بنا کئے ہیں، کی خرید وفروخت کو جائز نہیں رکھا گیا، اس لئے کہ مجسموں کی خرید وفروخت شرک میں اعانت ہے، شراب فروشی سے شراب نوشی کو

کاذباً

w مسلم، عن ابی ھریرہ، کتاب البیوع، باب تحریم تلقی الجلب

e مسلم، باب تحریم النجش r ھدایہ: ج۳، کتاب البیوع، فصل فیما

تقویت حاصل ہوگی، سور، خون اور مردار کی خرید وفروخت اس کی عظمت وحرمت کا اعتراف ہے جو دین وشریعت کے خلاف ہے، فتنہ کے زمانہ میں اہل فتنہ سے اسلحہ کی فروخت اوراغلام بازی کے عادی شخص سے غلام کی خرید وفروخت کو بھی اس قاعدہ کے تحت فقہاء نے منع کیا ہے، غور کیا جائے تو وہ معاملات جن کو فقہاء نے ''بیع باطل'' کے زمرہ میں رکھا ہے وہ اکثر اسی اصول کی بنا پر ممنوع قرار دیئے گئے ہیں۔

بعض بنیادی اصول

تجارت کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ جس چیز کو فروخت کیا جارہا ہو وہ موجود ہو، معدوم شئی بیچنا درست نہیں، مثلاً کوئی شخص یوں کہے: میری گائے کا جو بچہ ہوگا اسے میں نے فروخت کیا تو یہ درست نہیں ہوگا، نیز وہ شئی بیچنے والے کی ملکیت میں بھی ہو، بیچتے وقت جو چیز اس کی ملکیت اور قبضہ میں نہ ہواس کو بیچنا درست نہیں۔ اس سے صرف دوصورتیں مستثنیٰ ہیں، سلم اوراستصناع، سلم یہ ہے کہ قیمت نقدادا کردی جائے اور سامان جوابھی بیچنے والے کے پاس موجود نہ ہولیکن بازار میں دستیاب ہو، ایک مدت کے بعد حاصل کیا جائے، ''استصناع'' یہ ہے کہ کاریگر کو پیشگی قیمت ادا کر کے مصنوعات کا آرڈر دیا جائے، حالاں کہ مصنوعات پہلے سے موجود نہ ہوں[1]۔

خرید وفروخت کے صحیح ہونے کے لئے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ جو چیز بیچی جارہی ہے وہ مال متقوم ہو یعنی مال بھی ہواور شریعت اس کو قابل قیمت بھی قرار دیتی ہو[2]۔ متقوم اور قابل قیمت ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ شرعاً اس سے فائدہ اٹھانا مباح ہو ''المال المباح الانتفاع به شرعا''[3] پر ایسی چیزیں جو حرام ہوں اور

یکره

t مسلم عن ابی هریره، کتاب البیوع باب تحریم التصرية

q هدایه: ۳/۵۵

w ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی الاحتکار

شرعاً ان سے فائدہ اٹھانا مباح نہ ہوان کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی ، حدیث میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لئے شراب کی خرید وفروخت کو منع فرمایا۔[1] اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شکاری کتے کے علاوہ دوسرے کتوں کی قیمت کو منع فرمایا...... مردار کے چمڑوں اور بتوں کے فروخت کرنے کو منع فرمایا، فتح مکہ کے موقع پر ارشاد ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب، مردار، سور اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا ہے۔[2]

انہی روایات سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جن اشیاء کو شریعت ناپاک اور نجس قرار دیتی ہے ان کی خرید وفروخت جائز نہ ہوگی ۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نر جانور کے مادہ کے ساتھ جفتی کی اجرت لینے کو ناجائز قرار دیا[3] اسی لئے فقہاء انسانی فضلہ کی خرید وفروخت کو ناجائز قرار دیتے ہیں ، ہاں اگر اس کے ساتھ مٹی مل گئی اور فضلہ مغلوب ہوگیا تو اب اس کی خرید وفروخت جائز ہوگی ۔[4]

فروختنی سامان قابل انتفاع ہو

خرید وفروخت کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا خاص تعلق کسی چیز کے قابل انتفاع ہونے اور نہ ہونے سے بھی ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن چیزوں کی خرید و فروخت کی ممانعت کتاب وسنت سے صراحتاً نہ ثابت ہو اور وہ کسی دور میں اس لائق ہو جائے کہ اس سے نفع اٹھایا جا سکے تو فقہاء اس کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیتے ہیں مثلاً عام اصول یہی ہے کہ کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض سانپ وغیرہ کی خرید و فروخت کو جائز نہیں ، لیکن ریشم کے کیڑے اور اس کے انڈے اور شہد مکھی کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیا گیا ہے ۔ فقیہ ابواللیث نے جونک کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے ، اس لئے کہ اس سے علاج میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے ۔ اور علامہ حصکفی نے نقل

e ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی الاحتکار

r مجمع الزوائد: ۴/۱۰۰، باب الاحتکار

کیا ہے کہ اسی پر فتویٰ بھی ہے۔[1] اسی طرح علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ دوا میں سانپ کا استعمال کیا جا سکتا ہو تو اس کی خرید وفروخت بھی جائز ہوگی۔[2] بلکہ حصکفی نے ایک اچھا قاعدہ نقل کیا ہے کہ: "ان جواز البيع يدور مع حل الانتفاع[3]" خنزیر کے بال کی خرید وفروخت بھی اسی بنیاد پر فقہاء کے یہاں جائز قرار پائی ہے، پس حاصل یہ ہے کہ جن اشیاء کی خرید وفروخت کی ممانعت قرآن وحدیث میں صراحۃً مذکور نہیں اور وہ کسی زمانہ میں قابل انتفاع ہو جائیں تو فقہاء اس کے بارے میں نرم گوشہ اختیار کرتے ہیں اور اس کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیتے ہیں۔

خرید وفروخت میں شرطیں؟

شریعت یہ بھی چاہتی ہے کہ خرید وفروخت کے معاملہ میں ایسی کوئی شرط نہ لگائی جائے جو معاملہ بیع کے اصل تقاضوں کے خلاف ہو مثلاً بیع کے ذریعہ خریدار سودے کا مکمل مالک ہو جاتا ہے اور وہ اس میں ہر طرح کے تصرف کا مجاز ہے، اب اگر بیچنے والا ایسی کوئی شرط لگا دے جس سے خریدار کے حق تصرف پر تحدید عائد ہوتی ہے تو یہ نامناسب شرط سمجھی جاتی ہے اور معاملہ فاسد ہو جاتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید وفروخت کے ساتھ شرط لگانے سے منع فرمایا ہے "نهى النبي عليه السلام عن بيع وشرط۔"[4]

لیکن اگر کوئی شرط عرف ورواج کا درجہ حاصل کر لے تو پھر معاملہ کے ساتھ ایسی شرط عائد کرنے میں کوئی قباحت نہیں، عالمگیری میں ہے:

---

q در المختار كتاب الحظر والاباحة: ۲۵۲/۵

w كتاب الافصاح: ۳۶۶/۱   e هندية: ۲۱۴/۲

r ترمذي كتاب البيوع باب ماجاء لا يبيع حاضر لباد

t ترمذي كتاب البيوع، باب ماجاء في كراهية بيع ماليس عنده

y مسلم: ج۲، كتاب البيوع، باب تحريم بيع صبرة التمر المجهولة القدر بتمر

”...... اولم یرد الشرع بجوازه ولکنه متعارف کما اذا اشتری نعلا وشراکا علی ان یحذوه البائع جاز البیع استحساناً وان اشتری صرماً علی ان یخرز البائع له خفا او قلنسوة بشرط ان یبطن له البائع من عنده فالبیع بهذا الشرط جائز للتعامل۔“[1]

D: ”ایسی شرط کہ شریعت اس کے جواز کے بارے میں وارد نہ ہو لیکن وہ مروج ہو، مثلاً چمڑا یا تسمہ اس شرط پر خرید کرے کہ بیچنے والا اس کا جوتا بنا دے تو استحساناً یہ جائز ہوگا اور اگر بایں شرط کہ فروخت کنندہ اس کے لئے اپنے پاس سے استر بنائے تو اس شرط کے ساتھ رواج وتعامل کی وجہ سے خرید وفروخت جائز ہوگی۔“

فی زمانہ بہت سی چیزیں ہیں کہ ان کی خرید وفروخت کے ساتھ کمپنیاں ایک مخصوص مدت کے لئے گارنٹی قبول کرتی ہیں اور اس مدت میں اگر کوئی خرابی پیدا ہوجائے تو درستگی کی ضامن ہوجاتی ہیں یا کسی شی کی خریداری پر مزید کوئی اور شئے تجار دیا کرتے ہیں ـــــ یہ صورتیں جائز ہوں گی کیونکہ ان کا شمار اب معروف اور مروج شرائط میں ہے۔

قبضہ کے بعد فروخت

خرید وفروخت اور تجارت کے سلسلہ میں اسلام نے جو احکام دیئے ہیں ان میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ کسی چیز پر قبضہ کے بعد ہی اس کو فروخت کیا جائے بعض روایات میں مطلقاً قبضہ سے پہلے فروخت کو روکا گیا ہے[2] بعض میں یہ ممانعت خاص

---

q مسلم: ۱۳۱/۲، باب السلم، ھدایہ: ج۲ کتاب البیوع، باب السلم
w البحر، کتاب البیوع، ھدایہ: ۱۱/۳
e الھندیہ: ۱۲۲/۳

کھانے پینے کی اشیاء کی بابت منقول ہے، "من ابتاع طعاماً فلا یبیعہ حتی یستوفیہ"[1] اسی طرح کی متعدد روایات منقول ہیں اسی بنا پر امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو کسی بھی شئ پر قبضہ حاصل کرنے سے پہلے اس کو فروخت کرنا جائز نہیں۔[2] امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ حکم صرف غذائی اشیاء کے لئے ہے دوسری اشیاء اس حکم میں داخل نہیں ہیں۔[3] اور احناف کے نزدیک منقولہ اشیاء جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جاسکتی ہوں) میں قبضہ ضروری ہے، غیر منقولہ اشیاء کی فروخت قبضہ سے پہلے بھی جائز ہے۔[4] —— جہاں شوافع نے حدیث کے عموم پر عمل کیا ہے مالکیہ نے ان حدیثوں کو اصل قرار دیا ہے جن میں صرف غذائی اشیاء پر قبضہ کا ذکر ہے، وہیں حنفیہ نے مسئلہ کی اصل روح اور شریعت کے منشاء و مقصود پر نظر رکھی ہے۔

احناف کے پیش نظر یہ ہے کہ مقصود "غرر" یعنی امکانی دھوکہ کا سد باب ہے جب تک کہ کوئی چیز قبضہ میں نہ آجائے احتمال موجود ہے کہ شاید قبضہ ہی میں نہ آپائے، ایسی شکل میں وہ اپنے عہد کو پورا نہیں کر پائے گا، منقول اشیاء میں تو اس طرح کا احتمال موجود ہے لیکن غیر منقولہ اشیاء میں اس کا کوئی احتمال نہیں کہ وہ چیز ضائع ہوجائے یا گم ہوجائے یا چرالی جائے اس لئے صرف منقولہ اشیاء ہی میں فروخت کرنے کے لئے اولاً قبضہ ضروری ہوگا۔[5]

کمیشن ایجنٹ

ہمارے زمانہ میں خرید و فروخت کی بہت سی ایسی صورتیں مروج ہیں جو ایجنٹ کے ذریعہ ہوتی ہے، کمپنی اور کارخانہ کا ایجنٹ معاملہ طے کرتا ہے اور خود اس پر کمیشن وصول کرتا ہے —— سوال یہ ہے کہ ایجنٹ کا اس طرح کمیشن لینا درست ہوگا؟ اور شرعاً یہ اجرت جائز ہوگی یا نہیں؟

---

q بخاری کتاب البیوع، باب لا یبیع علی بیع اخیہ الخ

امام بخاری نے اس سلسلہ میں ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے اور نقل کیا ہے کہ ابن سیرین، عطاء، ابراہیم نخعی اور حسن بصری جیسے بلند پایہ علماء ایجنٹ کے کمیشن کو جائز قرار دیتے تھے۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ کوئی شخص کسی کو کپڑا دے اور کہے کہ اس کپڑے کو فروخت کر لو، اتنے روپئے سے زیادہ جو قیمت حاصل کرو گے وہ تمہاری ہوگی تو اس میں مضائقہ نہیں۔ غالباً خود امام بخاری کا رجحان اس کے جائز ہونے کی طرف ہے، اس لئے کہ آگے خود انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ "المؤمنون عند شروطهم" مسلمانوں کو اپنی شرطوں اور معاہدات پر قائم رہنا چاہئے۔ یعنی ایجنٹ اور مالک کے درمیان جو باتیں ہوئی ہوں فریقین کو ان[1] پر قائم رہنا چاہئے۔

ائمہ اربعہ کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف ہے، امام مالک کے نزدیک سامان فروخت کرنے پر اجرت متعین کرنا جائز ہے بشرطیکہ فروخت کی کوئی مدت بھی متعین کر دی ہو، اگر مالک سامان کہے کہ تم یہ سامان فروخت کرو اور اس کے بدلے تم کو ایک درہم دیا جائے گا یا ہر سو دینار پر کچھ متعین کر دے تو یہ جائز ہے، یہی رائے امام احمد کی بھی ہے، ابن تین نے لکھا ہے کہ اگر مدت متعین کر دی جائے کہ اتنی مدت پر تمہیں فروخت کرنا ہے تو ایجنٹ کو دیا جانے والا نفع ''اجارہ'' ہے۔ اور کوئی مدت متعین نہیں کی تو فقہ کے اصطلاح کے مطابق ''جعل'' ہے۔[2]

اور ابو عبدالملک نے لکھا ہے کہ اس کی بنیاد عرف پر ہے گو اس طرح اجرت متعین کرنے میں ایک درجہ کا ابہام پایا جاتا ہے لیکن لوگوں کے تعامل کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا گیا ہے "لكن جوزت لما مضى من عمل الناس عليه"[1]

---

w عمدة القاري: ١٠/٣٦٠ e عمدة القاري: ص ٢٥٨

r دیکھئے ترمذی كتاب البيوع، باب ماجاء في من يزيد

t ترمذی عن انس رضی اللّٰه تعالیٰ عنه، باب ماجاء في التعيين، ابن ماجه

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ گو امام ابوحنیفہ کے مسلک پر کمیشن ایجنٹ کے کاروبار کی بعض صورتیں ایسی ہیں جو جواز کے دائرہ سے باہر ہیں لیکن فی زمانہ اس کی کثرت اور ایک حد تک کاروباری دنیا میں اس کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقہاء مالکیہ کی رائے کو قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

تالاب میں مچھلیوں کی خرید وفروخت[2]

ہمارے زمانے میں تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت کا معاملہ کثرت سے رائج ہے اور بسا اوقات بعض معاملات اس میں غیر شرعی بھی ہوتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اس کے احکام اچھی طرح سمجھ لئے جائیں، کسی چیز کو فروخت کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، اول یہ کہ جو چیز بیچی جا رہی ہے وہ بیچنے والے کی ملکیت ہو، یہ تو ظاہر ہی ہے، دوسرے یہ کہ اس کی حوالگی اور سپردگی ممکن ہو۔ اگر وہ فی الحال اس کے حوالہ کرنے پر قادر نہ ہو تو بیع درست نہ ہوگی مثلاً بھاگے ہوئے جانور یا کسی گم شدہ سامان کو فروخت کیا جائے کہ گو وہ اپنے اصل مالک ہی کی ملکیت ہے لیکن بروقت اس کے حوالہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔

مچھلی کے سلسلہ میں بھی یہی تفصیل ہے، اگر مچھلی اس شخص کی ملک میں داخل ہے اور وہ بآسانی اس کے حوالہ کرنے پر قادر بھی ہے تو اب اس کی خرید وفروخت درست ہوگی۔ اگر وہ اس کی سپردگی پر قادر نہ ہو یا ابھی اس کا مالک ہی نہ ہوا ہو تو خرید وفروخت کا معاملہ جائز نہ ہوگا۔

مچھلی کا مالک بننے کی تین صورتیں ہیں، اول یہ کہ مچھلیوں کی نشو ونما کے لئے اس کو بطور خاص کسی نے تالاب میں رکھا ہو، تو اب اس مچھلی اور اس کی نسل کا وہی مالک

کتاب التجارات باب من کرہ ان یتعین

q الاشباہ والنظائر للسیوطی: ص ۱۸۷

قرار پائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مچھلی تو اس نے نہ ڈالی ہو لیکن مچھلیوں کے تالاب میں لانے یا آنے والی مچھلیوں کے واپس نہ جانے کے لئے اس نے کوئی تدبیر کی ہو اب اس تالاب یا حوض میں آنے والی مچھلیوں کا مالک وہی ہوگا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص مچھلی کا شکار کر کے اپنے برتن میں محفوظ کر لے۔ چوتھی صورت جس میں آدمی مچھلی کا مالک نہیں ہو پاتا ہے یہ ہے کہ کسی کا تالاب ہو، اس میں از خود مچھلیاں آجائیں اس کی سعی و کوشش کو اس میں کوئی دخل نہ ہو، یہاں محض یہ بات کہ تالاب اس کی زمین میں واقع ہے کو اس بات کے لئے کافی نہیں سمجھا جائے گا کہ اس زمین کا مالک ان بچوں اور انڈوں کا بھی مالک ہو بلکہ جو بھی اس بچہ یا انڈا کو اٹھا لے وہی اس کا مالک ہے۔" اذا افرخ طیر فی ارض رجل فھو لمن اخذہ وکذا اذا باض فیھا۔"

مچھلی کے بآسانی مقدور التسلیم یعنی حوالگی پر قادر ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ شکار کے بعد وہ کسی برتن میں محفوظ کر لے جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے یا مچھلی کو کسی ایسے چھوٹے گڑھے میں رکھے جس سے نکالنا آسان اور سہل ہو۔

اب ظاہر ہے کہ جن صورتوں میں آدمی مچھلی کا مالک ہی نہ ہو اس میں تو خرید و فروخت درست ہی نہیں ہے اور جب مچھلی کا مالک ہو جائے تب بھی اسی وقت درست ہوگی جب اوپر ذکر کی گئی دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت پائی جائے۔[2]

باغات اور پھلوں کی خرید و فروخت

خرید و فروخت کی بعض صورتیں جو مروج ہیں اور ایسی ہیں کہ شرعی اور فقہی اعتبار سے ان کا جواز مشکوک ہے، یا ان کی بعض صورتیں ناجائز ہیں ایسے مسائل میں ایک باغات اور پھلوں کی خرید و فروخت بھی ہے۔

w حجۃ اللّٰہ البالغہ: ۲/۱۷۲ البیوع المنھی عنھا
e جمعہ، آیت: ۸

باغات کی خرید وفروخت کی ممکنہ اور مروجہ صورتیں یہ ہیں:

1 پھل ابھی آئے بھی نہ ہوں اور باغ فروخت کر دیا جائے جیسا کہ بعض اوقات ایک یا کئی کئی سال کے لئے باغات فروخت کر دیئے جاتے ہیں۔

2 پھل نکل آئے لیکن ابھی ابتدائی حالت میں ہوں، انسانی استعمال کے لائق نہ ہوئے ہوں اور ان کو بیچ دیا جائے۔

3 کچھ پھل نکل آئے، کچھ ابھی نہیں نکلے بلکہ مستقبل میں ان کا نکلنا متوقع ہو اور موجودہ اور آئندہ نکلنے والے دونوں طرح کے پھل فروخت کر دیئے جائیں۔

4 پھل نکل آئے اور انسانی استعمال کے لائق بھی ہو گئے جس کو فقہ وحدیث میں ''بدوصلاح'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پھر آخر الذکر تینوں صورتوں (۲،۳و۴) میں تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

(الف) خریدار سے طے پایا گیا کہ وہ پھل فوراً توڑ لے گا۔

(ب) طے ہوا کہ پھل پکنے تک درخت پر باقی رہے گا۔

(ج) نہ فوراً توڑنا طے پایا، نہ پھل پکنے تک درخت پر اس کا باقی رکھنا، بلکہ اس سے خاموشی اختیار کی گئی۔

اس طرح یہ چار صورتیں دراصل دس صورتوں پر مشتمل ہیں:

1 پہلی صورت کہ پھلوں کے نکلنے سے قبل ہی اس کو بیچ دیا جائے، یہ جائز نہیں، اس سے متعلق صریح وصحیح روایات موجود ہیں، حدیث میں اسی کو ''بیع معادمہ'' یا ''بیع سنین'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔[1]

2 پھل نکل آیا لیکن قابل استعمال نہ ہو، ایسا پھل اگر اس شرط پر خرید کیا جائے کہ

---

q ترمذی، کتاب البیوع، باب النهی عن البیع فی المساجد

w ابوداؤد، کتاب البیوع، باب الرجحان فی الوزن

e ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی المکیال والمیزان

خریدار اسے فوراً توڑ لے گا تو یہ صورت بالاتفاق درست ہے، ابن قدامہ کہتے ہیں:

"القسم الثانی: ان یبیعھا بشرط القطع فی الحال فیصح بالاجماع لان المنع انما کان خوفا من تلف الثمرة وحدوث العاھة علیھا قبل اخذھا۔"

تاہم اگر خرید وفروخت کا معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار نے خواہش کی کہ ابھی تیار ہونے تک اس کو درخت پر رہنے دیا جائے اور درخت بیچنے والے نے اس کو قبول کرلیا تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، علاءالدین سمرقندی کا بیان ہے:"فان کان ذلک باذن البائع جاز وطاب له الفضل۔"

اسی طرح پھل تیار ہونے سے پہلے ہی خرید کرلیا اور خرید وفروخت کے معاملہ کے وقت یہ طے نہ پایا کہ پھل ابھی توڑے گا یا اسے تیار ہونے تک باقی رکھے گا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس صورت میں بھی معاملہ درست ہو جائے گا، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک درست نہیں ہوگا۔

"القسم الثالث: ان یبیعھا مطلقاً ولم یشترط قطعاً ولا تبقیه فالبیع باطل وبه قال مالک والشافعی واجازه ابوحنیفه رحمه اللّٰہ تعالیٰ۔" 3

احناف نے گو اس کو جائز رکھا ہے لیکن ان کے یہاں بھی واجب ہے کہ اس طرح معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار پھل توڑ لے، اس کو حق نہیں ہے کہ درخت پر پھل باقی رکھے۔"وعلی المشتری قطعھا فی الحال اذا باع مطلقًا او بشرط القطع"[4]

اور اگر معاملہ اس شرط کے ساتھ طے پا جائے کہ مالک پھل درخت پر رہنے دے گا تا آنکہ پھل پک نہ جائے تو ائمہ ثلاثہ کے ہاں تو بیع فاسد ہوگی ہی، امام ابوحنیفہ

٩ ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی انظار المعسر والرفق به

رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی درست نہ ہوگی۔"اما اذا باع بشرط الترک فهو فاسد" کیونکہ خرید وفروخت کے معاملہ میں خریدار نے ایک ایسی شرط لگادی ہے جس میں اس کے لئے منفعت ہے اور ایسی شرط سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

3 کچھ پھل نکل آئے اور کچھ نہیں نکلے بلکہ مستقبل میں ان کا نکلنا متوقع ہو، اب مالک باغ تمام پھلوں کو فروخت کرتا ہے، ان کو بھی جو نکل آئے اور ان کو بھی جو نہیں نکلے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز نہیں۔"واذا باع الثمرة الظاهرة وما يظهر بعد ذلك لم يصح البيع عند ابى حنيفة والشافعي واحمد وقال مالك يجوز۔"[2]

اسی طرح اگر پھل قابل استعمال ہوگئے اور باغ کے باقی پھل ابھی قابل استعمال نہیں ہوں تو بھی امام شافعی واحمد کے برخلاف امام مالک نے اس کی اجازت دی ہے بشرطیکہ باغ کے تمام درخت ایک ہی پھل کے ہوں، احناف کے ہاں عام اصول کے مطابق نکلے ہوئے پھلوں کے ساتھ ان پھلوں کی فروخت درست نہ ہوگی جو ابھی نکلے ہی نہ ہوں، یہی فقہاء احناف کے یہاں ظاہر روایت ہے۔

دوسری طرف عوام میں بڑھتا ہوا تعامل، کہ کچھ پھل آتے ہی باغ فروخت کردیا جاتا ہے اسی کو سامنے رکھتے ہوئے بعض فقہاء نے اس میں نرم روی اختیار کی ہے۔ چنانچہ ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ امام فضلی کہتے ہیں کہ لوگوں کا انگور کی خرید وفروخت میں اسی نوعیت کا تعامل ہوگیا ہے اور اب ان کو اس سے روکنے میں حرج ہے، اس لئے استحساناً میں اس کو جائز قرار دیتا ہوں، نیز امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے درخت پر

---

w مسلم، کتاب المساقات

e ابوداؤد: ۶۸۲/۲، کتاب الادب، باب في العدة

لگے ہوئے گلاب کی خرید وفروخت کی اجازت دی ہے حالانکہ گلاب کے پھول یکبارگی نہیں نکلتے اور کھلتے ہیں، بلکہ یکے بعد دیگرے نکلتے ہیں۔ بعد کے فقہاء نے عام تعامل کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں امام فضلی ہی کی رائے پر عمل کیا ہے پھر چوں کہ مارکٹ میں جو کچھ پھل آتا ہے وہ اسی طریق پر، اس لئے پھل کا کھانا ہی حرام ہو جائے گا پس اب اس طرح کی خرید وفروخت نے ضرورت کا درجہ اختیار کرلیا ہے لہٰذا جس طرح انسانی ضرورت کی رعایت کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''سلم'' کی اجازت دے دی حالاں کہ وہ ایک شئے معدوم کو فروخت کرنا ہے اسی طرح پھلوں کی خرید وفروخت کی اس نوعیت کے معاملات کو بھی درست کہنا چاہئے۔

4 پھل نکل آئے اور انسانی استعمال کے قابل بھی ہوگئے جس کو حدیث میں ''بدو صلاح'' سے تعبیر کیا گیا ہے، ائمہ ثلاثہ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس صورت میں بہر حال خرید وفروخت درست ہے، چاہے غیر مشروط خرید وفروخت ہو یا فوراً توڑنے کی شرط ہو یا پھل کی تیاری تک درخت پر رکھنے کی، نیز خریدار کو غیر مشروط معاملہ یا پھل کی تیاری تک درخت پر رکھنے کی شرط کی صورت میں حق حاصل ہوگا کہ پھل کی تیاری تک پھل درخت پر رہنے دیا جائے۔

"وجملة ذلك انه اذا بدا الصلاح في الثمرة جاز بيعها مطلقًا وبشرط القطع وبذلك قال مالك والشافعي وقال ابوحنيفة واصحابه لا يجوز بشرط التبقية۔"[1]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ وابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پھل کے درخت پر ایک عرصہ لگے رہنے کی شرط لگادی جائے تو بیع درست نہ ہوگی، امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل کی ہے کہ اگر پھل تیار ہو چکے ہوں تو ایسی شرط لگانے میں مضائقہ

[1] بخاری عن ابی هريره رضی اللّٰه تعالٰی عنه، كتاب الحوالات، باب في

نہیں اور یہ شرط معتبر بھی ہوگی اور اگر پھل تیار ہونے سے پہلے اس طرح کا معاملہ ہوتو درست نہ ہوگا۔ عموم بلویٰ کے تحت طحاوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ابن نجیم و حصکفی وغیرہ کے بیان کے مطابق اسی پر فتویٰ بھی ہے

پھلوں کی فروخت میں مروج استثناء

ایک خاص عرف بعض علاقوں میں یہ ہے کہ خریدار پھل کی کچھ متعین مقدار مالک کو دیا کرتا ہے، جس کو بعض مقامات پر ''ڈالی'' یا ''جنس'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اس صورت میں اگر باغ کے ایک درخت کی تعیین کر لی جائے کہ اس کا پھل خود مالک لے گا تب تو جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں، اس لئے فقہاء نے فروخت میں کسی متعین درخت کے استثناء کو درست قرار دیا ہے، لیکن اگر درخت کے بجائے پھل کی مقدار مستثنیٰ کی کہ اتنے پھل، مالک کو دیئے جائیں گے جیسا کہ آج کل عام طور پر مروج ہے تو یہ صورت مالکیہ کے یہاں جائز ہے احناف کے یہاں جائز نہیں۔ "ولا یجوز ان یبیع ثمرة ویستثنی منها ارطالا معلومة خلافا لمالک[1]"

اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی بھی وہی رائے ہے جو احناف کی ہے[2] میرا خیال یہ ہے کہ اول تو تعامل کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ میں بھی مالکیہ کی رائے اختیار کر لی جائے تو نامناسب نہیں، دوسرے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ احناف کے یہاں متفق علیہ نہیں ہے، صاحب ہدایہ کا کہنا ہے کہ یہ حسن بن زیاد کی روایت ہے ورنہ ظاہر روایت کا تقاضا ہے کہ اس کو جائز ہونا چاہئے اس لئے کہ جب وہ متعینہ مقدار فروخت کی جا سکتی ہے تو فروخت سے اس کا استثناء بھی کیا جا سکتا ہے: "ما یجوز ایراد العقد علیه بانفراده لا یجوز استثناءه من العقد[3]"

مولانا تھانوی نے بھی اس ''جنس'' یا ''ڈالی'' کو تعامل کی بنا پر جائز قرار دیا ہے[1]

الحواله

B —

حقوق کی خرید وفروخت

ہمارے زمانہ میں اشیاء اور املاک کی طرح حقوق بھی خریدے اور بیچے جاتے ہیں بلکہ بعض حقوق تو ایسے ہیں کہ معاشی اعتبار سے ان کی اہمیت عام اموال و جائداد کے مقابلہ کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے، سوال یہ ہے کہ ایسے حقوق کی خرید وفروخت، اس کا معاوضہ لینا اور دینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کون سے حقوق اس لائق ہیں کہ ان کی خرید وفروخت کی جاسکے؟ اس سلسلہ میں حاصل یہ ہے کہ بعض حقوق محض دفع ضرر کے لئے دیئے گئے ہیں، حالانکہ اصلاً انسان کو یہ حقوق حاصل نہ ہونے چاہئے تھے مثلاً حق شفعہ، حق حضانت و پرورش، شوہر پر عورت کا حق عدل وغیرہ۔ یہ حقوق ضرورۃً انسان کو دیئے جاتے ہیں اس لئے اگر کوئی شخص ان حقوق سے دستبردار ہو جاتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ ان حقوق کا ضرورت مند نہیں ہے لہٰذا اب وہ ان حقوق کے باب میں حقدار ہی باقی نہ رہا، ایسے حقوق کی نہ خرید وفروخت درست ہے نہ کسی اور طور اس کا عوض وصول کرنا جائز ہے۔ شامی نے موصی لہ کے حق خدمت اور شفیع کے حق شفعہ کے درمیان فرق کرتے ہوئے اس نکتہ پر روشنی ڈالی ہے:

”وحاصله ان ثبوت حق الشفعة للشفيع وحق القسم للزوجة وكذلك حق الخيار في النكاح للمخيرة انما هو لدفع الضرر عن الشفيع والمرأة وماثبت لذلك لا يصح الصلح عنه ...... اما حق الموصى له بالخدمة فليس كذلك بل ثبت له على وجه البر والصلة فيكون ثابتا له اصالة فيصح الصلح عنه اذا نزل عنه لغيره۔“

دوسری قسم کے حقوق وہ ہیں جو حکم شرعی یا ایسے عرف کی بنا پر (جو شریعت کے عمومی مصالح سے مطابقت رکھتے ہوں) اصالۃً کسی شخص کے لئے ثابت ہوں یہ بھی دو

---

q هندیه: ۳/۳

طرح کے ہیں، بعضے وہ ہیں جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل کئے جا سکتے ہیں، دوسرے وہ جن کا ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف انتقال نہیں ہو سکتا، ان کی خرید و فروخت بھی نہیں ہو سکتی کہ خرید و فروخت کے لئے انتقال ملک ضروری ہے اور یہ حقوق قابل انتقال نہیں ہیں۔ ہاں بطریق صلح و تنازل (دست برداری) اس کا عوض وصول کیا جا سکتا ہے، ان حقوق کی فروخت کے جائز نہ ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق ولاء کے خرید و فروخت اور اس کے ہبہ سے منع فرمایا ہے۔[1] اور دست برداری اختیار کر کے عوض وصول کرنے کی دلیل قصاص و خلع ہے جس میں مقتول کا وارث حق قصاص اور شوہر بیوی پر "ملکیت نکاح" سے باہم طے شدہ معاوضہ کے بدلہ دست کش ہو سکتا ہے۔ اور یہ شریعت کے مسلمات اور فقہاء کے متفقات میں سے ہے۔ رہ گئے وہ حقوق جن کی منتقلی ممکن ہے "مال" کے حکم میں ہیں اور ان کی خرید و فروخت درست ہے۔

اس تفصیل کے مطابق حقوق و منافع کی فروخت کی جو صورتیں فی زمانہ رائج ہو گئی ہیں وہ یہ ہیں: خلو یعنی حق راہ اجارہ کی فروخت جس کو "پگڑی" سے تعبیر کیا جاتا ہے، حق ایجاد، حق تالیف، رجسٹرڈ ٹریڈ مارک اور ناموں کی فروخت نیز فضا کی فروخت، اور یہ سبھی جائز ہیں۔[2]

سود

معیشت کے باب میں شریعت اسلامی نے جس چیز کو سب سے زیادہ ناپسند کیا ہے اور اس پر نفریں بھی بھیجی ہے وہ سود ہے۔ قرآن مجید نے کھلے لفظوں میں سود خوری کی ممانعت فرمائی: ﴿ ° « ½¼ ¾ ئ﴾[1] قرآن میں ایک موقعہ پر سود خواروں کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس کیف و حال کے

w كونه مالاً موجوداً متقوماً، رد المحتار: ۳/۵ e رد المحتار: ۳/۱۰۰

ساتھ قبر سے اٹھیں گے کہ گویا آسیب نے ان کو ہوش وحواس سے محروم کر دیا ہو[2] اور کیوں نہ ہو کہ سود خواری ہے ہی ایسی لعنت جس کو حرص وہوس، دنیا طلبی اور بیش از بیش حصول دنیا کا جنون بے قابو کر کے رکھ دیتا ہے اور غریبوں اور کمزوروں کے پسینہ اور خون سے اس کو قند ونبات کی لذت کا احساس ہونے لگتا ہے اس لئے قیامت میں ہوش وحواس سے اس کی یہ محرومی اس کے جرم کے عین مطابق حال سزا ہے۔ "**ولا یظلم ربک احداً**"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت غیظ وغضب اور تنبیہ وتوبیخ کے لہجہ میں سود کی ممانعت فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا کہ سود کے بہتر (۷۲) درجہ گناہ ہیں اور اس میں کمتر گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے زنا کرے۔[3] ایک روایت میں ہے کہ سود کا ایک درہم حالت اسلام میں تینتیس بار زنا سے بڑھ کر ہے۔[4] ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی آبادی میں سود اور زنا کی کثرت ہو جاتی ہے تو پھر ان عذاب الٰہی کا ظہور ہوتا ہے۔[5] ایک موقعہ سے ارشاد فرمایا کہ جب کسی قوم میں سود عام ہو جاتا ہے تو اس پر قحط مسلط کیا جاتا ہے۔[6] یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف سود کے کھانے کو منع فرمایا بلکہ سود کے معاملہ میں کسی طرح کے تعاون کو بھی ممنوع قرار دیا، خود زبان رحمت مآب کے ذریعہ سود لینے والے، دینے والے گواہ بننے والے اور سودی کاروبار رکھنے والے سبھوں پر لعنت بھیجی گئی ہے۔[7]

بنک انٹرسٹ

سود ایسے اضافہ کو کہتے ہیں جس کے مقابلہ میں معاملہ کے دوسرے فریق کی طرف سے کوئی عوض نہ ہو۔[1] یہی تعریف تقریباً دوسرے اہل علم نے بھی کی ہے سود کی

---

q ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی النھی للمسلم ان یدفع الی الذمی الخمر

اس تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سود چاہے کسی وقتی ضرورت کے تحت قرض پر لیا جائے یا تجارت قرض پر، وہ بہرصورت حرام ہے کیوں کہ حدیث اور فقہاء کی تصریحات سے سود کی جو حقیقت سامنے آتی ہے اس میں دونوں ہی طرح کے سود شامل ہیں۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ بینک وغیرہ جو لوگوں کی رقوم کو تجارتی اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے اس کی طرف سے ملنے والا نفع ''سود'' میں داخل نہیں ہے کیوں کہ اسے غریبوں......کا استحصال نہیں ہوتا۔لیکن یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ:

1 آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی تفریق کے بغیر ہر طرح کے قرض پر نفع کے حصول کو ناجائز قرار دیا ہے، ارشاد ہوا''**کل قرض جر نفعاً فھو رباً**''

2 یہ رائے اس اصول پر مبنی ہے کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں سود خوری کی جو کیفیت پائی جاتی تھی، آیت ربا میں صرف اسی صورت کی ممانعت تسلیم کی جائے گی، لیکن یہ فقہاء کے اس اصول مقررہ کے خلاف ہے کہ نصوص میں ہمیشہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ اس کے موقعۂ ورود کا، ''**العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص المورد**''

3 خود زمانۂ نبوت میں بھی تجارتی قرضوں اور سودی قرضوں کا رواج تھا لیکن ربا کی حرمت سے متعلق آیات و روایات میں تجارتی و غیر تجارتی قرضوں میں کسی طرح کی تفریق نہ کی جانی اس بات کی علامت ہے کہ ممانعت کا یہ حکم تجارتی قرضوں کو بھی شامل ہے۔[1]

---

w ترمذی عن جابر باب ماجاء فی بیع جلود المیتۃ والاصنام، وبخاری کتاب البیوع باب بیع المیتۃ والاصنام

e ترمذی عن ابن عمر کتاب البیوع باب ماجاء فی کراھیۃ عسب الفحل

r درمختار علی ھامش الرد: ۱۰۵/۳

q در علی ھامش الرد: ۱۱۱/۳ w ردالمحتار: ۱۱۱/۳ e درمختار: ۱۱۱/۳

4 یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ تجارت قرضوں میں استحصال نہیں ہوتا کیونکہ تاجر کو اس سرمایہ کے استعمال میں نقصان بھی ہوسکتا ہے، کبھی نہ نفع اور نہ نقصان کی صورت بھی پیش آ سکتی ہے اور عین ممکن ہے کہ نفع کے مقرر کردہ تناسب کے برابر بھی نفع حاصل نہ ہو سکے۔

بنک انٹرسٹ کا مصرف

اس تفصیل کی روشنی میں بنک سے حاصل ہونے والا نفع ربا ہے جس کو بنک میں چھوڑنے سے ایک سودی کاروبار کا تعاون ہوتا ہے اور کبھی ایسی رقوم کا استعمال اسلام کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اس رقم کا نکال لینا اور نکال کر فقراء و مساکین پر یا رفاہی امور میں خرچ کر دینا واجب ہے۔ البتہ مساجد کی تعمیر میں اس کا استعمال اس کی عظمت وحرمت کے خلاف ہے اس لئے اس سے منع کیا جائے گا[2]

سودی قرض لینا کب جائز ہے؟

سودی قرض لینا کب جائز ہے؟ ابن نجیم نے اس بارے میں لکھا ہے کہ حاجت مندوں کے لئے سودی قرض لینے کی گنجائش ہے[3] لیکن یہ مسئلہ کہ کس حاجت کو شرعی حاجت شمار کیا جائے گا؟ فقہاء کی صراحتوں سے اصولی طور پر اس سلسلہ میں یہ بات منقح ہوتی ہے کہ:

1 عام حالات میں محض معیار زندگی کی بلندی خوب سے خوب تر کی تلاش کے پیش نظر سودی قرض لینا جائز نہیں۔

2 ضرورت یعنی ایسے حالات میں جب کہ کھانے کپڑے، علاج وغیرہ کی بنیادی ضرورت کی فراہمی کے لئے سودی قرض کے سوا کوئی چارہ نہ رہے اور فاقہ مستی کی

---

۲ الطبرانی فی الاوسط عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده عن النبی صلعم

نوبت ہوتو سودی قرض لینا جائز ہے۔

3 حاجت کے تحت بھی یعنی جب سودی قرض نہ لینے کی شکل میں شدید مشقت یا ضرر کا اندیشہ ہوتو بھی سودی قرض لینے کی گنجائش ہے، جیسے غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کے لئے اس پر مجبور ہو۔

مشقت کی ایسی صورتوں میں جو اجتماعی بن گئی ہوں، حکم نسبتاً زیادہ خفیف ہے۔

اشخاص وافراد کے لئے سودی قرض کب حاجت بن جاتا ہے اور کب نہیں؟ اس کا اندازہ ان کے شخصی حالات، ان کے علاقے اور خاندان کے معیار زندگی سے کیا جائے گا۔[1]

رہن کے مال سے فائدہ اٹھانا

اسلام نے سود کا دروازہ بند کرنے کے لئے قرض کا دروازہ کھولا ہے بلکہ قرض کے ذریعہ غریبوں اور کمزوروں کی مدد کی حوصلہ افزائی کی ہے اور زکوٰۃ کی ایک مستقل مد مقروضوں کی اعانت کو قرار دیا ہے "والغارمین" پر بطور وثیقہ اور ثبوت کے رہن رکھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے اور یہ بھی قرآن ہی نے بتادیا ہے کہ مال مرہون پر قبضہ ہی برقرار رکھنے کا حق ہوگا، نفع اٹھانے کا حق نہیں ہوگا۔ "فان لم تجدوا کاتبا فرھان مقبوضة"[2] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس رہن رکھ کر کچھ کھانے کی اشیاء خرید فرمائی ہے۔[3] لیکن چوں کہ اسلام میں قرض پر کسی بھی طرح کا نفع اٹھانا حرام ہے اور پیغمبر اسلام نے اس کو سود قرار دیا ہے "کل قرض جر نفعا فھو ربا" سود کے بارے میں حقیقت سود تو کجا شبہ سود

تخریج ھدایہ: ۳/۶۳ درایة

q عالمگیری: ۳/۱۳۳ w مسلم کتاب البیوع باب بطلان بیع المبیع قبل القبض

بھی نا قابل برداشت ہے اس لئے رہن کے سامان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض فقہاء احناف نے مالک کی اجازت سے رہن سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ سود کا حاصل کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا بہرحال ناجائز ہے گو رضا مندی اور خوشی سے حاصل کیا جائے۔ خاتم الفقہاء علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پہلو پر توجہ کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فقیہ عبداللہ سمرقندی مالک کی اجازت سے بھی سامان رہن سے فائدہ اٹھانے کو ناجائز قرار دیتے تھے، پھر بعض علماء نے نقل کیا ہے کہ اگر قرض دیتے وقت سامان رہن سے فائدہ کی شرط لگا دی ہو تب تو ناجائز ہوگا اور سود ہوگا ورنہ نہیں، علامہ شامی نے اس ''اگر مگر'' پر خود تبصرہ کیا ہے اور لکھا ہے:

”والغالب من احوال الناس انهم انما يريدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما اعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط لان المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع۔“[4]

D: ''لوگوں کے عمومی حالات یہ ہیں کہ لوگوں کا مقصود دے کر نفع حاصل کرنا ہوتا ہے، ایسا نہ ہو تو وہ طالب قرض کو درہم نہ دیں اور یہ شرط کے درجہ میں ہے اس لئے کہ رواج شرط کے درجہ میں ہے اور یہ بات اس صورت کے ممنوع ہونے کو متعین کر دیتا ہے۔''

پس قول فیصل، رائے صحیح، مذہب محتاط اور اسلام کے اصول عامہ سے ہم آہنگ یہی بات ہے کہ سامان رہن سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا قرض دہندہ کے لئے جائز

---

q بخاری: ۲۸۶/۱ باب بیع الطعام قبل ان یقبض الخ
w شرح نووی علی المسلم: ۵/۲ e شرح نووی علی المسلم: ۵/۲
r شرح نووی علی المسلم: ۵/۲ t دیکھئے فتح القدیر: ۱۳۸/۶
q دیکھئے بخاری کتاب الاجارہ باب اجرۃ السمسرۃ

نہیں، نہ مقروض کی اجازت سے اور نہ اس کی اجازت کے بغیر۔ فی زمانہ رہن کی زمین کی کاشت و پیداوار اور مکان کی رہائش وغیرہ سے انتفاع کا جو رواج ہوگیا ہے وہ قطعاً ناجائز خلاف شریعت اور سود میں داخل ہے۔

فروخت بر شرط واپسی

آج کل شہروں میں بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جتنا روپیہ قرض لینا یا دینا ہوتا ہے، مقروض اپنا مکان قرض دینے والے کے ہاتھ اس شرط کے ساتھ فروخت کر دیتا ہے کہ وہ جب قرض ادا کرے گا تو اپنا مکان واپس لے لے گا اور پھر وہ بدستور اس کی ملک میں آجائے گا۔

فقہاء کے یہاں اس کو بیع بالوفاء رہن معاد، بیع امانت اور بیع اطاعت سے تعبیر کیا جاتا ہے، شریعت کے اصول کے مطابق اگر کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جو تقاضائے خرید وفروخت کے خلاف ہو تو خرید وفروخت درست نہیں ہوتی، یہاں چوں کہ اس معاملہ کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شئے واپس کر دینی ہوگی اور یہ بیع کے اصول اور تقاضوں کے خلاف ہے، اس لئے معاملہ درست نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ عملاً اس کی صورت بالکل رہن کی سی ہے اور فقہاء نے بھی ایک طرف اس کے غیر معمولی تعامل اور دوسری طرف فقہی قباحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو رہن کی حیثیت سے جائز رکھا ہے۔ اب اس معاملہ کو رہن قرار دینے کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اس خریدار کو جس کی حیثیت دراصل رہن رکھے گئے مال کے امین کی ہے اور جسے فقہ کی اصطلاح میں ''مرتہن'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اس سے استفادہ کا کچھ حق نہیں ہوگا۔

"البیع الذی تعارفہ اهل زمننا احتیالا للربا وسموہ بیع

w یہ فقہ مالکی کی ایک خصوصی اصطلاح ہے۔

الوفاء وهو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به الا باذن مالكه وهو ضامن لما اكل من ثمرة واتلف من شجرة۔ “ [1]

D: ”وہ بیع جس کا آج کل ہمارے زمانہ میں سود سے بچنے کے لئے حیلہ کیا جا رہا ہے اور لوگ اس کو بیع وفاء کا نام دیتے ہیں، درحقیقت ”رہن“ ہے، نہ وہ اس کا مالک ہے اور نہ ہی مالک کی اجازت کے بغیر اس سے نفع اٹھا سکتا ہے، درخت کا جو پھل وہ کھائے یا درخت کو جو نقصان پہنچائے وہ اس کا ضامن ہوگا۔“

رشوت

شریعت میں کمائی کے جن طریقوں کی سخت مذمت کی گئی ہے ان میں ایک رشوت بھی ہے۔ رشوت کا لینا اور دینا دونوں حرام ہے، ایک حدیث میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں پر اپنی زبان مبارک سے لعنت بھیجی ہے۔[2]

رشوت ظلم نہ کرنے کے لئے حاصل کی جانے والی رقم بھی ہے اور جائز حق دینے پر لی جانے والی رقم بھی۔[3] لینا تو بہرطور حرام ہے البتہ اپنی جان و مال عزت وآبرو کے تحفظ اور انصاف اور جائز حق کے حصول کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے۔[4] اسی طرح کسی دشمن اسلام کے شر سے حفاظت کے لئے اس کو رشوت دی جائے یہ بھی جائز ہے جیسا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم مفسد شعراء کی زبان بندی کے لئے دیا کرتے تھے۔[5]

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اس قسم کی ناجائز رقوم ہدیہ یا انعام کے نام پر دی جائیں تب بھی وہ رشوت ہی ہیں، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کے لئے قریبی رشتہ داروں اور وہ لوگ جو پہلے سے تحفہ دینے کے عادی نہ ہوں یا دیتے رہے ہوں

لیکن اس مقدار میں نہ دیا کرتے ہوں یا قاضی کے اجلاس میں ان کا مقدمہ ہوتو ان کا تحفہ یا دعوت قبول کرنا جائز نہیں[1] علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہی حکم گاؤں اور مختلف شعبوں کے ذمہ داروں، حکومت کی طرف سے مقررہ مفتیوں، حکومت کے عمال، مارکٹ کے ذمہ داران وغیرہ کا بھی ہے بلکہ مقروض قرض دہندہ کو خلاف عادت تحفہ دے تو یہ بھی اسی حکم میں ہے۔[2]

اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہے کہ دفتروں اور آفسوں میں کام کرنے والے لوگ اپنے مفوضہ فرائض کے انجام دہی پر انعام وغیرہ کے نام سے جو وصول کرتے ہیں اور جو قبیح اور غیر شرعی رواج کے تحت معمول میں داخل ہو گئے ہیں قطعاً ناجائز اور حرام ہیں، رشوت ہیں اور ان کا واپس کر دینا واجب ہے۔

قمار وجوا

اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر شخص کو خود اپنی محنت اور جدوجہد سے نفع حاصل کرنا چاہئے۔ محنت کے بغیر محض دوسروں کا استحصال کر کے فائدہ اٹھانے کو اسلام ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، اسی لئے تجارت کو نہ صرف جائز بلکہ بہتر قرار دیا گیا ہے کہ اس میں تاجر اپنی محنت اور ذہانت کا حاصل وصول کرتا ہے اور سود کو ناجائز اور حرام کیا گیا کہ اس میں سود خوار کسی محنت کے بغیر غریبوں اور مفلسوں کا استحصال کر کے سرمایہ بڑھاتا رہتا ہے۔

---

q عمدۃ القاری: ۱۳/۱۲ w ملخص از ''جدید فقہی مسائل، حصہ اول''

q الھدایہ: جلد ۳

w جو تفصیلات ذکر کی گئی ہیں حافظ ابن ہمام نے ہدایہ کی شرح ''فتح القدیر'' میں اس کو لکھا ہے اور ابن عابدین شامی نے نقل کیا ہے۔ شامی: ۱۰۶/۴

q سنن ترمذی: ۲۴۵/۱، باب ماجاء فی المخابرۃ والمعاضمۃ

q المغنی: ۴۲/۴ w تحفہ الفقھاء: ص ۵۶

قمار میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔قمار کا اطلاق ہر ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جو نفع اور نقصان کے درمیان دائر ہو مثلاً لاٹری کا ٹکٹ ہے، اگر کوئی شخص پانچ روپیہ میں خرید کرتا ہے تو اسے نفع کی بھی امید ہے اور نقصان کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ایک لاکھ روپیہ کا مجوزہ انعام مل جائے اور عین ممکن ہے یہ پانچ روپیہ بھی واپس نہ آئے، یا مثلاً دو آدمی میں دوڑ کا مقابلہ ہو کہ اگر تم آگے بڑھ گئے تو تم کو پانچ روپے دے دیں گے اور ہم بڑھ گئے تو تم کو ہمیں دینا ہوگا، یہاں معاملہ نفع اور نقصان کے درمیان دائر ہے اس لئے ''قمار'' ہوگا۔

یہاں بھی دراصل وہی بات پائی جاتی ہے کہ حاصل ہونے والا نفع کسی محنت کا معاوضہ نہیں ہے اور جو نقصان پہنچا ہے اس کی کوئی معقول اور منصفانہ وجہ نہیں ہے۔ جس شخص کو لاٹری کے ایک لاکھ روپے مل گئے، اس نے یہ رقم ذاتی محنت اور جہد و کاوش سے حاصل نہیں کی ہے اور جس کے پانچ روپئے رائیگاں گئے اس کے یہ پانچ روپئے کسی معقول وجہ کے بغیر اس ایک لاکھ روپے حاصل کرنے والے کے ہاتھ چلے گئے۔

اس کو ''شرکت'' اور ''مضاربت'' پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ وہاں نفع اور نقصان معاملہ کے ہر دو فریق کو یکساں طور پر پہنچتا ہے ایسا نہیں ہوتا کہ ایک کو نفع ہو اور دوسرا نقصان اٹھائے، اس طرح نفع اور نقصان کا مدار ''اتفاق'' نہیں ہے بلکہ ان کی ذاتی محنت اور کاوش ہے جب کہ قمار میں ایک فریق مکمل فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسرا فریق مکمل نقصان۔ نیز نفع و نقصان کی بنیاد محنت نہیں ہے بلکہ اتفاق ہے۔

قمار کے نقصانات

قمار کے جو اخلاقی اور تمدنی اثرات و نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بجائے خود ایسے ہیں کہ ان سے منع کیا جائے۔اس کی وجہ سے حرص و لالچ پیدا ہوتی ہے آدمی خود غرض

e المغنی: ۴/۲۷ r عالمگیری: ۳/۱۰۹

اور ہوس پرست بن جاتا ہے، باہم حسد وڈاہ کی نفسیات جاگتی ہے، آپس میں نفرت و عناد جڑ پکڑتی ہے اور سعی ومحنت کے بجائے اسی طرح بیٹھے بٹھائے کھانے کمانے کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں:

"قمار سے حاصل ہونے والا مال حرام اور باطل ہے اس لئے کہ یہ لوگوں سے ان کا مال چھیننا اور جہالت، حرص ولالچ اور غلط آرزوؤں کے پیچھے چلنا ہے...... تمدن اور تعاون میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، نقصان اٹھانے والا خاموش رہ جائے تو غصہ اور افسوس کے ساتھ خاموش رہے گا، لڑے تو ایک ایسی بات پر لڑے گا جس کا سبب وہ خود بنا ہے، فائدہ اٹھانے والا اس جوئے سے لذت اندوز ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کی لالچ میں گرفتار رہتا ہے اور یہ حرص کسی مقام پر جا کر رکتی نہیں ہے۔ اس کا سلسلہ چل پڑے تو معیشت کو نقصان ہوگا، باہمی مخاصمت بڑھے گی۔ معاشی تگ ودوٹھپ پڑ جائے گی۔ اور اس تعاون سے جو تمدن کی بنیاد ہے، لوگوں میں اعراض پیدا ہو جائے گا۔ اگر آپ نے کسی جوئے خوار کو دیکھا ہے تو آپ کو اس کا بخوبی اندازہ ہوگا۔" [1]

جوئے کے نقصانات کا اہم پہلو یہ ہے کہ ایک عادت سی بن جاتی ہے ایک شخص ہارتا اور نقصان اٹھاتا جاتا ہے اور پھر اپنی بقیہ پونجی کو ایک موہوم فائدہ اور جیت کی امید پر لگاتا چلا جاتا ہے، اکثر اوقات یہ مدہوشی انسان کو مکمل قلاش اور دریوزہ گر بنا کر چھوڑتی ہے اور کبھی کبھی تو معاملہ اس حد تک فزوں ہو جاتا ہے کہ لوگ مال وسرمایہ سے گزر کر عزت وآبرو کا سودا کرنے اتر آتے ہیں اور بیوی بیٹی تک کی بازی لگا چھوڑتے ہیں۔ "والعیاذ باللّٰہ"

قمار ایام جاہلیت میں

ایام جاہلیت میں قمار کا رواج بہت زیادہ تھا، اس کی زیادہ رائج صورت یہ تھی کہ ان کے پاس کچھ پانسے ہوتے تھے جن پر مختلف مقدار لکھی رہتی تھی، مثلاً تہائی (ثلث)

آدھا (نصف) وغیرہ، بعض پر ''لا'' (نہیں) لکھا ہوتا تھا، اب جس کے نام پر جو پانسا نکلا اسی کے بقدر اس کو حصہ ملتا تھا اور جس کے نام پر ''لا'' ہوتا وہ بالکل محروم قرار پاتا تھا، حالانکہ جس شئے کی تقسیم کی جاتی اس میں سبھوں کے سرمائے یکساں طور پر لگتے تھے ــــــ اسی کو وہ ''ازلام'' کہا کرتے تھے۔

قرآن مجید

عربوں میں چوں کہ قمار کا رواج بہت قدیم اور بڑی کثرت سے تھا، اس لئے اس کی حرمت میں تدریج سے کام لیا گیا، پہلے مرحلہ میں صرف اس قدر کہا گیا کہ جوئے کے نقصانات اس کے فائدے سے زیادہ ہیں:

﴿ ´ µ ¶ ¸ ¹ º » ¼ ½ ¾
¿ À Á Â Ã Ä﴾ [1]

D: ''لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں، کہہ دیجئے کہ اس میں بڑا گناہ ہے، لوگوں کے لئے گو نفع بھی ہے مگر نقصان نفع سے بڑھ کر ہے۔''

یہاں ''میسر'' سے مراد قمار ہے، دوسرے مرحلہ میں، نہ صرف یہ کہ مکمل طور پر اس کی حرمت کا اعلان کر دیا گیا بلکہ اس کے لئے انتہائی تاکید اور سخت تنبیہ کا اسلوب اختیار کیا گیا، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿ ! " # $ % & ' ( ) *
+ , - . / 0 1 2 3
4 5 6 7 8 9 : ; < = >
? @ A B C D E F﴾

q تحفۃ الفقہاء: ص ۵۵ w رحمۃ الامۃ: ص ۱۲۲

D: ''اے اہل ایمان! شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک اور شیطانی کام ہیں، ان سے بچو، امید ہے کہ اس طرح تم کامیاب ہوگے، شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان عداوت ونفرت پیدا کردے اور تم کو ذکر خداوندی اور نماز سے روک دے پھر کیا تم لوگ اس سے رکو گے؟؟۔'' [1]

احادیث میں بھی اس کی بڑی مذمت آئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اپنے ساتھی سے کہے، آؤ تمہارے ساتھ جوا کھیلیں، اسے صدقہ کرنا چاہئے [2] یعنی صرف جوے کی دعوت بھی اتنا بڑا اجرم ہے کہ صدقہ کے ذریعہ اس کا کفارہ ادا کر دینا چاہئے، چہ جائے کہ خود جوا کھیلنا یا جوئے کا کاروبار کرنا ـــــ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے تمام تجارتی معاملات اور کاروبار کو ممنوع قرار دیا ہے جس میں قمار اور جوا پایا جاتا ہو۔

لاٹری اور معمے

لاٹری میں بھی قمار اور ربوا دونوں ہی پایا جاتا ہے، اس لئے کہ جو ٹکٹ خرید کرتا ہے اگر اس کے نام سے لاٹری نکلے جو اکثر اوقات روپیہ ہی کی صورت میں ہوتی ہے تو لین دین کے معاملہ (عقد معاوضہ) میں ایک طرف سے کم اور دوسری طرف سے زیادہ معاوضہ ہو جائے گا اور یہی ''ربوا'' ہے، دوسرے اس میں نفع ونقصان مبہم اور خطرہ میں رہتا ہے کہ اگر نام نکل آیا تو نفع ہوگا نہ نکلا تو اصل پونجی بھی ڈوب جائے گی۔ پھر یہ نفع ٹکٹ خریدنے والوں کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض بخت واتفاق ہے کہ اسی کا نام نکل آیا ـــــ ایسے ہی مبہم اور زیر خطر نفع ونقصان کو قمار کہتے ہیں، اس لئے قمار بھی پایا گیا۔

امام ابوبکر جصاص رازی لکھتے ہیں:

---

q المغنی: ۹/۵۷

"لا خلاف بين اهل العلم في تحريم القمار وان المخاطرة من القمار قال ابن عباس ان المخاطرة قمار"[1]

D: ''جوئے کی حرمت اور ''مخاطرہ'' کے جوا ہونے میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ابن عباس نے فرمایا کہ مخاطرہ جوا ہے۔''

قریب قریب یہی نوعیت معمہ کی بھی ہے، اس میں بھی معمہ پر کر کے بھیجنے والا فیس ادا کرتا ہے، حل صحیح نکل آیا تو زیادہ رقم ملتی ہے ورنہ اصل پیسے بھی واپس نہیں ہوتے، ہاں اگر معمہ بھیجنے والوں سے کوئی فیس نہ لی جائے تو یہ صورت درست ہوگی اور اس رقم کی حیثیت خالص انعام کی قرار پائے گی۔

انشورنش

قمار آمیز کاروبار جو آج کل جاری ہیں، ان میں سرفہرست انشورنش کا مسئلہ ہے، گو انشورنش کی صورتوں اور پالیسیوں میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے لیکن عام طور پر وہ دو مفاسد سے خالی نہیں ہیں، ایک سود، دوسرے قمار ـــــ سود تو ہر صورت میں ہے، اس لئے کہ جمع شدہ رقم کی حیثیت قرض کی ہے اور منافع گویا اس مہلت کا معاوضہ ہے، اسی کا نام ربوا ہے، اور اگر مدت مقررہ سے قبل موت واقع ہوگئی تو قمار بھی پایا گیا کیوں کہ مال حاصل ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد ایک ایسی چیز کو بنایا جارہا ہے جس کا موجود ہونا اور نہ ہونا مبہم ہے، اسی کو فقہاء ''خطر'' اور ''مخاطرہ'' سے تعبیر کرتے ہیں اور ایسی تمام چیزوں کو قمار قرار دیتے ہیں۔"لا خلاف بين اهل العلم في تحريم القمار وان المخاطرة من القمار۔"[2]

یہاں بھی یہی صورت ہے کہ مقررہ میعاد کے درمیان موت یا عضو یا کاروبار کے ضائع یا ہلاک ہونے کی وجہ سے جو نفع متوقع ہے اس کا حاصل ہونا اور نہ ہونا موقع خطر

q هدایه: ۱۱/۳ w فتح القدیر: ۳۹۲/۵ e هدایه: ۱۱/۳

میں ہے کہ اگر یہ چیزیں سلامت رہ گئیں تو یہ نفع حاصل نہ ہو سکے گا۔ اور چوں کہ کم رقم دے کر زیادہ رقم حاصل کی جا رہی ہے، اس لئے سود بھی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے

لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں ہندو مسلم فسادات کی کثرت اور ان فسادات کا اتفاقاً پیش نہ آنا بلکہ بعض جماعتوں اور تحریکوں کی طرف سے مسلمانوں کی جان واملاک کی ہلاکت و بربادی کی سعی نے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ یہ حالت موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انشورنش کی اجازت دی جا سکتی ہے؟ اور اس کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں علماء کی ایک جماعت جواز کا فیصلہ کر چکی ہے، حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے جماعتی اعتبار سے جان و مال اور کاروبار کا انشورنش فقہی اصطلاح کے اعتبار سے ''حاجت'' کا درجہ ضرور اختیار کر گیا ہے اور عمومی اور اجتماعی نوع کی حاجتیں ضرورت ہی کا درجہ رکھتی ہیں[1] بلکہ فقہاء نے تو انفرادی حاجت کی بنا پر بھی سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے ''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح''[2] دفع ضرر ہی کافی نہیں بلکہ کسی چیز کے تعامل اور رواج کو بھی حاجت کی کیفیت پیدا ہونے کے لئے کافی تصور کیا گیا ہے ''ومنها الافتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على اهل بخارى وهكذا بمصر وقد سموه بيع الامانة''[3] جن چیزوں میں کاریگروں سے غیر موجود مصنوعات کے خریدنے کا رواج ہو، ان میں رواج و تعامل کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقہاء نے ''استصناع'' کی اجازت دی ہے:

''ثم انما جاز الاستصناع فيما للناس فيه تعامل اذا بين

---

q امداد الفتاوی　　w رد المحتار: ۱۶/۴

B

"وصفاً على وجه يحصل التعريف اما فيما لاتعامل فيه ...... لم يجز" [1]

اسی طرح حاجت کی بنا پر "ضمانِ درک"[2] وغیرہ کی گنجائش سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے جان و مال اور تجارت وصنعت وغیرہ کے سلسلہ میں جس ضرر شدید سے دوچار ہیں وہ مذکورہ حاجتوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس لئے اجتماعی حاجت کی بنا پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں جان و مال اور تجارت و صنعت کا انشورنس جائز ہوگا۔

دوسرے امت کا اختلاف رحمت ہے اور جہاں دقت پیدا ہو جائے وہاں اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علماء کے مشورہ سے قول ضعیف پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ شامی نے لکھا ہے[3] امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دارالحرب میں عقود فاسدہ کے ذریعہ حصول مال مسلمان کے لئے جائز ہے، یہ رائے گو دلائل کے اعتبار سے مرجوح ہے لیکن بے اصل نہیں ہے، ایسا ملک جو دارالحرب ہو لیکن اہل اسلام سے اس کی مصالحت ہوگئی ہو اور گویا اس کی حیثیت معاہدین کی ہوگئی ہو، امام محمد کی حسب تحریر ان سے بھی عقود فاسدہ جائز ہے۔

"فلو ان اهل دار من دار الحرب وادعوا اهل الاسلام فدخل اليهم مسلم وبايعهم الدرهم بالدرهمين لم يكن بذلك بأس لان بالموادعة لم تصر دارهم دار الاسلام

D: "اگر دارالحرب کے لوگ اہل اسلام سے صلح کر لیں پھر کوئی مسلمان ان کے ملک میں جائے اور دو درہم کے بدلہ ایک درہم خرید کر

---

q بخاری، باب بيع الولاء وهبته

w تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "جدید فقہی مسائل حصہ دوم"، مقالہ: حقوق کی خرید وفروخت، طبع دوم

q آل عمران، آیت: ۱۳۰ w بقرہ، آیت: ۲۷۵ e مجمع الزوائد: ۱۱۷/۴

لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ اس مصالحت کی وجہ سے ان کا ملک دار الاسلام نہیں بن جاتا۔''

ہندوستان میں بھی یہاں کی حکومت اور غیر مسلم شہریوں کو ایک حد تک ''موادعین'' کی فہرست میں رکھا جاسکتا ہے، پس ایک طرف مسلمانوں کی یہ اجتماعی حاجت اور دوسری طرف فقہ حنفی میں یہ گنجائش اس بات کا جواز فراہم کرتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو جان، مال، تجارت اور کاروبار کے انشورنش کی اجازت دی جائے۔

اس سلسلہ میں ۱۵، ۱۶ دسمبر ۱۹۶۵ء کو مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ایک نشست بلائی تھی جس میں کچھ نمائندہ اہل علم نے شرکت کی تھی اس اجتماع نے انشورنس کے سلسلہ میں جو متوازن، بصیرت افروز اور حقیقت پسندانہ رائے قائم کی ہے۔ وہ یوں ہے:

''مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگر چہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے ربوا و قمار (سود اور جوا) لازم ہے اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب ہے لیکن جان و مال کے تحفظ و بقا کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے۔ نیز مجلس اس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کرسکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی ریاستوں سے انشورنس انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہوگیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جان و مال کے تحفظ کے لئے بھی بعض

---

r مجمع الزوائد: ۴/۱۱۷، بحوالہ طبرانی عن عبداللّٰہ بن سلام

t مجمع الزوائد: ۴/۱۱۸، بحوالہ طبرانی عن ابن عباس

y مجمع الزوائد، بحوالہ مسند احمد عن عمرو بن ابی العاص

u ابوداؤد عن عبداللّٰہ بن مسعود: ۴۷۳/۲ باب فی اکل الربو موکلہ

حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا۔اس لئے ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائیداد کا بیمہ کرائے تو مذکورہ بالا ائمہ کرام کے قول کی بنا پر اس کی شرعاً گنجائش ہے۔

اوپر کی عبارت میں لفظ ''ضرورت شدیدہ'' سے مراد یہ ہے کہ جان یا اہل وعیال یا مال کے نا قابل برداشت نقصان کا قوی اندیشہ ہو۔

''ضرورت شدیدہ'' موجود ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مجلس کے نزدیک مبتلی بہ (جو شدید دشواریوں میں مبتلا ہو کر بیمہ کرانا چاہتا ہو) کی رائے پر منحصر ہے جو خود کو عنداللہ جواب دہ سمجھ کر علماء کے مشورہ سے قائم کرے۔'' [1]

موجودہ انشورنس کا اقتصادی نقصان

ویسے انشورنس کا موجودہ نظام غیر اسلامی ہونے کے علاوہ معاشی اعتبار سے بھی نظر ثانی کا محتاج ہے۔موجودہ نظام میں بینک کی طرح اصل فائدہ چند سرمایہ داروں کو حاصل ہوتا ہے،انہیں کے پاس دولت کا ارتکاز ہوتا جاتا ہے اور عام لوگوں کو اس سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کا تناسب بہت معمولی ہوتا ہے۔

مثلاً اگر ایک سال میں اس اسکیم میں ایک سو آدمی شریک ہوں اور ان سے ایک لاکھ روپے حاصل ہوں تو انشورنس کمپنی ان کو تجارت،صنعت اور مختلف کاروبار میں لگا کر بے پناہ فائدہ بٹورتی ہے،اس کا فائدہ ۹۰ فیصد حصہ چند سرمایہ داروں کے جیب میں جاتا ہے،عام شرکاء کے حصہ میں جو نفع ملتا ہے اس کی مجموعی قدر حاصل ہونے والے منافع کا ۱۰/ فیصد سے زیادہ نہیں ہوتا،اگر ایک دو ممبر کی موت ہوئی تو کمپنی جغرافیائی حالات اور سابقہ ریکارڈ کی روشنی میں پہلے سے اس کو ملحوظ رکھتی ہے۔

اقتصادی لحاظ سے یہ بات زیادہ مفید اور بہتر ہوتی ہے کہ چند آدمیوں میں

---

[1] عنایہ علی ھامش الفتح: ۱۶۴/۹

دولت کا ارتکاز ہونے کے بجائے وہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پھیلے اور گردش میں رہے، اس طرح غربت کم ہوگی اور نفع میں عام لوگوں کو شرکت کا موقع ملے گا، اس لئے اسلام نے شرکت اور مضاربت کے اصول پر کاروبار کا نظام رکھا ہے تاکہ حاصل ہونے والے نفع سے کاروبار کے تمام شرکاء یکساں طور پر مستفید ہوسکیں۔

زراعت وکاشت کاری

تجارت کے بعد دوسرا اہم ذریعہ معاش زراعت اور کاشتکاری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زراعت کی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی ہے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ مسلمان کوئی درخت یا کھیتی لگائے اور اس میں سے انسان، درندہ، پرندہ یا چوپایہ کھائے تو وہ اس کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے۔[1] اسی لئے بعض صحابہ خاص اہتمام سے درخت لگایا کرتے تھے، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خاص اسی نیت سے درخت لگانا نقل کیا ہے۔[2] حضرت حسن سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہد مکھی اور درخت باعث برکت ہے۔[3]

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہزار ترقی اور صنعتی ارتقاء کے باوجود آج بھی زمین ہی انسان کی غذائی ضروریات کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اسی کے ذریعہ نہ صرف غذا بلکہ علاج وادویہ کی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں، اسی لئے اسلام نے اس کی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ زمین کا خواہ مخواہ افتادہ رہنا اور اس کی قوت کاشت سے فائدہ نہ اٹھانا ناپسندیدہ بات ہے، چنانچہ اگر ایسی افتادہ زمین ہو جس کو فقہ کی

---

q ملاحظہ ہو، مولانا تقی عثمانی کی تکملہ فتح الملھم: ۵۷۱/۱ تا ۵۷۴

w تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: جدید فقہی مسائل حصہ دوم: ص ۲۶۹ تا ۲۷۲

e الاشباہ والنظائر مع الغمز: ۲۹۴/۱

q تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مقالہ ''بینک انٹرسٹ، سودی قرض اور ہندوستان کی شرعی حیثیت''

اصطلاح میں ''موات'' کہتے ہیں تو اسے جو بھی آباد کر لے جائز ہے۔[1] امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایسی سرکاری غیر مزروعہ زمین سرکار کی اجازت سے کاشت کی جا سکتی ہے۔ پھر اگر تین سال گزر جائے اور وہ کوئی فائدہ نہ اٹھائے تو زمین اس سے لے کر دوسرے کو حوالہ کر دی جائے گی تا کہ دوسروں کو استفادہ کا موقع مل سکے۔[2] امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک تو ایسی افتادہ زمین کی آبادکاری کے لئے حکومت سے اجازت کا حصول بھی ضروری نہیں۔[3]

البتہ دوسرے مشاغل کی طرح کاشت کاری میں بھی اتنا غلو اور اشتغال کہ دوسرے فرائض سے غفلت ہو جائے مناسب نہیں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو امامہ باہلی کے گھر میں کھیتی باڑی کے سامان دیکھے تو فرمایا کہ جس قوم کے گھروں میں یہ آتا ہے وہاں ذلت بھی آ جاتی ہے۔[4] غالباً ایسا اس لئے فرمایا گیا کہ کھیتی باڑی کرنے والے نہ جہاد اور دفاع کی تیاری کر پاتے ہیں اور نہ اسفار، اس کی وجہ سے ان کے اندر بزدلی اور بزدلی کی وجہ سے ذلت پیدا ہو جاتی ہے۔[5]

کاشت میں بٹائی داری

شریعت میں ایسی نظیریں موجود ہیں کہ ایک شخص کے پاس اسباب و وسائل ہوں اور دوسرے کے پاس صلاحیت ہو اور ان دونوں کے مجموعہ سے جو پیداوار حاصل ہو وہ دونوں میں تقسیم ہو جائے ''مضاربت'' کا ماحصل یہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کاشتکاری میں بھی یہ بات کہ ایک شخص کی زمین ہو اور دوسرے شخص کی طرف سے محنت ہو، جائز ہے یا نہیں اور اسی زمین کی پیداوار دونوں میں تناسب کے لحاظ سے تقسیم ہو جائے؟ اس سلسلہ میں روایتیں مختلف ہیں، رسول اللہ صلی

جدید فقہی مسائل حصہ دوم: ص۲۷۲ تا ۲۷۶

w البقرہ، آیت: ۲۸۳

e بخاری عن عائشہ رضی اللہ تعالٰی عنھا کتاب الرھن، باب من رھن درعہ

اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ طے کیا تھا کہ وہ کھیتی کریں اور نصف پیداوار آپ کے حوالہ کریں۔[1] اس سے بٹائی داری کا جواز معلوم ہوتا ہے، دوسری طرف رافع بن خدیج اور بعض دوسرے راویوں کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا[2] اس سے ناجائز ہونا معلوم ہوتا ہے۔

لیکن درحقیقت ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ اصل میں اس طرح کاشتکاری اور نفع کی دونوں میں تقسیم جائز ہے بشرطیکہ زمینوں کے کسی خاص حصہ کی پیداوار یا متعینہ مقدار فریقین میں سے کوئی اپنے لئے مخصوص نہ کرلے اس لئے ممکن ہے کہ زمین کے اسی حصہ میں پیداوار ہو یا اتنی مقدار ہی میں غلہ نکلے تو ایسی صورت میں دوسرا فریق بالکل محروم رہ جائے گا اس لئے یہ شکل جائز نہیں۔

اس حدیث کی جو تاویل کی گئی ہے اس کی تائید خود امام بخاری کی روایت سے ہوتی ہے، امام بخاری نے رافع بن خدیج سے نقل کیا ہے کہ ہم لوگ زمین میں ایک متعین گوشۂ زمین کو مالک زمین کے لئے چھوڑ دیتے تھے، اس سے منع کیا گیا۔[3]

چنانچہ امام ابوحنیفہ نے گو بٹائی داری کو مکمل منع کیا ہے لیکن آپ کے بعض تلامذہ اور اکثر فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، ہاں اس صورت کو منع کیا ہے جب کہ زمین کا مخصوص حصہ یا پیداوار کی ایک مخصوص مقدار فریقین میں سے کوئی اپنے لئے مخصوص کرلے اور اس پر فتویٰ ہے۔

کچھ اور احکام

''مزارعت'' کی تفصیلات باہمی معاہدہ اور عرف کے تحت طے پائیں گی، بیج مالک کی طرف سے ہو یا کاشتکار کی طرف سے؟ یہ عرف و عادت پر موقوف ہے اسی

---

q شامی: ۳۱۰/۵، ۳۱۱

q ردالمحتار: ۲۶۹/۵

w ابوداؤد، کتاب الاقضیہ باب فی کراھیۃ الرشوۃ۔ ترمذی کتاب

طرح کھیتی مکمل ہونے کے بعد اس کی کٹوائی اور گھر پہنچوائی کس کے ذمہ ہے، ان سب میں لوگوں کا عام عرف اور تعامل اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی کی روشنی میں اس کا فیصلہ ہوگا۔[1]

صنعت وحرفت

صنعت وحرفت کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ سب سے بہتر کمائی کیا ہے؟ فرمایا آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا۔[2] ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ صنعت وحرفت جاننے والے مسلمان کو پسند فرماتا ہے۔[3] صنعت وحرفت میں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی انسانی خدمت اور حفاظت و جہاد کے تمام اسباب آجاتے ہیں، مسلمانوں نے ابتدائی دور ہی سے اس طرف بڑی توجہ دی ہے اور سائنسی ترقی میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ بدقسمتی سے ۱۷ویں صدی سے جب یورپ نے اس سمت میں تیز گامی کے ساتھ سفر طے کیا تو مسلمانوں نے اپنی سست انگاری اور غفلت کی وجہ سے اس میدان سے بالکل اپنے کو الگ تھلگ کرلیا جس کے سنگین نتائج ہمارے سامنے ہیں۔"والی اللّٰہ المشتکی"

دو بنیادی اصول

صنعت وحرفت میں صرف دو اصول سامنے رہنے چاہئیں اور وہ یہ کہ اس کے ذریعہ گناہ میں براہ راست تعاون نہ ہوتا ہو مثلاً مورتیوں اور مجسموں کا بنانا جائز نہیں، زنار کا بنانا جائز نہیں کہ وہ برادران وطن کے یہاں ایک مذہبی شعار کا درجہ رکھتی ہے، اسی طرح ذی روح کی تصاویر اور ان کے مجسمے بنانا جائز نہیں کہ خود حضور صلی اللہ علیہ

الاحکام باب ماجاء فی الراشی والمرتشی فی الحکم

e شامی: ۴/۳۰۳

r الاشباہ والنظائر لابن نجیم: ص ۱۵۸ قاعدہ ما حرم اخذہ حرم اعطاءہ

وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔[1]

دوسرا اصول یہ ہے کہ اپنی مصنوعات کو ایسے لوگوں سے فروخت کرنا جو اس کے ذریعہ فتنہ برپا کر سکتے ہوں، جائز نہیں، مثلاً مخالف اسلام قوتوں کو اسلحہ کی فراہمی جائز نہیں ہوگی کہ اس کا استعمال غلط ہوگا۔[2] اسی پر دوسری مصنوعات کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اجارہ ومزدوری

کسب معاش کا تیسرا ذریعہ مزدوری اور ملازمت ہے، اس معاملہ کو فقہ کی اصطلاح میں اجارہ اور کام کرنے والے کو اجیر کہتے ہیں، مزدور کا مسئلہ چوں کہ اہم ترین مسائل میں سے ہے اس لئے اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے:

مزدوروں کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جس کو گزشتہ نصف صدی کے اہم ترین مسائل میں شمار کیا جا سکتا ہے اور یہ فطری بات ہے، دنیا کی ساری بہار دراصل انہی کے دم سے ہے، بلند قامت عمارتیں ہوں، صاف ستھری سڑکیں ہوں یا دیہات کے سبزہ زار کھیت اور بل کھاتی ہوئی نہریں، سب کو انہی کے خون و پسینہ اور قوت بازو سے غذا ملتی ہے، یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ معاشی وترقی اور خوشحالی میں سب سے کم حصہ مزدوروں ہی کو ملتا ہے حالاں کہ وہ سب سے زیادہ اس کے حقدار تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دینی مناسب ہوگی کہ جب ہم مزدور کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے صرف وہ جفاکش طبقہ ہی مراد نہیں ہوتا جو جسمانی محنتوں اور مشقوں کے کام کرتا ہے بلکہ وہ ملازمین بھی مراد ہوتے ہیں جو لکھنے پڑھنے یا دوسرے دماغی قسم کے کام

---

t درمختار علی ھامش الرد: ۵/۲۷۲

q درمختار: ۴/۳۱۱ w ردالمحتار: ۴/۳۱۱

q حجة الله البالغه: ۲/۹۸

q البقرہ، آیت: ۲۱۹

کرتے ہیں۔

اسلام نے دوسرے شعبۂ ہائے زندگی کی طرح اس باب میں بھی مفصل اور واضح ہدایات دی ہیں جس میں آجر اور مزدور دونوں ہی کے حقوق کی رعایت ہے اور اعتدال وتوازن بھی ہے۔

مزدوروں کی اہمیت

سب سے پہلے تو اسلام نے مزدوروں کو ایک بلند مقام اور منصب کا حامل قرار دیا اور عام طور پر جو اس طبقہ کو کمتر اور حقیر گردانا جاتا تھا جو اب تک باقی ہے، کی نفی کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

- ✡ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ یا دس سال تک حضرت شعیب علیہ السلام کی مزدوری کی۔[1]
- ✡ حلال روزی کی تلاش میں محنت و کاوش کو عنداللہ پورے ایک سال امام عادل کے ساتھ جہاد سے افضل قرار دیا گیا۔[2]
- ✡ چھوٹے بچے، ماں باپ اور خود اپنی کفالت کے لئے دوڑ دھوپ (سعی) کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی راہ میں جد و جہد بتایا۔[3]
- ✡ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پاکیزہ عمل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے ہاتھوں کمائے۔[4]
- ✡ اور خدا کے نبی حضرت داؤد اپنے ہاتھوں ہی کی کمائی کھایا کرتے تھے۔[5]
- ✡ اللہ تعالیٰ ایسے مؤمن بندہ کو پسند کرتا ہے جو صنعت و حرفت سے واقف ہو اور اس سے کام لیتا ہو "ان اللہ یحب العبد المؤمن المحترف"[6]

---

q مائدہ، آیت: ۹۰، ۹۱ w بخاری، مسلم

q احکام القرآن: ۳۸۸/۱ w احکام القرآن: ۳۸۸/۱

q الاشباہ والنظائر للسیوطی: ص ۱۲۹

☆ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام انبیاء علیہم السلام نے بکریاں چرائی ہیں اور فرمایا خود میں بھی چند قیراطوں پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔[2]

☆ کاشتکاری کو مبارک کہا گیا اور اس کا حکم دیا گیا۔[3]

☆ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ارشاد فرمایا سب سے حلال وہ ہے جس میں دونوں پاؤں چلیں، ہاتھ کام کریں اور پیشانی عرق آلود ہو۔[4]

ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مزدوروں کو ایک معزز اور مؤقر مقام حاصل ہے اور دوسرے پیشوں اور طبقوں سے ان کی حیثیت کم نہیں ہے۔

اجرت کی مقدار

اس کے بعد مزدوروں کے حقوق کا مسئلہ آتا ہے جس میں سب سے بنیادی اور اولین چیز اجرت کی مقدار کا تعین ہے۔ اس پر اس حدیث سے روشنی پڑتی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے سلسلہ میں درج ذیل ہدایات دی ہیں:

''وہ تمہارے بھائی ہیں جن کو خدا نے تمہارے ماتحت رکھا ہے، لہٰذا خدا نے جس کے ماتحت اس کے بھائی کو کیا ہو اس کو چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے، جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے، اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو اس کے لئے دشوار ہو اور اگر ایسے کام کی ذمہ داری سونپ ہی دے تو پھر اس کی مدد کرے۔[5]''

پیغمبر اسلام اور ان کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اس ہدایت پر مکمل عمل تھا، ان

---

w الاشباء والنظائر لابن نجیم مع الغمز: ۲۹۸/۱

e الاشباء والنظائر لابن نجیم مع الغمز: ۲۹۸/۱

q قاضی خان: ۴۹۹/۱

w ''ضمانِ درک'' سے مراد یہ ہے کہ خریدار بیچنے والے سے سامان لینے کے علاوہ مزید ضمانت حاصل کرے کہ اگر اس سامان کا کوئی حقدار نکل آئے تو وہ اس سامان کی قیمت وصول کرے گا۔

کے غلام اور خدام ان کے ساتھ ہی وہی کھانا کھاتے تھے جو وہ خود کھاتے، غلاموں اور ان کے مالکوں کے کپڑے یک ہی معیار کے ہوتے تھے۔ ایک بار ایک ہی قسم کی چادر حضرت ابوذر غفاری اور ان کے غلام اڑھے ہوئے تھے، ایک شخص نے عرض کیا آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وہ چادر بھی خود اوڑھ لیں تا کہ اس کا جوڑا ہو جائے اور غلام کو کوئی اور چادر دے دیں، حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے انکار کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی ہدایت کا حوالہ دیا کہ جو خود پہنو وہی اس کو پہناؤ۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ مزدوروں اور ملازمین کی اجرت اس قدر ہونی چاہئے کہ کم از کم خوراک اور پوشاک کے معاملے میں اس کا معیار زندگی مالکین اور افسروں کے مساوی اور یکساں ہو۔

دوسرے اجرت کی مقدار اتنی ہو کہ وہ اہل وعیال کی بھی اسی طرح پر پرورش کر سکے، حسب ضرورت خادم رکھ سکے اور مکان بنا سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہمارا عامل (ملازم) بنے اسے چاہئے کہ بیوی حاصل کرلے، خادم نہ ہو تو ایک خادم رکھ لے اور مکان نہ ہو تو ایک مکان فراہم کرلے۔[2] حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد فرمایا میرا ذریعۂ معاش میرے اہل و عیال کے لئے کافی تھا، اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول کر دیا گیا ہوں اس لئے ابوبکر کے عیال اسی سرکاری مال میں سے کھائیں گے اور ابوبکر مسلمانوں کے لئے کام کریں گے۔[3]

---

e ردالمحتار

q الشرح الکبیر: ۱۶۹۳/۴

q اس پر شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مرحوم، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم، مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی، مولانا سیّد فخرالحسن صاحب مرحوم، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم، مولانا محمد ادریس صاحب ندوی مرحوم، مولانا شاہ عون احمد صاحب، مولانا ابوللیث صاحب ندوی مرحوم، مولانا محمد

اجرت کی ادائیگی

اجرت کے سلسلے میں اس اصولی ہدایت کے بعد ــــــ کہ ان کی جملہ ضروریات زندگی کی تکمیل کی جائے۔ اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اجرت کی مقدار پہلے ہی واضح کر دی جائے اور مبہم نہ رکھا جائے:

"ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نھی استجارۃ الاجیر حتی بین لہ اجرہ۔" [1]

D: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مزدور سے کام لینے سے منع فرمایا ہے تا آنکہ اس کی اجرت واضح کر دی جائے۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ کسی کو اس کی مزدوری کم نہ دیتے تھے [2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا دشمن ہوں گا، ان میں سے ایک وہ ہے جو کسی مزدور کو اجرت پر رکھے، اس سے پورا کام لے لے اور اجرت نہ دے۔"رجل استاجر اجیرا فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ۔" [3]

مزدور کی اجرت جلد سے جلد ادا کر دینی چاہئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مزدور کی اجرت پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو۔"اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ۔" [4]

فقہائے نے لکھا ہے کہ اجرت ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں، یا تو خود آجر قبل از کام اجرت دے دے، یا مزدور نے پیشگی مزدوری دینے کی شرط لگا دی ہو۔ اب بھی

اسحاق سندیلوی نے دستخط کئے ہیں۔

q بخاری کتاب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع الخ، ترمذی کتاب الاحکام باب ماجاء فی الغرس

اس کو کام سے پہلے ہی مزدوری دینی ہوگی یا مزدور اپنے کام کی تکمیل کردے تو کام کی تکمیل کے ساتھ اجرت ادا کرنی ہوگی۔[1]

کاموں کی مقدار

مزدور سے کتنا کام لیا جائے؟ اسلام نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غلاموں سے کوئی ایسا کام نہ لو جوان کی طاقت اور قدرت سے ماوراء ہو۔[2] یہ ایک اصول ہے جس کی روشنی میں کام کی نوعیت، مقدار، اوقات تینوں ہی کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اصول صحت کی رو سے جن کاموں کو روزانہ چھ گھنٹے کیا جا سکتا ہے، ان ملازمین کے لئے یہی اوقات کار رہوں گے اور جو کام آٹھ گھنٹے کئے جا سکتے ہیں ان کے لئے روزانہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوگی۔

عموماً بعض لوگ کم عمر بچوں یا دراز عمر بوڑھوں سے اتنا ہی کام لینا چاہتے ہیں جتنا جوان اور توانا آدمیوں سے۔ اسلامی تعلیم کے تحت یہ غلط اور ظالمانہ حرکت ہے جس پر قانون کے ذریعہ پابندی بھی عائد کی جا سکتی ہے، اسی طرح جو مستقل ملازمین ہیں، ضروری ہے کہ ان کے لئے ہفتہ میں ایک دن آرام کے لئے رکھا جائے، اپنے اقرباء اور رشتہ داوں سے ملنے کے لئے تعطیل لازمی ہو اور بیماروں کے لئے خصوصی رخصتیں ہوں، فقہ کی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔

حسن سلوک

مزدوروں کے ساتھ مالکین اور ذمہ داروں کا کیا سلوک ہونا چاہیے؟ اس سلسلہ

---

w مجمع الزوائد: ۴/۹۸، ۹۸ — e مجمع الزوائد: ۴/۹۸، ۹۸

q ابوداؤد — w خلاصۃ الفتاوی: ۴/۳ — e رحمت الامۃ: ص ۳۶

r بخاری کتاب المزارعۃ باب ما یحذر من عواقب الاشتغال الخ

t دیکھئے عمدۃ القاری: ۱۲/۱۵۶

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں "انھم اخوانکم"[3]
یعنی ان سے سلوک حاکمانہ نہیں بلکہ برادرانہ ہونا چاہئے، قرآن میں حضرت شعیب
علیہ السلام کی بحیثیت آجر یہ صفتیں بیان کی گئی ہیں:

Æ Å Ä Ã Â Á À ¿ ¾ ½ ¼

1 È Ç

D: "میں تم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا، انشاءاللہ تم مجھے صالح و نیک پاؤ
گے۔"

گویا آجر کا سلوک مزدور کے ساتھ ایسا ہو کہ اس کو تکلیف اور کسی بھی طرح کی
ذہنی، جسمانی یا عملی مشقت نہ دے اور اس کے ساتھ نیک سلوک روا رکھے۔ حضور صلی
اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہمیں اس کا عملی نمونہ یوں ملتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ
تعالیٰ عنہ آپ کے خاص خدام میں تھے اور بچپن سے جوانی تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم
کے ساتھ رہے مگر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونھ بھی کہا ہو
یا پوچھا ہو یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہیں کیا؟ [2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادموں میں
ایک یہودی لڑکا تھا، وہ بیمار پڑا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کو تشریف لے
گئے۔[3] اسی حسن سلوک کا ایک حصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مشکل کام اس کو سونپا جائے تو اس
کی انجام دہی میں بذات خود بھی مدد کرے۔[4]

منافع میں شرکت

اسلام اس بات کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے کہ مزدور کاروباری نفع میں

q ترمذی عن ابن عمر ابواب الاحکام باب ماجاء فی المزارعة
w ترمذی عن رافع بن خدیج ابواب الاحکام باب ماجاء فی المزارعة
e بخاری کتاب المزارعة باب قبیل باب المزارعة بالشطر

شریک ہوں، ''مضاربت'' کی اصل یہی ہے، مضاربت یہ ہے کہ ایک شخص کا سرمایہ ہے اور دوسرے آدمی کا عمل اور محنت۔ پھر اس سے جو نفع حاصل ہو اس کو باہم متعینہ تناسب مثلاً پچاس فی صد وغیرہ میں تقسیم کردیا جائے، یہاں دوسرے فریق کو جو کچھ نفع مل رہا ہے وہ عامل ہی کی حیثیت سے ہوگا۔ اس کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ موجود ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا پکانے والے خادم کو کھانے میں سے کم از کم ایک دو لقمہ کھلانے کی تلقین کی ہے۔[1]

حقوق کا تحفظ

مزدوروں کے حقوق کے سلسلے میں اسلام نے صرف اخلاقی ہدایات ہی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اس کو قانونی تحفظ بھی بخشا ہے اور حکومت کے لئے مداخلت کی گنجائش رکھی ہے۔ چنانچہ قاضی ابوالحسن ماوردی م۔ (۴۵۰ھ) ''محتسب'' کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر کوئی شخص مزدور و ملازم (اجیر) پر زیادتی کرے مثلاً اجرت کم دے یا کام زیادہ لے تو محتسب ایسا کرنے سے روکے اور حسب درجات دھمکائے اور اگر زیادتی اجیر کی طرف سے ہو مثلاً کام کم کرے اور اجرت زیادہ مانگے تو اس کو بھی روکے اور دھمکائے اور اگر ایک دوسرے کی بات کا انکار کریں تو فیصلے کا حق حاکم کو ہے۔'' 2

نقصانات کی ذمہ داری

سوال یہ ہے کہ مزدور یا ملازم سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو اس کا ضامن کون

---

q ملخص از: فتاوی ھندیہ: ۲۳۵/۵ وما بعدہ

w مجمع الزوائد: ۶۰/۴ باب ایدی الکسب افضل

e ان اللّٰہ یحب المؤمن المحترف وفیہ عاصم بن عبیداللّٰہ وھو ضعیف۔ مجمع الزوائد: ۶۲/۴ باب الکسب والتجارۃ الخ

ہوگا؟۔ اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل ہے، مزدوری اور ملازمت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ معاملہ کی بنیاد کام ہو، دوسرے یہ کہ معاملہ کی اساس وقت ہو، پہلے کہ مثال سلائی وغیرہ ہے کہ آپ کسی اور کو کپڑا سینے کو دیں، یہاں وہ وقت کا پابند نہیں ہے بلکہ کام کا پابند ہے کہ کپڑا سی کر دے، دوسرے کی مثال اس طرح ہے کہ کسی کو آپ مدرس مقرر کریں کہ وہ روزانہ پانچ یا چھ گھنٹے تعلیم دے، یہاں وہ وقت کا پابند اور اس میں حاضری کا مکلّف ہے چاہے طلبہ ہوں یا نہ ہوں اور پڑھانے کی نوبت آئے یا نہ آئے اسی طرح دن بھر کے لئے کسی مزدور کو مکان کی تعمیر کے لئے رکھا جائے، یہاں وہ اس بات کا پابند ہے کہ وہ دن بھر اپنا وقت دے۔

پہلے قسم کے ملازم کو ''اجیر مشترک'' اور دوسری قسم کے ملازم کو ''اجیر خاص'' کہتے ہیں، اجیر مشترک سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو وہ خود اس کا ضامن ہوگا۔ اور تاوان ادا کرے گا۔ اجیر خاص سے اس کی زیادتی اور ارادہ کے بغیر جو سامان ضائع ہو جائے وہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا[1]

بندھوا مزدور

بندھوا مزدور کی ظالمانہ رسم باجود اس تمدنی ارتقاء اور علم و روشن خیالی کے اب بھی بعض علاقوں میں موجود ہے مگر اسلام میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام اس کو انسان کا خالص نجی مسئلہ تصور کرتا ہے کہ وہ کسی کا کام کرے یا نہ کرے، نہ صرف ایک فرد دوسرے فرد کو بلکہ حکومت بھی کسی فرد اور شہری کو اس پر مجبور نہیں کر سکتی سوائے اس کے کہ کبھی ایسے خصوصی حالات پیدا ہو جائیں کہ قومی اور اجتماعی مصلحت کے تحت افراد کو کسی عمل پر مجبور کرنا پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے نکاح، خرید و فروخت وغیرہ دوسرے معاملات کی طرح

q مسلم عن ابن عباس باب تحریم تصور صورة الحیوان وتحریم اتخاذ ما فیه صور الخ

اس میں بھی طرفین کی رضا مندی اور آمادگی کو ضروری قرار دیا ہے [2] اسی طرح اسلام ہر شخص کو نقل وحرکت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آمدورفت کی آزادی حاصل ہے اور یہ اس کا خالصۃً ذاتی اور شخصی مسئلہ ہے۔ وہ جہاں اور جس شہر وعلاقہ میں جا کر مزدوری اور ملازمت کرنا چاہے کرسکتا ہے:

﴿ « ¬® ¯ ° ± ² ³ ´ µ ¶ ﴾ [1]

مزدوروں کی ذمہ داریاں

جہاد مزدور اور ملازمین کے یہ حقوق ہیں وہیں ان کی ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہیں جن کی طرف قرآن مجید نے دو مختصر لفظوں میں اشارہ کر دیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ کو جس بنیاد پر اپنا ملازم متعین کیا وہ ان کی صاحبزادی کی یہ اطلاع تھی کہ:

﴿ { | } ~ Û ¡ ¢ £ ¤ ¥ ﴾

2

D: ''ابا جان ان کو مزدور رکھ لیجئے، بہترین مزدور جسے آپ رکھیں گے وہ ہوگا جو طاقت ور اور امانت دار ہو۔''

یہاں اچھے مزدور کی دو صفات بیان کی گئی ہیں، ایک قوت و صلاحیت اور دوسرے امانت ودیانت۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلیت کے بغیر کسی کام کی ذمہ داری نہ لے، اس لئے فقہاء نے فاتر العقل طبیب "الطبيب الم کو علاج ہوئے روک دینے کا حکم دیا ہے [3]

دوسرے یہ کہ وہ اپنے کام، ذمہ داریوں اور سونپی گئی اشیاء کے معاملہ میں امانت

---

w در مختار: ۲۵۰/۵

q مسند احمد، ابن ماجہ عن عتبہ بن منذر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ

دار اور دیانت دار ہو، اگر مفوضہ کام میں وہ قصداً کوئی نقص رہنے دے یا متعینہ وقت کا اپنی ذمہ داریوں کے لئے پورا پورا استعمال نہ کرے تو یہ بات دیانت کے خلاف ہوگی، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ۔

عدل کے ساتھ وزن کرو، میں یہ بھی داخل ہے کہ ملازمین اپنے اوقات ملازمت کا پورا پورا خیال رکھیں۔[1]

امانت میں یہ بھی داخل ہے کہ رشوت نہ لے، رشوت یہ ہے کہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کی انجام دہی کا الگ سے پیسہ وصول کر لے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بڑی شدت سے منع فرمایا ہے، ارشاد ہے: رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں ہی دوزخ میں ہیں" الراشي والمرتشي كلاهما في النار[2] عرف وہی نہیں ہے جو رشوت کے نام پر لی جائے بلکہ وہ رقم بھی رشوت میں داخل ہے جو عام لوگ کسی عہدے سے متاثر ہوکر ''ہدیہ'' اور ''نذر و نیاز'' کے نام سے پیش کریں، رشوت کی یہ وہ قسم ہے جس میں اچھے خاصے دیندار لوگ بھی مبتلا ہیں، چنانچہ فرمایا جو شخص کسی کے لئے سفارش کرے، وہ اس کے لئے تحفہ بھیجے اور وہ اس کو قبول کر لے، اس نے بہت بڑا سود لیا ہے۔[3] اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عاملوں کو ہدایا و تحائف بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسی لئے فقہاء نے قاضی کے لئے فریقین مقدمہ سے ہدیہ قبول کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

ناجائز ملازمتیں

ایسی چیزوں کی ملازمت اور مزدوری جائز نہیں ہے جو معصیت اور گناہ ہو اس لئے کہ جس طرح گناہ کرنا جائز نہیں ہے اسی طرح گناہ کے لئے سبب اور ذریعہ بننا اور اس میں تعاون بھی ناجائز ہے اور جو جس درجہ کا گناہ ہو اس میں تعاون بھی اسی درجہ کا گناہ ہے۔ چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

w ابن عساكر عن عثمان رضي الله تعالىٰ عنه

”لا یجوز الاستئجار علی شیء من الغناء والنوح والمزامیر ...... ولا اجر لھم فی ذلک۔“[4]

D:”مزامیر، نوحہ زنی اور گانے بجانے وغیرہ کے کاموں پر کسی کو اجیر رکھنا درست نہیں ہے اور وہ اجرت کے حقدار نہیں ہوتے ہیں۔“

ظاہر ہے جب ان کاموں کے لئے ملازم رکھنا درست نہ ہوگا اور اگر کوئی شخص معاملہ طے ہو جانے کے بعد یہ کام کر ہی لے تو اجرت واجب نہ ہوگی تو خود کسی شخص کا ایسی ملازمت اختیار کرنا کیوں کر جائز ہوگا اور اس ملازمت کا فائدہ ہی کیا ہوگا جس پر کوئی مزدوری نہ ملے؟

اسی حکم میں سینما ہال کی ملازمت، گانے بجانے کے کام، انشورنس کی ایجنسی اور انشورنس اور بینک کی ایسی ملازمتیں ہیں جن میں سودی کاروبار لکھنا پڑے یا اس میں لین دین کرنا پڑے۔

عمر ملازمت کے درمیان سبکدوشی

ملازمت کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ عمر ملازمت اور درمیان میں سبکدوشی اور معطّلی کا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ ملازمت کے احکام کا اصل مدار فریقین کا باہمی معاہدہ ہے اگر کسی ریاست کا قانون ہو کہ اس کے یہاں ملازم اپنی عمر کے ۵۵ یا ۵۸ سال تک ملازمت پر برقرار رہے گا تو یہ گویا ملازم اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہے کہ ملازم اپنی عمر اس حد تک پہنچنے تک کارگزار رہے گا اور حکومت اس کو اجیر رکھے گی۔

e طبرانی عن کعب بن عجرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
r بیہقی عن علی رضی اللہ عنہ، طبرانی عن ابی بردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
t بخاری عن ابی ھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و مقدام رضی اللہ تعالیٰ عنہ
q طبرانی عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اب کسی معقول وجہ اور عذر کے بغیر دونوں ہی اس مدت کی تکمیل کے پابند ہوں گے، نہ حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ اسے معزول کردے اور نہ ملازم کو حق ہوگا کہ بلا وجہ اور حکومت کی رضامندی کے بغیر اس کام سے سبکدوش ہوجائے چنانچہ فقہاء مکان کے کرایہ پر لگانے کے احکام ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

"لو قال اجرتك هذه الدار سنة كل شهر بدرهم جاز بالاجماع ...... فلا يملك احدهما الفسخ قبل تمام السنة من غير عذر۔" [1]

D: ''اگر کوئی شخص یوں کہے، میں نے تم کو یہ مکان ایک سال کے لئے کراہ پر دے دیا ہے، ہر ماہ کے بدلہ ایک درہم تو بالاتفاق جائز ہے، اور فریقین میں سے کوئی ایک سال تک کی تکمیل تک بلا عذر اس معاملہ کو توڑ نہیں سکتے۔''

ہاں اگر کوئی عذر پیش آئے تو یک طرفہ اقدام کیا جا سکتا ہے مثلاً ملازم کی غیر قانونی اور مجرمانہ حرکتوں پر حکومت معزول کر سکتی ہے اور ملازم اپنی ناسازی صحت وغیرہ کی بنا پر کام چھوڑ دینا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے۔ یہ حکم جس طرح سرکاری محکموں کا ہے ایسے ہی پرائیویٹ اداروں کا ہے۔

مکان اور سواری کا اجارہ

شریعت میں جس طرح انسان سے اجرت پر کام لینا جائز ہے اسی طرح دوکان، مکان وغیرہ کو بھی اجرت پر لینا درست ہے اور خود حدیث سے ثابت ہے۔[2] شریعت کے عام اصول اور اجارہ کے عمومی قداعد کے مطابق مکان کے کرایہ پر لینے کے لئے بھی ضروری ہے کہ کرایہ کی مقدار اور مدت متعین کردی جائے، وہ اس میں کیا کرے گا، رہائش اختیار کرے گا یا کوئی دوسرا کام کرے گا اس کی تعیین ضروری نہیں، ہاں اگر مکان

کو کسی ایسے غیر معمولی کام کے لئے استعمال کریں جس سے مکان کے تحفظ کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو اس کی صراحت کر دینی ہوگی جیسے دھوبی، لوہار، آٹا پیسنے کی مشین، اس طرح کے کاموں کا ارادہ ہو تو پھر ضروری ہے کہ اس کی وضاحت کر دے۔[3]

اسی طرح سواری یہ بار برداری کے لئے سواری کا کرایہ پر لینا بھی درست ہے فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کے لئے سوار، اٹھایا جانے والا سامان جہاں سے جہاں لے جایا جارہا ہو، اس کی تعیین وغیرہ ضروری ہوگی۔[1]

فقہاء کے یہاں ان ساری وضاحتوں کا اصل مقصد ممکنہ نزاع اور اختلاف کا سدباب ہے، موجودہ زمانہ میں جو تیز رفتار سواریاں ہیں ان کے لئے جو قوانین اور قواعد ہیں، انہی کے مطابق معاملات ہوں گے، اس لئے کہ قانون کی وجہ سے اس کی حیثیت عرف کی ہوگئی ہے اور جو چیز عرف کے مطابق ہوتی ہے وہ نزاع و اختلاف کا سدباب کرتی ہے۔

زرضمانت

آج کل صاب مکان کرایہ دار سے کچھ رقم بطور زرضمانت حاصل کرتے ہیں، ایسا اس لئے کیا جاتا ہے تا کہ کرایہ دار کے ضرر سے خود کو محفوظ رکھا جا سکے، یہ ایک طرح سے کرایہ کے ساتھ قرض کی شرط ہے جو رواج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اگر کوئی شرط رواج کا درجہ اختیار کر لے تو پھر وہ جائز اور درست ہو جاتی ہے۔[2] اس لئے جائز ہے۔

پگڑی

---

w بخاری وابن ماجه عن ابی هریره رضی الله تعالٰی عنه
e ابوداؤد عن علی بن حسین رضی الله تعالٰی عنه مرسلاً
r دیلمی عن حکیم بن حزام رضی الله تعالٰی عنه

فی زمانہ شہروں اور قصبات میں کرایہ داری کے ساتھ پگڑی کا رواج بھی عام ہو گیا ہے۔ پگڑی کی کئی صورتیں ممکن ہیں:

1 مالک مکان کا کرایہ دار سے پگڑی لینا۔

2 پگڑی کے ذریعہ دوکان حاصل کرنے والے کرایہ دار کا خود مالک مکان یا نئے کرایہ دار سے پگڑی وصول کرنا۔

3 جس کرایہ دار نے پگڑی دیئے بغیر مکان حاصل کیا ہو اس کا مالک مکان یا نئے کرایہ دار سے پگڑی وصول کرنا۔

1 پہلی صورت جائز ہے، مالک مکان پگڑی لے کر گویا کرایہ ہی کا ایک حصہ بعجلت وصول کر لیتا ہے اور کرایہ کا بقیہ حصہ ماہوار بالاقساط حاصل کرتا ہے اور ایسا کرنا جائز ہے، علامہ شامی نے اپنے زمانہ میں ''خدمت'' اور ''تصدیق'' کے نام سے کرایہ دار سے یکمشت کچھ رقم وصول کرنے کا ذکر کیا ہے جس کی نوعیت قریب قریب پگڑی ہی کی ہے۔[1]

2 دوسری صورت بھی جائز ہے، دراصل حق ملکیت اور حق قبضہ دو مستقل حقوق ہیں جو مکان سے متعلق ہیں، کرایہ دار پگڑی ادا کر کے حق قبضہ خرید کر لیتا ہے اور حق ملکیت اصل مالک کا باقی رہتا ہے، اب یہ کرایہ دار اصل مالک مکان یا نئے کرایہ دار سے اسی حق قبضہ کی قیمت پگڑی کے نام پر وصول کر لیتا ہے۔ فقہاء کے یہاں ایسی نظیریں موجود ہیں کہ جن میں بعض حقوق کو قابل قیمت تسلیم کیا گیا ہے۔[2]

3 تیسری صورت جائز نہیں۔ جس کرایہ دار نے پگڑی کے بغیر مکان یا دکان حاصل کی ہے چوں کہ وہ صرف حق انتفاع کا مالک ہے حق قبضہ کا مالک نہیں اس لئے وہ خود مالک مکان یا نئے کرایہ دار سے پگڑی حاصل کرنے کا مجاز نہیں، اگر پگڑی نئے کرایہ دار سے حاصل کرتا ہے تو غصب کے حکم میں ہے اور خود مالک مکان سے لے تو

t بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی

رشوت ہے۔ اگر اس نے مکان یا دکان میں کوئی تعمیری اضافہ کیا ہے تب بھی وہ پگڑی لینے کا حقدار نہیں بلکہ صرف اس اضافہ کی مناسب قیمت وصول کرسکتا ہے، قانون ملکی گو اس کے حق اجارہ کو عام حالات میں ناقابل انفساخ قرار دیتا ہے لیکن چونکہ یہ قانون شرعی کے مغائر ہے اس لئے اس کا اعتبار نہیں۔[3]

q بخاری عن معرور رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ
w ابوداؤد عن مستورد بن شداد رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ

گیارہواں باب

آداب واخلاق

اسلام خدا کا آخری، محفوظ اور مکمل دین ہے، جو انسانیت کی ہدایت وراستی اور اس کی دنیا وعقبیٰ کی فلاح وکامیابی اور سعادت وخوش بختی کا ضامن ہے، حفاظت و ہدایت اس کی خاص شان ہے۔ اس کا دستور اساسی قرآن مجید کی شکل میں اس طرح محفوظ ہے کہ بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ جامعیت وہمہ گیری اس کا خاص وصف ہے۔ زندگی کا کونسا گوشہ ہے جس کو اس کے خورشید ہدایت نے بے نور چھوڑا ہے؟ اور جہان رنگ وبو میں پیش آنے والا کون سا قضیہ ہے جس کی اس نے عقدہ کشائی نہیں کی؟

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی تعلیمات کو وسعت دی جائے تو وہ ایک وسیع وطویل کتاب ہے، وہ عقیدہ وایمان ہے۔ عبادت وبندگی ہے، خشیت وتضرع ہے، خدا کا ذکر ہے، آخرت کی فکر ہے، قانون معاشرت ہے، اصول معاملت ہے، نظام اجتماعی ہے، ضابطۂ عدل وقضا ہے، قواعد جرم وسزا ہے، تزکیۂ اخلاق ہے، حقوق الناس کی رعایت ہے۔ عورتوں کی کرامت کا راز ہے۔ مردوں کے لئے اپنی منصب شناسی کا آئینہ ہے، بچوں کا محافظ ہے۔ جانوروں کے لئے پیام رحمت ہے، تہذیب وثقافت اور تمدن کی معراج ہے، علماء کے لئے جولا نگاہ علم وتحقیق ہے، عامیوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت وتوفیق ہے، صبح وشام کا خضر طریق اور روز وشب کا رہبر کامل ہے، سلطانی بھی ہے اور درویشی بھی، امارت بھی ہے اور محکومیت بھی، دولت وثروت بھی ہے اور صبر وقناعت بھی، خلوت بھی ہے اور جلوت بھی ـــــ کونسی صنف وجنس ہے جو

اس کی باران رحمت سے محروم ہے اور کونسا گوشۂ زندگی ہے جو اس کی ہدایت و رہبری سے تاریک ہے؟

لیکن اس کی وسعت و ہمہ گیری کو سمیٹا جائے تو محض دو لفظوں ''اسوۂ محمدی'' سے عبارت ہے، آپ کے شب و روز، شام وسحر، خلوت و جلوت عبادت و معاشرت، معاملات و تعلقات ایک آئینہ ہیں۔ اس آئینے میں جس کی زندگی جتنی مکمل محسوس ہو وہ ایمان و اسلام کی کسوٹی میں اسی قدر پورا ہے، اسی کو قرآن نے ﴿ ÄÃ Â Á ÆÅ Ç È[1] ﴾ کہا اور اسی حقیقت کو شاعر حق شناس اقبال نے یوں کہا ہے

به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں همه اوست
اگر به او نه رسیدی تمام بولهبی ست

کتاب کے اس آخری باب میں اسوۂ محمدی کی چند جھلکیاں ہیں آداب و معمولات ہیں، اخلاقی ہدایات اور نقوش شام وسحر ہیں جو اہل ایمان کی چشم عقیدت کا سرمہ اور نگاہ احترام کا سکون ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

گھر میں داخل ہونے کی اجازت

کسی کے گھر میں داخل ہوتے وقت واجب ہے کہ پہلے اجازت لی جائے، اسی کو حدیث میں ''استیذان'' کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اس سلسلہ میں مفصل حکم موجود ہے:

''اے اہل ایمان! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اہل خانہ کو سلام کئے اور اجازت لئے بغیر نہ داخل ہو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ امید کہ تم اس سے نصیحت حاصل کرو گے، اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تب

---

e بخاری عن عائشہ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہا

بھی جب تک اجازت نہ مل جائے داخل نہ ہو اور اگر واپس ہو جانے کو کہا جائے تو واپس ہو جاؤ کہ یہی تمہارے لئے پا کیزہ ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے —— ہاں ایسے مکان جو رہائشی نہ ہوں اور وہاں تمہارے سامان رکھے ہوں، میں بلا اجازت داخل ہو جانے میں بھی مضائقہ نہیں (تاہم یاد رکھو کہ) اللہ ان باتوں سے بھی واقف ہے جن کا تم اظہار کرتے ہو اور ان باتوں سے بھی جن کو نہاں خانۂ دل میں) چھپا رکھے ہو۔'' 1

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جب بھی کسی کے گھر میں داخل ہوا جائے تو اجازت چاہی جائے اور اجازت چاہنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سلام کرے پھر داخلہ کی اجازت چاہے۔ آیت میں گو کہ پہلے ''استیناس'' یعنی اجازت چاہنے اور پھر سلام کا ذکر ہے مگر عربی زبان میں یہ عام بات ہے کہ کبھی کبھی عملی ترتیب کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی الفاظ کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ احادیث میں استیذان کا جو طریقہ مروی ہے اس میں پہلے سلام کا ذکر ہے —— اس استیذان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے جا کر سلام کرے پھر اپنا نام لے کے اندر آنے کی اجازت چاہے، چنانچہ آپ نے ایک صحابی کو اسی طرح اجازت لینے کا طریقہ ارشاد فرمایا۔2

حضرت ابو موسیٰ اشعری حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے تو فرمایا **یستأذن ابو موسیٰ** (ابو موسیٰ اجازت کا طالب ہے)۔

اجازت لیتے وقت نام کی وضاحت کر دینی چاہئے تا کہ صاحب مکان کو اشتباہ نہ ہو۔ حضرت جابر بن عبداللہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت چاہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کون صاحب ہیں؟ انہوں نے جواب دیا'' أنا (میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انا انا کہنے سے کیا

q السنن الکبری للبیهقی

حاصل؟ اس سے کوئی پہچانا نہیں جاتا۔[1]

اجازت لینے کی صورتیں

استیذان کا اصل مقصد اجازت چاہنا، اپنی آمد کی اطلاع دینا اور دوسروں کی آزادی میں خلل انداز نہ ہونا ہے، یہ مقصد جس طریقہ سے بھی حاصل ہو جائے استیذان کے لئے کافی ہوگا، مثلاً ''بل'' بجا کر اپنا نام بتا دینا دروازہ پر دستک دینا، شناختی کارڈ بھیج دینا۔ اس لئے کہ یہ ساری چیزیں اس مقصد کی تکمیل کر دیتی ہیں۔ البتہ دستک کی آواز اتنی تیز نہ ہو کہ لوگ ڈر جائیں، چنانچہ تفسیر قرطبی میں نقل کیا ہے کہ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر ناخنوں سے دستک دیتے تھے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر صاحب مکان ملاقات سے معذرت کر دے تو کچھ ناگواری محسوس کئے بغیر واپس ہو جانا چاہئے، اسی طرح تین بار سلام کرنے اور اجازت چاہنے کے باوجود اگر جواب نہ آئے تو واپس ہو جانا چاہئے جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے اور اس کی تائید حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی فرمائی ہے۔[2] البتہ یہ اور بات ہے کہ اسلامی اخلاق کا تقاضا ہے کہ بلا عذر ملاقاتیوں سے معذرت نہ کی جائے۔

بعض خصوصی اوقات کے علاوہ جیسے، صبح، دوپہر، شب والدین کے پاس بلا اجازت بھی جا سکتے ہیں، حضرت علی کی روایت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ اور داماد تھے کہ میں جب رات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور اجازت کھنکار دیا کرتے۔[3]

---

w بخاری عن انس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ
e بخاری عن ابی ھریرہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ
r ابن ماجہ، بیھقی

پردہ کی رعایت

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ اس طرح نہ کھڑا ہو کہ اہل خانہ کی بے ستری ہو جائے بلکہ دائیں یا بائیں جانب کھڑا ہو، حضرت عبداللہ بن بسر سے مروی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے دروازے پر آتے تو سامنے کھڑے ہونے کی بجائے دائیں یا بائیں کھڑے ہوجاتے اور فرماتے السلام علیکم، السلام علیکم[1]

اطلاع اپنے گھر میں بھی مستحب ہے

اس آیت میں دوسروں کے گھر میں داخل ہونے کے لئے استیذان کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود اپنے گھر میں جہاں اس کی بیوی ہو اجازت چاہنا ضروری نہیں مگر مستحب طریقہ یہ ہے کہ وہاں بھی بلا اطلاع نہ جائے بلکہ کھنکار کر یا قبل از وقت اس کی اطلاع کر کے جائے۔

پبلک مقامات کے احکام

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ استیذان ان گھروں کے لئے ہے جو رہائش گاہ کی حیثیت رکھتے ہوں، اس لئے کہ ''بیت'' عموماً ایسے ہی مکان کو کہتے ہیں، وہ جگہیں جو کسی کی رہائش گاہ نہ ہوں بلکہ عام طور پر وہاں لوگوں کی آمد و رفت ہوا کرے جیسے دفاتر، مدرسے، مسجدیں، یہاں آمد و رفت کی جا سکتی ہے سوائے اس کے کہ عام لوگوں کے آنے پر امتناع ہو۔

اسی طرح آیت میں ''بیوت غیر مسکونۃ'' میں آنے کی اجازت دی گئی اس سے دراصل وہ جگہیں مراد ہیں جو کسی خاص فرد کی ملکیت نہ ہو بلکہ عام لوگوں کے استعمال کی ہوں، مسافر خانے، ویٹنگ روم، ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ یہاں ہر شخص کو جانے کی اجازت ہوگی۔

---

[1] الفتاوی الهندیه: ۵۰۹/۳

ٹیلیفون کا حکم

اسی طرح استیذان کی فہرست میں بعض بزرگوں نے ٹیلیفون کو بھی رکھا ہے کہ ٹیلیفون کے ذریعہ بھی گویا ملاقات کی جاتی ہے اس لئے اگر طویل گفتگو کرنی ہو تو پہلے اجازت لے لینی چاہئے۔

افسوس کہ استیذان جو ایک امر واجب ہے اور قرآن وحدیث میں اس کی سخت تاکید آئی ہے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص بلا اجازت تمہارے گھر میں جھانکے اور تو اس پر کنکری پھینکے یہاں تک کہ اس کی آنکھ جاتی رہے تو تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔[1] ہمارے معاشرہ میں یہ مسئلہ یکسر غیر اہم ہو کر رہ گیا ہے۔

سلام

اسلام میں سلام کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، قرآن مجید نے اس کو پیغمبرانہ عمل بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کو سلام کیا[2] اور سلام کیا جائے تو انہیں الفاظ میں یا اس سے بہتر الفاظ میں جواب دیں۔[3] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد سب سے پہلے ان جو کو حکم دیا گیا وہ یہی تھا کہ فرشتوں کو سلام کریں اور ان کا جواب سنیں، یہی سلام و جواب بنو آدم کے لئے ہوگا۔[4]

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اسلام کا سب سے بہتر عمل کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ کہ کھانا کھلاؤ اور ہر شناسا اور ناشناسا کو سلام

w موطا امام مالک عن یحییٰ بن یحییٰ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ

e ردالمحتار: ۳۸۰/۳

q القصص، آیت: ۲۷

w بخاری و شمائل ترمذی عن انس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ

کرو[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق العباد سے متعلق جن سات باتوں کا حکم فرمایا ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سلام کو رواج دو[2] اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کو باہم محبت اور میل جول بڑھنے کا باعث قرار دیا[3] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بسا اوقات صرف اس لئے بازار جایا کرتے تھے کہ راہ چلنے والوں اور ملاقاتیوں کو سلام کریں[4]

سلام کے الفاظ

سلام کے منقول الفاظ اس قدر ہیں ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ'' جواب میں بھی ''وٗ'' کے اضافہ کے ساتھ اتنا ہی منقول ہے ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ'' چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اسی حد تک سلام کا جواب دیا ہے[5] ـــــ امام نووی نے لکھا ہے کہ سلام میں چاہے ایک ہی شخص مخاطب کیوں نہ ہو، مگر ''کُــمْ'' یعنی جمع کا صیغہ استعمال کرنا چاہئے اور جواب دینے والے کو ''وٗ'' کا اضافہ کرنا چاہئے، یعنی ''وعلیکم۔'' [6]

بہتر طریقہ ہے کہ سلام کرتے ہوئے ''برکاتہٗ'' تک پورا فقرہ ادا کیا جائے، چنانچہ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا ''السلام علیکم''

e بخاری پ ۵ کتاب الصلوٰۃ
r بخاری، مسلم۔ حدیث گزر چکی ہے۔
q بخاری، ابوداؤد، ترمذی
w الاحکام السلطانیہ للماوردی مترجم: ص۳۹۹ باب ۲۰
q فتاوی عالمگیری: ۵۵۵/۳
w وامار کنھا فالایجاب والقبول، الفتاوی الھندیہ: ۵۰۴/۳ کتاب الاجارۃ
q النساء، آیت: ۱۰۰ w القصص، آیت: ۸۶ e الاشباہ والنظائر لابن نجیم
q معارف القرآن مصنفہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

پھر بیٹھ گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کے لئے دس نیکیاں دوسرے آنے والے نے اس کے ساتھ ''ورحمۃ اللہ'' کا اضافہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیس نیکیوں کا اور ''وبرکاتہ'' تک کہنے والوں کو تیس نیکیوں کا مستحق قرار دیا۔[1]

سلام کے بعض آداب

سلام ایسی آواز میں کرنا چاہئے کہ سونے والے جاگ نہ اٹھیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا۔[2] ملاقات کے وقت سلام کرنا چاہئے پھر اگر تھوڑا فصل بھی ہو یہاں تک کہ ایک دیوار اور کمرہ کا فصل آجائے تو بھی دوبارہ سلام کرنا چاہئے۔[3] کسی مجلس میں جائے تو اس وقت بھی سلام کرے اور واپس ہوتے وقت بھی بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ واپسی کا سلام ابتدائی سلام سے زیادہ افضل ہے۔[4]

سلام کے آداب میں یہ ہے کہ سوار پیادہ چلنے والے پر، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے شخص کو اور تھوڑے لوگ زیادہ افراد کے مجمع کو سلام کریں۔[5] اسی طرح گزرنے والے بیٹھنے والوں اور چھوٹے بڑوں کو سلام کرنے میں سبقت کریں۔[6] لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ وہ سلام میں پہل نہ کریں تو دوسرے سلام کریں ہی نہیں بلکہ ہر شخص کو پہل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لوگوں میں اللہ سے سب سے قریب وہ شخص ہے جو سلام میں پہل کرے۔[1] بالخصوص بچوں کو تو ازراہ

---

w طبرانی عن ابن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ

e ابوداؤد عن ابی امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

r عالمگیری: ۴/۴۴۹ باب اجارۃ المعاصی

q فتاوی عالمگیری: ۳/۵۰۸

w دیکھئے مجمع الزوائد: ۴/۱۱۱ باب فی اجارۃ المکان المبارک

e البحر الرائق: ۸/۹،۱۰

q البحر الرائق: w ۱۲ ھندیہ: ۴/۴۴۲، تفصیل کیلئے جدید فقہی مسائل حصہ دوم دیکھی جائے۔

q ردالمحتار: w ۴/۱۷ ردالمحتار: ۴/۱۵ وحموی علی الاشباہ "القاعدۃ السادسۃ"

تربیت پہلے سلام کرنے کی تاکید کرنی چاہئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جب بھی بچوں سے گزر ہوتا ان کو سلام فرماتے[2]

ایسا شخص جو علانیہ فسق و فجور میں مبتلا ہو، حوصلہ شکنی اور اصلاح کی غرض سے ان کو سلام نہیں کرنا چاہئے۔ اسی طرح جو کسی شرعی وجہ مثلاً نماز، تلاوت، خطبہ و اذان، احکام و مسائل کی تکرار وغیرہ یا کسی طبعی وجہ سے مثلاً کھانے کی وجہ سے سلام کا جواب دینے سے عاجز ہو تو ان حالات میں سلام نہ کیا جائے اور کوئی شخص سلام کرے تو اس کا جواب دینا ضروری نہیں[3] البتہ خیال رہے کہ کسی فاسق و فاجر کو سلام نہ کرنے کی وجہ سے تعلقات میں مزید تلخی اور امید اصلاح کی کم یا منقطع ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں سلسلۂ سلام باقی رکھنا چاہئے کہ اصل مقصود مفاد دینی کی رعایت ہے۔

جماعت میں سے کسی ایک شخص کو سلام کرنا اور جواب دے دینا کافی ہے۔ ضروری نہیں کہ سبھی الگ الگ سلام کریں اور جواب دیں[4] ضرورتاً اشارہ سے سلام کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اس طرح کہ ساتھ ساتھ سلام کے الفاظ بھی کہے جائیں[5] مگر عیسائیوں، یہودیوں کی طرح اشارہ سلام کے لئے استعمال کرنا درست نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے[6] اسی میں ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑنا بھی داخل ہے۔

---

e تفصیل کیلئے دیکھئے قاموس الفقہ، دوم، مادہ "بدل خلو"، جدید فقہی مسائل، دوم: ص ۲۸۱، ۳۰۵

q الاحزاب، آیت: ۲۱

q نور، آیت: ۲۷، ۲۹ w ابوداؤد، باب فی الاستیذان

q ترمذی، باب ماجاء فی التسلیم قبل الاستیذان

w ابوداؤد، باب کم مرۃ یسلم الرجل الخ

e نسائی شریف عن ابن نجی، باب التنحنح فی الصلوٰۃ

q سنن ابوداؤد، باب کم مرۃ یسلم الرجل فی الاستیذان

خیر مقدمی کلمات

ملاقات کے موقعہ پر سلام کے علاوہ اگر کوئی اور خیر مقدمی کلمہ کہا جائے تو اس میں قباحت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض مواقع پر اس طرح کا کلمہ کہنا ثابت ہے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر حضرت ام ہانی اور حضرت عکرمہ کی آمد پر مرحبا کہتے ہوئے استقبال فرمایا ہے[1] ہاں صبح بخر، شب بخیر، گڈ مورننگ وغیرہ کے الفاظ مسنون طریقہ کے خلاف ہیں۔ ایام جاہلیت میں لوگ کہا کرتے تھے "انعم اللّٰہ بک عیناً" (اللہ تم کو اپنی نعمت سے نوازے) اور "انعم صباحاً" (صبح بخیر) اسلام کی آمد کے بعد اس سے منع کر دیا گیا[2]

مصافحہ

مصافحہ ہاتھ سے ہاتھ ملانے کا نام ہے[3] مصافحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ملاقات کی تکمیل قرار دیا ہے[4] خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک بھی مصافحہ کا تھا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میری جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرور ہی مصافحہ فرمایا[5] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصافحہ کی ابتدا سب سے پہلے اہل یمن نے کی ہے[6] صحابہ کا بھی معمول باہم مصافحہ کرنے کا تھا[1] اور کیوں نہ ہوتا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ دو مسلمان جب بھی باہم ملیں اور

q ترمذی، باب ماجاء فی الاستیذان

w الذاریٰت، آیت: ۲۵

e النساء، آیت: ۸۶

r بخاری و مسلم: عن ابی ھریرہ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ، باب بدء السلام: ۹۱۹/۲

q بخاری و مسلم: ۹۱۲/۲ بخاری ومسلم عن عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص

w بخاری، مسلم عن البراء بن عازب

مصافحہ کریں تو الگ ہونے سے پہلے ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔[2] ایک روایت میں یوں بھی ارشاد فرمایا گیا کہ مصافحہ باہمی کینہ و کدورت کو دور کرتا ہے۔[3]

مصافحہ کا وقت آغاز ملاقات ہے، اس طور کہ پہلے سلام کیا جائے پھر مصافحہ۔[4] اس موقعہ پر ایک دوسرے کو مغفرت کی دعا دینے کی بھی تلقین فرمائی ہے۔[5] "یغفر اللّٰہ لنا ولکم" کہنا اسی فرمان کی تکمیل ہے۔

بعض نمازوں کے بعد جو خاص طور پر مصافحہ کا رواج ہو گیا ہے یہ بدعت اور مکروہ ہے، مشہور محدث اور فقیہ ملا علی قاری حنفی نے اس پر بڑی بصیرت افروز گفتگو فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

> "فجر و عصر کے وقت لوگوں کے مصافحہ کا عمل مستحب و مشروع طریقے کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے کہ مصافحہ کا عمل آغاز ملاقات ہے، ان نمازوں میں لوگ بغیر مصافحہ کے باہم ملاقات کرتے ہیں، باہم گفتگو کرتے ہیں، علمی مذاکرہ کرتے ہیں اور ان سب چیزوں میں خاصا وقت گزارتے ہیں، پھر جب نماز پڑھ لیتے ہیں تو مصافحہ کرنے لگتے ہیں، اسی لئے ہمارے بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ اس وقت مصافحہ مکروہ ہے اور حقیقت یہ ہے وہ قبیح بدعتوں میں سے ہے، ہاں اگر کوئی مسجد میں آئے، لوگ مصروف نماز ہوں یا نماز شروع ہی کیا چاہتے ہوں پھر نماز سے فراغت کے بعد آنے والا شخص پہلے ان کو سلام کرے پھر مصافحہ ——— تو یہ بلاشبہ مسنون مصافحہ ہوگا۔ تاہم اس کے باوجود اگر کوئی

e مسلم، باب من حق المسلم للمسلم رد السلام: ۲۱۳/۲، مسلم عن ابی ھریرہ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ

r مؤطا امام مالک رحمہ اللّٰہ تعالٰی عن طفیل بن ابی بن کعب

t بخاری، مسلم عن عائشہ رضی اللّٰہ تعالٰی عنھا، باب من رد السلام فقال علیک السلام وقالت عائشہ وعلیہ السلام ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ، بخاری: ۹۲۸/۲

مسلمان مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے تو ہاتھ کھینچنا نہ چاہئے کہ اس میں ایک مسلمان کو ایذاء پہنچانا ہے جو رعایت ادب سے بڑھ کر ہے۔۔۔۔۔ حاصل یہ کہ اس وقت مروجہ طریقہ پر مصافحہ کی ابتداء تو مکروہ ہے مگر بد خلقی (مجابرہ) مناسب نہیں۔" 1

مصافحہ ایک ہاتھ سے ہو یا دو ہاتھ سے؟ یہ اتنی اہم بات نہیں جتنی اہمیت کہ لوگوں نے دے رکھی ہے۔ حدیث میں زیادہ تر "ید" ہاتھ کے الفاظ آئے ہیں جو عربی قاعدہ کے لحاظ سے واحد ہونے کی وجہ سے ایک ہاتھ کو بتاتا ہے مگر زبان کا ایک محاورہ یہ بھی ہے کہ کبھی ہاتھ بول کر دونوں ہاتھ، پاؤں بول کر دونوں پاؤں اور آنکھ بول کر دونوں آنکھیں مراد لی جاتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت موجود ہے کہ میرا ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معمول مبارک دو ہاتھوں سے مصافحہ کا بھی تھا اس لئے صحیح یہی ہے کہ دونوں طرح مصافحہ کیا جا سکتا ہے، اس میں شدت نہ کرنی چاہئے۔

معانقہ

ملاقات کے موقعہ پر معانقہ یعنی گلے لگانا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ میرے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع بھیجی، میں گھر پر موجود نہ تھا، آیا تو خبر ہوئی اور حاضر خدمت ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چار پائی پر تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے چمٹا لیا[2] فتح خیبر کے موقع پر جب زید بن حارثہ مدینہ پہنچے تو آپ مارے خوشی کے بے تابانہ اٹھے اور ان کو گلے لگایا اور چوما[1] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک قابل لحاظ مدت کے بعد ملاقات ہو تو اظہار محبت کے لئے معانقہ بھی کیا جا سکتا ہے، معانقہ محض گلے لگانے کا نام ہے۔ ہمارے یہاں

y ریاض الصالحین باب کیفیۃ السلام

q ابوداؤد، ترمذی، عن عمران بن حصین، باب ما ذکر فی فضل السلام

تین بار جو معانقہ کا رواج ہے وہ صحیح نہیں، اسی طرح نماز عیدین کے بعد جو معانقہ کا رواج سا ہو گیا ہے وہ اسی طرح اور انہی وجوہ کی بنا پر ـــــ جو فجر و عصر کے بعد مصافحہ کے سلسلہ میں ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے ـــــ مکروہ ہے، ہاں اگر کوئی معانقہ کے لئے آگے بڑھے تو تشدد بھی نہ برتا جائے کہ جیسا کہ مذکور ہوا یہ ایک مسلمان کے لئے ایذا اور ہتک کا باعث ہوگا۔

احتراماً کھڑا ہونا

شخصیات کے احترام میں بہت مبالغہ اسلام میں پسند نہیں، اسی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعظیماً کھڑے ہونے کو پسند نہیں فرمایا، ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور صحابہ کھڑے ہو گئے تو فرمایا کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے، اس طرح کھڑے نہ ہوا کرو[2] لیکن اس کو ایک مستقل رسم اور رواج بنائے بغیر کبھی جوش محبت میں کھڑا ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا راوی ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب تشریف لاتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے کھڑے ہوتے یہی عمل حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا[3] غزوۂ بنو قریظہ کے موقع پر جب حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحیثیت حکم تشریف لائے تو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے کھڑے ہونے کو کہا ''قوموا الی سیدکم''[4] لیکن کسی شخص کے اندر اس خواہش کا پیدا ہو جانا کہ لوگ اس کے لئے کھڑے ہوں اور لوگ کھڑے نہ ہوں تو اس کا برا ماننا، سخت مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا شخص

ترمذی: ۹۸/۲ باب کیف السلام ابوداؤد: ۲/۲۰۶

w مسلم عن مقداد

e ابوداؤد عن ابی ھریرہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ باب فی الرجل یفارق ثم یلقاہ یسلم علیہ: ۲/۲۰۶

جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنا رہا ہے۔[1] افسوس کہ بعض خانقاہوں اور مشائخ نے اس کو اپنے آداب میں داخل کرلیا ہے۔

چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی؟

بوسہ

بعض اوقات انسان ملاقات کے وقت پاکیزہ جذبات کے ساتھ جوش محبت میں بوسہ لے لیتا ہے، اس طرح کا عمل بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے، فقہاء نے احادیث اور شریعت کے اصول کو سامنے رکھ کر اس سلسلہ میں احکام مقرر کئے ہیں:

بڑوں کے بوسہ کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ غیر محرم مرد وعورت کے لئے تو ایک دوسرے کا بوسہ ناجائز ہے ہی، ایک مرد کے لئے دوسرے مرد کا یا ایک عورت کے لئے دوسری عورت کا بوسہ لینا عام حالات میں درست نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک دوست اپنے دوست یا بھائی سے ملے تو کیا اس کے لئے جھکے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، پھر پوچھا گیا کہ کیا اس سے چمٹے اور بوسہ لے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا، پھر ہاتھ پکڑنے اور مصافحہ کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی۔[2]

اسی لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عام حالات میں اس کو مکروہ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ علامہ کاسانی فرماتے ہیں: معانقہ اور بوسہ کے سلسلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کے یہاں ایک شخص کے لئے دوسرے شخص کے چہرہ یا ہاتھ یا کسی حصۂ جسم کا بوسہ لینا مکروہ ہے اور امام ابو یوسف کے نزدیک کچھ مضائقہ

[1] ردالمحتار: ۲۴۷/۵

[2] بخاری عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ باب یسلم الراکب علی الماشی:

نہیں[1]

البتہ جہاں شہوت کا کوئی اندیشہ نہ ہو وہاں گنجائش ہے، چنانچہ ایک دفعہ باہر سے حضرت زید بن حارثہ کی مدینہ واپسی پر فرط مسرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معانقہ کیا اور بوسہ دیا، اسی طرح وفد عبدالقیس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو شرکاء وفد نے آپ کے دست و پائے مبارک کا بوسہ لیا[2]

اسی طرح محرم بالغہ رشتہ داروں کا بوسہ لینا بھی اس وقت جائز نہ ہوگا جب شہوت کا اندیشہ یا احتمال ہو، ہاں جہاں اس کا کوئی احتمال نہ ہو وہاں اجازت ہوگی، چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بوسہ لیا کرتی تھیں[3] ایک دفعہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بخار تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ باہر سے آئے، آکر مزاج پرسی کی اور صاحبزادی کے رخساروں کا بوسہ لیا[4]

عیادت

صحت اور بیماری انسان کا ازلی ساتھی ہے، بیماری انسان کو خدا کی بے پناہ قدرت بھی یاد دلاتی ہے اور صحت جیسی عظیم نعمت الٰہی پر شکر کے جذبات اور امتنان کے احساسات بھی پیدا کرتی ہے، بعض اوقات بیماریاں بھی صحت کی ضمانت ہوتی ہیں اور اس میں آخرت کا نفع بھی ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ مؤمن کو ایک کانٹا بھی چبھے اور وہ اسے صبر و رضا کے ساتھ برداشت کرے تو اللہ اس کا ایک درجہ اونچا کر دیتے ہیں[1] صحت و شفا کی کلید چوں کہ خدا نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے اس لئے

۹۲۱/۲

y بخاری عن ابی هریره رضی اللّٰه عنه باب یسلم الراکب علی الماشی:

۹۲۱/۲

q مسند احمد، ترمذی، عن ابی حاله، باب فی فضل من بدأ بالسلام ابوداؤد:

اس سے توحید کا استحضار ہوتا ہے۔"واذا مرضت فهو يشفين[2]"

بیمار شخص کو اسلام رحم اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور لطف وکرم کا حقدار قرار دیتا ہے۔قرآن مجید نے بیماری کو بعض فرائض و واجبات کی معافی کے لئے ایک عذر کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔[3] اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کو بڑے ثواب و اجر کا باعث فرمایا ہے اور اس کی تلقین کی ہے، ایک روایت میں ہے کہ کوئی شخص بیمار کی عیادت کرے تو خدا کو اس کے پاس پائے گا۔[4] بیمار کی عیادت اور مزاج پرسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق قرار دیا۔[5] ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان کی عیادت کرتا ہے تو گویا وہ جنت کے نخلستان میں ہوتا ہے۔[6]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کے آداب بھی بتائے، دایاں ہاتھ مریض پر رکھے اور یوں دعا پڑھے:

"اللهم رب الناس اذهب الباس اشف انت الشافي لا شافي الا انت، شفاء لا يغادر سقما۔[۷]"

D:''اے اللہ! آپ تمام لوگوں کے پالنہار ہیں، مرض دور فرما دیجئے اور شفا دیجئے کہ آپ ہی شافی ہیں اور ایسی شفا نصیب فرمائیے کہ اس کے بعد مرض کا حملہ نہ ہو۔''

۲/۲۰۶

w مسلم عن انس بن مالک، باب التسليم على الصبيان بخاري: ۲/۹۲۳

e درمختار: ۵/۲۶۲

r ابوداؤد عن علي بن ابي طالب باب ماجاء في رد الواحد عن الجماعة: ۲/۲۰۸

t ترمذي عن صهيب، باب ماجاء في الاشارة في الصلوٰة

y ترمذي عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده، باب ماجاء في كراهية اشارة

یہ دعا بھی دیتے:

"لا بأس، طهور ان شاء الله۔"

D: ''بیماری سے گھبراؤ نہیں، انشاء اللہ یہ تمہارے لئے خطاؤں کا کفارہ اور پاکی کا ذریعہ ہوگی۔''

ایک صاحب کو آپ نے درد کی حالت میں درد کے مقام پر ہاتھ رکھ کر تین بار بسم اللہ اور سات بار:

"اعوذ بعزة اللّه وقدرته من شرما اجد و احاذر" کی تلقین کی۔[2]

D: ''میں اللہ تعالیٰ کی عزت اور اس کی قدرت کی پناہ چاہتا ہوں ان تمام چیزوں کے شر سے جو موجود ہیں اور جن کا اندیشہ ہے۔''

مسلمان فاسق ہو تب بھی اس کی عیادت کی جائے بلکہ چونکہ یہ ایک انسانی ہمدردی کا مسئلہ ہے اس لئے کافر کی عیادت بھی کی جانی چاہئے اور اس سے اسلام کے اخلاق حسنہ کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اسلام کی طرف ایک خاموش دعوت ہے۔[3]

اظہارِ غم کا طریقہ

کسی شخص کی موت پر غم و افسوس فطری بات ہے، شریعت نے ایک طرف اظہار غم کی اجازت بھی دی ہے اور دوسری طرف خدا کی تقدیر اور فیصلہ پر راضی رہنے کو واجب قرار دیا ہے، بے تکلف رونا آ جائے اور بے ساختہ آنکھیں اشکبار ہو جائیں تو مضائقہ نہیں کہ خود پیغمبر اسلام سے اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وصال پر اشکبار ہونا منقول ہے۔[1] لیکن رونے میں اس درجہ مبالغہ کہ نوحہ کے درجہ

الید فی السلام: ۹۹/۲

q ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی مرحبا

w ابوداؤد عن عمران بن حصین: ۲/۹۰۷

کو پہنچ جائے، انسان خدا سے شکوہ سنج ہو جائے، کپڑے پھاڑنے لگے، رخسار وغیرہ پیٹنے لگے متوفی کے اوصاف وکمالات میں مبالغہ کیا جائے، وغیرہ ممنوع ہے[2]

اسلام سے پہلے لوگ مدتوں متوفی کی موت پر قائم کناں رہتے تھے، اسلام نے جہاں سوگ میں اعتدال کا حکم دیا وہیں اس کے لئے مدت کی تحدید بھی کر دی ہے، فرمایا کہ سوائے بیوی کے جو اپنے شوہر کی وفات پر چار ماہ دس دنوں سوگ کرتی ہے کسی کے لئے کسی کی موت پر تین دنوں سے زیادہ سوگواری کی اجازت نہیں[3] غزوۂ موتہ (۹ھ) میں حضرت جعفرؓ شہید ہو گئے، مدینہ اس کی خبر پہنچی تو حضرت جعفرؓ کے یہاں اس کا اثر پڑنا فطری تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ان کے خاندان کے لئے کھانا بھیجنے کی ہدایت فرمائی کہ اس غم نے ان کے دل ودماغ کو مشغول کر رکھا ہے۔[4] چنانچہ اہل علم نے میت کے گھر کھانا بھیجنے کو مستحب قرار دیا ہے[5]

حالت عدت میں عورت کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ تزیین وآرائش سے گریز کرے لیکن دوسرے اقرباء اپنے کسی عزیز کی موت پر اظہار غم وافسوس کا یہ طریقہ بھی اختیار نہ کریں۔

تعزیت

غم کے موقعہ پر تسلی وتسکین اور پرسہ ودلدہی کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے بے قراری کو قدرے قرار اور بے سکونی کو سکون میسر ہوتا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جو شخص کسی مصیبت زدہ کی تعزیت کرے، اس کو بھی اتنا ہی اجر ہے جتنا خود اس

---

e "حتی الصاق صفحة الکف بالکف۔" مرقاة: ۵۲۸/۴

r ترمذی عن ابی امامه، باب ماجاء فی المصافحة

t ابوداؤد عن ابی ذر باب فی المعانقه

y ابوداؤد عن انس بن مالک، باب فی المصافحه: ۲۰۸/۲

q ترمذی عن انس بن مالک، باب ماجاء فی المصافحة

مصیبت زدہ شخص کو صبر و شکیب پر۔[1] ایک روایت میں ہے کہ جس نے بچہ کی موت پر ماں کی تعزیت کی اس کو جنت میں چادر عطا کی جائے گی۔[2]

تعزیت کے موقعہ پر ان الفاظ میں دعا دی جانی چاہئے:

"اعظم اللّٰہ اجرک واحسن عزاءک رحم میتک واکثر عددک[3]"

D: "اللہ تعالیٰ بہتر اجر عطا فرمائے اور بہتر طور پر غم کو دور کر دے، میت پر رحم فرمائے اور تمہاری تعداد میں اضافہ کرے۔"

کسی غیر مسلم کی موت ہو جائے تو اس طرح کلمات تعزیت کہے جائیں:

"اخلف اللّٰہ علیک خیراً منہ واصلحک ورزقک ولدا مسلما۔" [4]

D: "اللہ تعالیٰ تجھ پر کسی بہتر آدمی کو اس کا جانشیں بنائے تیری اصلاح کرے اور تجھے مسلمان اولاد عطا فرمائے۔"

چھینک اور جمائی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھینک اور جمائی کے آداب بھی بتائے، چھینک کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہتر سمجھا ہے کہ یہ چستی اور نشاط کی علامت ہے، جمائی کو ناپسند کیا ہے کہ اس سے سستی و کاہلی کا اظہار ہوتا ہے —— چھینک آئے تو چہرہ پر ہاتھ یا کپڑا رکھے اور آواز ہلکی رکھنے کی سعی کرے۔[1] جس شخص کو چھینک آئے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" کہے۔[2] بعض روایات میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ" کے الفاظ آئے ہیں۔[3]

---

w ترمذی، نیز ابوداؤد عن براء بن عازب، باب فی المصافحہ

e مشکوٰۃ عن عطاء مرسلاً ج۲ باب فی المصافحۃ والمعانقۃ، الفصل الثالث

r مرقاۃ: ۴/۵۷۵

t ابوداؤد، باب فی المصافحہ

ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "اَلحمدُ للّٰہ ربّ العالمین" ارشاد فرمایا۔[4] سننے والا جواب میں "یرحمک اللّٰہ" اللہ تجھ پر رحم کرے) کہے۔[5]

عام طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی ہی تلقین فرمائی ہے۔ بعض روایات میں اس کے جواب میں پھر چھینکنے والے کو بھی بعض فقرے کہنے کی ہدایت دی ہے۔ حضرت ابوایوب سے مروی ہے کہ "یھدیکم اللّٰہ ویصلح بالکم" (اللہ تجھے ہدایت دے اور تمہارے حالات درست کرے) کہے اور سالم بن عبید سے روایت ہے کہ "یغفر اللّٰہ لنا ولکم" (اللہ ہم کو اور تم کو معاف فرمائے) کے الفاظ کہے جائیں۔[6]

—— الفاظ وتعبیرات کا یہ اختلاف کوئی تضاد کے قبیل کی بات نہیں ہے، منشاء نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہے کہ ان الفاظ ماثورہ میں سے کسی طرح بھی کلمہ تحمید کہا جائے اور جواب دیا جائے، کافی ہے لیکن ان کے بجائے اپنی طرف سے کسی مضمون کا اضافہ نہ کرے، ایک صاحب کو چھینک آئی، انہوں نے جواب میں کہا "السلام علیک" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ایسی تعبیر میں جواب دیا جو ناپسندیدگی کا مظہر تھا، فرمایا: "علیک وعلی امک" حضرت ابن عمر کے سامنے ایک چھینکنے والے نے "الحمد للّٰہ" کے ساتھ "والسلام علی رسول اللّٰہ" کا اضافہ کر دیا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ درود ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیجتے ہیں مگر اس موقع پر ہمیں اس کی تعلیم نہیں دی گئی۔[1]

---

q مرقاۃ: ۵۲۵/۴، باب المصافحة والمعانقة

w ابوداؤد، باب فی المعانقة

q ترمذی باب ماجاء فی المعانقة والقُبلة

w ابوداؤد عن ابی امامه، باب الرجل یقوم للرجل یعظمه بذلک

e ابوداؤد، باب فی القیام

r ابوداؤد، باب فی القیام

q ابوداؤد، باب الرجل یقول للرجل

تین بار تک چھینک کا جواب دیا جائے اس کے بعد دینا مستحب نہیں [2] بعض اوقات ایک چھینک کا جواب دینے کے بعد دوسری اور تیسری بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا اور فرمایا کہ اس شخص کو زکام ہے [3]

چھینک کا جواب بعض اہل علم کے نزدیک فرض عین اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سنت ہے۔ لیکن عام فقہاء فرض کفایہ کہتے ہیں۔ مجلس سے ایک شخص نے جواب دیا تو سب کی طرف سے کفایت ہو جائے گی [4] مناسب ہے کہ چھینکنے والا ''الحمد للہ'' ایسی آواز میں کہے کہ دوسرے لوگ سن سکیں [5] خود چھینکنے والے کا الحمد للہ کہنا بالاتفاق واجب نہیں، مستحب ہے [6] یا سلام کی طرح مسنون، اگر کسی غیر مسلم کو چھینک آئے اور وہ ''الحمد للہ'' کہے تو جواب میں ''یھدیکم اللّٰہ ویصلح بالکم'' کو ہدایت دے اور تمہارے حالات بہتر کرے) کہنا چاہئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض یہود کو اسی طرح جواب دینا ثابت ہے [7] جمائی آئے تو ممکن حد تک روکنے کی سعی کرے [8] اور منہ پر ہاتھ رکھ لے [9] کہ جمائی کی حالت میں منہ بد ہیئت نظر آتا ہے۔

گفتار

w ترمذی، عن انس، باب ما جاء فی المعانقة والقبلة: ۱۰۲/۲
q بدائع الصنائع: ۱۲/۵ کتاب الاستحسان
w ابوداؤد، باب قبلة الرجل: ۷۰۹/۲
e بدائع: ۱۲/۵
r ابوداؤد عن البراء، باب قبلة الخد: ۷۰۹/۲
q ترمذی، کتاب الجنائز، باب فی ثواب المریض
w شعراء، آیت: ۸۰
e نور، آیت: ۶، توبہ، آیت: ۹

گفتگو میں سب سے زیادہ جس بات کی تاکید کی گئی ہے وہ ہے سچائی اور راست گوئی اور سب سے زیادہ جس چیز کی مذمت کی گئی ہے وہ ہے جھوٹ اور کذب بیانی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچائی کا انجام جنت اور جھوٹ کا دوزخ کو قرار دیا ہے۔[1] قرآن مجید نے سیدھی سچی بات کو اعمال کی درستی اور گناہوں کی معافی کی ضمانت قرار دیا ہے۔[2] اس لئے کہ انسان جو کچھ بولتا ہے دنیا میں تو وہ رنگ لاتا ہی ہے، آخرت کے لئے بھی اس کے یہ بول محفوظ ہو جاتے ہیں اور دراصل ہر وقت اس کے قول وفعل کا نگراں اس کے پاس ہی موجود رہتا ہے۔[3] اسی طرح ایسی گفتگو جو بے مقصد اور لایعنی ہو ناپسندیدہ اور مذموم ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ اس پر اس کو خدا سے مغفرت کا طلب گار ہونا چاہئے۔ روایت میں ہے کہ بہترین مسلمان ہونے کی پہچان لایعنی باتوں کا چھوڑنا ہے۔[4] اسی طرح ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی کو نجات کی ضمانت قرار دیا ہے۔[5] چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مجلس میں لایعنی کلام کی کثرت ہو جائے تو اٹھنے سے پہلے یہ دعا پڑھ لے:

"سبحانک اللھم وبحمدک اشھد ان لا الہ الا انت استغفرک واتوب الیک۔"[6]

D: "اللہ کی ذات پاک اور قابل تعریف ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ سے مغفرت کا طلب گار ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔"

---

r مسلم عن ابی ھریرہ

t ابن ماجہ عن علی باب ماجاء فی ثواب من دعا مریضا

y ترمذی باب ماجاء فی عیادۃ المریض

u ترمذی باب ماجاء فی التعوذ للمریض

q بخاری عن ابن عباس باب عیادۃ الاعراب

گفتگو کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ نرم گفتگو کی جائے اور درشت کلامی سے پرہیز کیا جائے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو جب فرعون کے پاس دعوت ایمان دینے کے لئے بھیجا گیا تو خاص طور پر نرم گوئی کی ہدایت کی گئی[1] گفتگو میں بے ضمیری، تملق وخوشامد اور اپنے نفس کی اہانت روا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص تعریف کرے تو اس کے چہرہ پر خاک پھینک دو[2] مقصود مبالغہ آمیز تعریف کرنے والوں اور خوشامد کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہے۔

گفتگو میں تکلف اور چبا چبا کر باتیں کرنا، اس کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے والے کو اللہ کا مبغوض بندہ قرار دیا ہے۔[3] کئی شخص بات کرنے والے ہوں تو جو بڑا ہو وہ گفتگو کا آغاز کرے۔[4]

معمول مبارک یہ تھا کہ بہتر شیریں اور خوبصورت الفاظ کا استعمال فرماتے، دیہاتیوں کی طرح سخت اور غیر مہذب گفتگو نہ فرماتے جو جس خطاب کا اہل ہوتا اس کے لئے ایسا ہی خطاب اختیار فرماتے۔[5] جو بات کہتے اس طرح کہتے کہ لوگ سمجھ لیں، اسی لئے بسا اوقات ایک بات کا تین بار تکلم فرماتے۔[6] حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کا یہ انداز نقل کیا کہ لفظ لفظ الگ ہوتا اور سننے والا پوری طرح سمجھ لیتا[7] مگر گفتگو میں تسلسل ہوتا۔[8]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو اور خطبات ومواعظ جو حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختصر اور پر معنی گفتگو فرماتے، طویل لانبی اور اکتا دینے والی گفتگو نہ ہوتی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بھی

w مسلم عن عثمان بن ابی العاص

e البحر الرائق: ۲۰۴/۸

q ترمذی، باب ماجاء فی الرخصة فی البکاء علی المیت

w ترمذی، باب جاء فی النهی عن ضرب الخدود الخ، وباب ماجاء فی کراهیة النوح

اس کی ہدایت فرمائی ہے۔[1] ـــــ زبان کی حفاظت کی آپ نے خاص تاکید فرمائی ہے اورفرمایا کہ دو چیزیں ہیں جو زیادہ تر اہل دوزخ کو دوزخ میں لے جائے گی، ایک منہ اوردوسرے شرم گاہ۔[2]

خطوط

خطوط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لکھے ہیں، حدیث کی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو خطوط نقل کئے گئے ہیں وہ یا تو دعوت اسلام سے متعلق ہیں یا شریعت کے بعض ارکان کی تفصیل اور توضیح ہیں۔

گو زمانۂ نبوت میں ڈاک کا نظام اس طرح کا نہیں تھا جواب ہے یہ بعد کے زمانے میں ایجاد ہوا۔ لیکن شریعت کے بعض احکام سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خطوط کے جواب دینے کے احکام کیا ہیں؟ علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ جیسے سلام کا جواب دینا ایک مسلمان پر حق ہے اسی طرح خط کا جواب دینا بھی خط لکھنے والا کا حق ہے۔[3]

چوں کہ ہر اچھے کام کی ابتداء بسم اللہ سے ہو، حدیث میں اس کی تلقین کی گئی ہے اس لئے خطوط کے شروع میں بسم اللہ لکھنا چاہئے۔ یہی معمول آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے مکاتیب میں تھا۔ بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ لکھنا کافی نہیں۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ خط کی ابتداء مکتوب نویس کے نام سے ہو پھر اس شخص کا نام لکھا جائے جس کے نام خط لکھا جارہا ہے اور خط میں مکتوب الیہ کے مطابق حیثیت اور مناسب حال القاب لکھے جائیں جیسا کہ آپ نے شاہ روم کو عظیم الروم کے لقب سے مخاطب فرمایا تھا۔ خط دعائیہ الفاظ پر ختم کیا جائے اور آخر میں دستخط کیا جائے یا مہر لگائی جائے یا کوئی بھی ایسی شکل

---

e ترمذی، باب ماجاء فی عدۃ المتوفی عنھا زوجھا
r ابوداؤد، باب صنعۃ الطعام لاھل المیت
t ترمذی، باب ماجاء فی الطعام یصنع

اختیار کی جائے جس سے مکتوب نویس کی شناخت ہو سکے۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کرنے کے بعد اول سلام لکھا جائے پھر خط کا خاتمہ بھی سلام پر ہو ــــــ یہ تمام آداب ان مکتوب گرامی سے ثابت ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کے نام لکھے تھے۔[1]

مجلس

بیٹھک اور نشست کے بنیادی آداب میں یہ ہے کہ نشست میں وسعت برتی جائے تاکہ بعد میں آنے والوں کو سہولت ہو۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿ Ë Ì Í Î Ï Ð﴾ مجلس میں آنے والوں کو کوئی ایسا عمل نہیں کرنا چاہئے جس سے کبر کی بو آئے یا دوسروں کی ہتک ہو۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع فرمایا ہے کہ کسی کو اس کی نشستگاہ سے اٹھا کر اس کی جگہ خود بیٹھ جائے۔[3] اسی طرا ایسا کوئی عمل جس سے دوسروں کو خلل ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا، ارشاد ہوا کہ پہلے سے دو آدمی بیٹھے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر بیچ میں گھسنے کی کوشش نہ کرے۔[4] اسی طرح ان لوگوں نے کوئی حلقہ بنا رکھا ہو تو اس کے بیچ میں جا کر بیٹھ جانے کو قابل لعنت قرار دیا ہے۔[5] اس لئے کہ یہ عمل نہ صرف دوسروں کے لئے خلل کا باعث ہے بلکہ اس سے کبر اور تعلی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

مجلس میں پہنچے تو پہلے سلام کرے واپس ہو تو اس وقت بھی سلام کرے۔ مجلس میں دوسرے کی جو خصوصی نشست گاہ ہو یا تکیہ وغیرہ ہو وہاں پر نہ بیٹھے، اس کو حدیث میں تکرمہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔[1] کسی عہدہ دار کی کرسی خصوصی نشست گاہ گاؤ تکیہ وغیرہ

q ابن ماجه، باب ماجاء في ثواب من عزى مصاباً

w ترمذي، باب آخر في فضل التعزية

e البحر الرائق: ۲۰۴/۸

r البحر الرائق: ۲۰۴/۸

کے یہی احکام ہیں، ان پر از خود نہ بیٹھنا چاہئے کہ یہ خلاف ادب ہے اور میزبان کے احترام اور تعظیم کے خلاف، ـــــ بیٹھنے کے انداز میں بھی تواضع ہو کہ کبر کی بو نہ آتی ہو، حضرت قیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بار تواضع کی ایسی کیفیت پر بیٹھا ہوا دیکھا کہ میں بے چین ہوگئی اور گھبرا گئی "ارعدت من الفرق"[2] تاہم چوں کہ مختلف لوگوں کے لئے اور مختلف حالات میں بیٹھنے کی الگ الگ ہیئتیں مناسب ہوسکتی ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خاص صورت اور ہیئت متعین نہیں فرمائی۔ بعض اوقات اکڑوں یعنی سرین کے بل پنڈلیاں اٹھا کر بیٹھتے۔[3] کبھی تکیہ پر ٹیک لے کر بیٹھتے۔[4] فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک پلتھی مار کر بیٹھنے کا معمول تھا۔[5]

ہاں ایسی بیٹھک جو متکبرانہ ہو مناسب نہیں۔ ایک صاحب کے پاس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا، انہوں نے اپنا بایاں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے لگا رکھا تھا اور دائیں ہاتھ پر ٹیک لگا رکھا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر غصہ کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ یہ ان لوگوں کی بیٹھک ہے جو عنداللہ مغضوب ہیں۔[6]

ملا علی قاری نے اس کی وجہ یہی لکھی ہے کہ اس بیٹھک سے کبر کا اظہار ہوتا ہے، نشست و برخاست میں سب سے اہم بات اچھے ہمنشیں کا انتخاب ہے۔ آپ نے ایک روایت میں اچھے اور برے ہمنشیں کے فائدے اور نقصان کو بڑی عمدہ تمثیل سے واضح فرمایا ہے کہ اچھے ہمنشیں عطر فروش کی طرح ہیں اگر عطر نہ ملے تو خوشبو ضرور ملے

q ترمذی، باب ماجاء فی خفض الصوت الخ

w مسلم عن ابی ھریرہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ، باب تشمیت العاطس وکراھیۃ التثاؤب

e ترمذی، عن ابی ایوب، باب ماجاء کیف تشمیت العاطس

r ترمذی، عن سالم بن عبید، حوالہ مذکور

t ترمذی، عن ابی ایوب، حوالہ مذکور

گی، براہمنشیں اس شخص کی طرح ہے جس کی بھٹی ہو، آگ سے بچ جائے تو دھواں سے نہیں بچ سکتا[1] ـــــ کوئی بھی مجلس ہو، ہونا یہ چاہئے کہ وہ اللہ کے ذکر سے بالکل خالی نہ ہو، ایسی مجلس میں جس میں اللہ کا ذکر نہ ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردار گدھے کی طرح ہے اور یہ مجلس اہل مجلس کے لئے باعث حسرت وافسوس ہوگی[2] ـــــ حضرت عبداللہ بن عمر نے حضور کا معمول نقل کیا ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے اٹھتے تو ایک خاص دعا فرماتے اور وہ یہ ہے:

> ''اے اللہ ہمیں اپنے خوف کا ایسا حصہ عطا فرما جو ہمارے اور آپ کی نافرمانیوں کے درمیان حائل ہو جائے اور اپنی طاعت کا اتنا حصہ جو آپ کی جنت تک پہنچائے، یقین کا اتنا حصہ عطا فرما کہ دنیا کی آزمائشیں ہم پر آسان ہو جائیں۔ خدایا! جب تک ہم زندہ رہیں ہمارے کان آنکھ اور قوت کو لائق استفادہ رکھ اور ہماری نسلوں میں اس کیفیت کو باقی رکھ۔ اور ہم پر ظلم کرنے والوں سے تو ہی انتقام لے، ہمارے دشمنوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما، ہمارے دین کو آزمائش نہ بنا نہ دنیا کو ہماری فکر کا سب سے بڑا مرکز اور علم کا مبلغ اور نہ ہم پر ایسے شخص کو مسلط فرما جو بے رحم ہو۔''

3

یہ پرتاثیر اور جامع دعا جو آپ کے منصب نبوت کے شایان شان ہے اور کمال بندگی اور غایت تواضع کا مظہر ہے ـــــ مجلس کے اخیر میں پڑھنی چاہئے۔

استراحت و بیداری

y دیکھئے: ترمذی، باب ماجاء کیف تشمیت العاطس

u ترمذی، حوالہ مذکور، یہ فقرہ اصل میں مخاطب کی نادانی اور حمق کے اظہار کے لئے بولا جاتا ہے، مرقاۃ: ۵۹۳/۴

اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان کا جسم اس کے پاس امانت الٰہی ہے اس لئے اس کی حفاظت و صیانت اور اس کی جائز اور فطری ضروریات اور مقتضیات کی تکمیل ہر مسلمان اور انسان کا فریضہ ہے۔ انسانی جسم کے لئے ایک ضرورت نیند بھی ہے۔ خود قرآن مجید نے نیند کو آرام وسکون کا ذریعہ بنایا ہے۔[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم پر تمہاری آنکھ کے بھی حقوق ہیں۔ "ان لعینک علیک حق"[2]

سونے میں اس بات کا خیال ضروری ہے کہ بے ستری نہ ہو، عرب کھلی تہ بند استعمال کرتے تھے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پاؤں پر پر پاؤں چڑھا کر چت سونے کو منع فرمایا۔[3] پٹ سونے کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا اور اس کو ایسا طریقہ قرار دیا جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔[4] سونے کی ہیئت میں خود آپ کا معمول مبارک یہ تھا کہ ابتداء شب میں سوتے تو دائیں کروٹ پر سوتے اور صبح کے قریب سوتے تو بازو اٹھا کر اس کے سہارے سوتے۔[5] ——خواب و بیداری کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ عشاء سے پہلے سونے کو ناپسند فرماتے کہ اس سے نماز عشاء کے فوت ہونے کا اندیشہ ہے۔[6] عشاء کے بعد غیر ضروری گفتگو کو پسند نہیں فرماتے اور سو جاتے۔[7] ہاں مسلمانوں کی کوئی مصلحت ہوتی تو عشاء کے بعد بھی کچھ جاگ لیتے۔[1] رات کے آخری حصہ میں بیدار رہتے[2] کہ یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تہجد کا وقت تھا۔

---

q ترمذی، باب ما یقول العاطس الخ

w ترمذی، باب ماجاء کم یشمت العاطس عن یزید بن عبدالرحمن عن امہ عن ابیھا

e ترمذی، باب ماجاء کم یشمت العاطس عن یزید بن عبدالرحمن عن امہ عن ابیھا

r مرقاۃ: ۵۹۰/۴ t مرقاۃ: ۵۹۰/۴

y فتح الباری: ۱۰/۴۳۲، باب الحمد للعاطس

سونے سے پہلے یہ دعا پڑھتے:

"باسم اللھم احی واموت

D: ''اے اللہ! آپ ہی کے نام سے زندہ ہوں اور آپ ہی کا نام لے کر مرتا ہوں۔''

سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھتے، دونوں ہتھیلیوں کو اکٹھا کر کے پھونکتے اور سر و چہرہ سے شروع کر کے جہاں تک ہاتھ پہنچ سکتا، ہاتھ پھیر لیتے اور ایسا تین بار فرماتے۔ دایاں ہاتھ دائیں رخسار کے نیچے رکھ کر آرام فرماتے پھر دعا فرماتے:

"اللھم قنی عذابک یوم تبعث عبادک۔''

D: ''خدوندا! مجھے اس دن اپنے عذاب سے محفوظ رکھ جس دن تو اپنے بندوں کو دوبارہ زندہ فرمائے گا۔''

بعض اور الفاظ وفقرے بھی دعا کے منقول ہیں۔4

بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

"الحمد للّٰہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور''

D: ''تمام تعریف اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے ہمیں نیند کی اس عارضی موت کے بعد پھر بیداری عطا فرمائی اور اسی کی طرف پھر لوٹنا ہے۔''

سفر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت جامعہ اور اسوۂ مبارکہ میں جہاں حضر اور قیام کے احکام ہیں وہیں سفر اور غریب الوطنی کی زندگی کے لئے بھی روشنی موجود ہے ـــــ بے مقصد سفر کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا، اس لئے سفر کا مقصد

u ترمذی، عن ابی موسیٰ، باب ماجاء کیف تشمیت العاطس

i بخاری عن ابی ھریرہ، باب اذا تثاءب فلیضع یدہ علی فیہ

جونہی حاصل ہو جائے اپنی جائے سکونت کو واپس آ جانا چاہئے۔[1] سفر کے لئے نہایت اہم چیز رفقاء سفر ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا سفر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔[2] بہتر ہے کہ کم سے کم تین آدمی سفر کریں اور تین میں سے ایک کو امیر منتخب کر لیں۔[3] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو زیادہ بہتر قرار دیا کہ رفقاء سفر کم سے کم چار ہوں۔[4]

دراصل زمانۂ قدیم میں آج کل کی طرح سفر کے ذرائع میسر نہیں تھے قافلوں کی شکل میں سفر ہوتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قافلہ کم سے کم تین آدمیوں سے بنتا ہے۔[5] اس زمانے میں حفاظت وصیانت کے نقطۂ نظر سے قافلوں کی شکل میں سفر کرنا ضروری تھا، موجودہ زمانے میں بسیں، ٹرینیں اور جہاز وغیرہ بجائے خود قافلہ کے حکم میں ہے۔

جب آدمی سفر شروع کرے تو لوگوں کو اسے دعا دینی چاہئے یہ دعاء خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف الفاظ میں منقول ہے، دعاء کے الفاظ یہ ہیں:

"استودع اللّٰہ دینکم وامانتکم وخواتیم اعمالکم"

D: ''تمہارے دین، تمہاری امانت اور تمہارے خاتمۂ اعمال کو اللہ کے حوالہ کرتا ہوں۔''

بعض دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح دعا دی ہے:

"فی حفظ اللّٰہ وفی کنفہ زودک اللّٰہ التقوی وغفر ذنبک ووجھک للخیر حیث کنت"[۶]

---

o مسلم عن الخدری، باب تشمیت العاطس وکراھیۃ التثاؤب

q بخاری و مسلم عن عبداللّٰہ بن مسعود، مشکوٰۃ باب حفظ اللسان

w احزاب، آیت: ۱۲ e ق، آیت: ۲

r مالک عن لقمان باب ماجاء فی الصدق والکذب

t ترمذی عن عبداللّٰہ ابن عمرو بحوالہ مذکور

y ترمذی عن ابی ھریرہ

D: ''تم اللہ کی حفاظت اور اس کی نگہبانی میں رہو اللہ تمہیں تقویٰ عطا فرمائے، گناہوں کو معاف فرمائے اور تم جہاں کہیں ہو، خیر کی طرف تمہاری رہنمائی کرے۔''

سفر کو نکلنے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان سفر کی تیاری کے بعد گھر ہی میں چار رکعت نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے، جس میں سورۂ فاتحہ اور قل ہو اللہ پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ ان رکعات کے ذریعہ میں آپ کی قربت کا طلب گار ہوں اور تو ان کی وجہ سے میرے اہل وعیال اور مال کا ولی ونگراں اور محافظ ہو جا[2]

پھر جب سواری پر چڑھے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہے اور یہ دعا پڑھے:

"سبحان الذي سخر لنا هذا وما كنا له مقرنين وانا الى ربنا لمنقلبون"

D: ''اس کی ذات پاک ہے جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا...... اور ہم تو ایسے نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے اور ہم کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

یا یہ دعا پڑھی جائے:

"اللهم اني اسئلك في سفري هذا البر والتقوى ومن العمل ما ترضى اللهم هون علينا السفر واطولنا البعد اللهم انت الصاحب في السفر والخليفة في الاهل اللهم اصحبنا في سفرنا واخلفنا في اهلنا۔"[3]

D: ''اے اللہ میں اپنے اس سفر میں نیکی اور تقویٰ کا خواستگار ہوں اور ہر اس عمل کا بھی جو آپ کو پسند ہو، سفر آسان فرما دیجئے دوری کم فرما دیجئے۔ اے اللہ سفر میں آپ ہی ہمارے رفیق ہیں، اہل وعیال کے لئے

q طه، آیت: ۲ w مسلم عن مقداد بن اسود

آپ ہی نگہبان ہیں، اے اللہ ہمارے سفر میں آپ مدد فرمایئے اور ہمارے اہل وعیال کی حفاظت فرمایئے۔''

بعض روایات میں یہ دعا منقول ہے:

"انت الصاحب فی السفرُ الخلیفة فی الاهل اللهم انی اعوذبک من الهم فی السفر والکابة فی المنقلب اللهم اقبض لنا الارض وهو نعلینا السفر۔[۴]

D: ''اے اللہ سفر میں آپ ہی ہمارے لئے رفیق اور ہمارے اہل کے لئے نگہبان ہیں۔ اے اللہ سفر کی مشکلات سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں اے اللہ ہمارے لئے مسافت سفر کو کم فرما اور سفر کو آسان بنا۔''

پھر سفر کے درمیان جب کبھی اونچائی پر چڑھنا ہو یا نشیب میں اترنا ہو تو یہ دعا پڑھے:

"اللهم لک الشرف علی کل شرف ولک الحمد علی کل حالٍ

D: ''اے اللہ ہر شرف سے بڑھ کر آپ کا شرف ہے اور ہر حال میں آپ کے لئے حمد وثنا ہے۔''

کہ یہی آپ کا معمول تھا[2] درمیان میں اگر کسی منزل پر قیام کی نوبت آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "اعوذ بکلمات اللّٰه التامات من شر ما خلق" پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔[3]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعرات کے دن سفر کے آغاز کو بہتر سمجھتے تھے اور زیادہ تر سفر اسی دن فرماتے، رخصت ہونے والے کے ساتھ مشایعت یعنی تھوڑی دور چلنا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔[1] آداب سفر میں یہ بھی ہے کہ جس سواری میں جارہا ہو اس پر مناسب حال بوجھ اٹھائے، جانور پر سواری کرے تو اس کی راحت کا بھی خیال کرے۔[2]

e ترمذی باب ماجاء فی الفصاحة والبیان

سفر میں پانچ چیزوں کا رکھنا خاصا معمول تھا، آئینہ، سرمہ دانی، قینچی، مسواک اور کنگھی ـــــ سفر سے واپس ہوتے ہوئے اس بات کا لحاظ رکھے کہ اچانک رات میں گھر نہ آئے بلکہ صبح یا شام کو آئے اور اہل خانہ کو پہلے سے خبر کر دے۔[3] واپسی میں جب شہر میں داخل ہو تو یہ دعا پڑھے:

"آئبون تائبون ان شاء اللّٰہ عابدون لربنا حامدون۔[4]"

D: ''لوٹ رہے ہیں، تائب ہیں، انشاءاللہ ہم اپنے پروردگار کی حمد و تعریف کریں گے۔''

معمول مبارک تھا کہ تشریف آوری کے بعد پہلے مسجد جاتے دو رکعت نماز پڑھتے پھر مکان تشریف لے جاتے۔[5] یہ بھی مسنون ہے کہ اعزاء و اقرباء کے لئے کھانے وغیرہ کے کچھ تحفے ساتھ لاتے۔[6] سفر سے واپسی پر آنے والوں کے خیر مقدم اور استقبال کے لئے آگے بڑھ کر ملاقات کرنا بھی ثابت ہے۔[7] صحابہ کا معمول تھا کہ طویل سفر سے واپس آتے تو باہم معانقہ بھی کرتے۔[8]

شب و روز کے معمولات مبارکہ

حدیث و سیرت کی کتابوں میں آپ کے شبانہ روز کے معمولات غالبًا یکجا مذکور نہیں ہیں، لیکن اگر آپ کے شمائل و احوال کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو شام و سحر اور روز و شب کے معمولات جانے جا سکتے ہیں۔ اردو زبان میں مشہور سیرت نگار بلکہ سیرت و تذکرہ کی جان بہار علامہ شبلی نعمانی نے ان معمولات کو یکجا کرنے کا اہتمام کیا ہے اور آپ کے شاگرد رشید علامہ سیّد سلیمان ندوی نے اس پر بیش قیمت اضافہ بھی

r دیکھئے: بخاری باب اکرام الکبیر　　t زاد المعاد: ۲/۱۱
y ابوداؤد باب تکریر الحدیث　　u ابوداؤد باب الهدی فی الکلام
i زاد المعاد: ۱/۴۳ فصل فی هدیه فی کلامه

فرمایا ہے۔ یہاں اسی کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:

معمول مبارک یہ تھا کہ اپنے اوقات کے تین حصے فرماتے، ایک عبادت کے لئے، دوسرا بندگان خدا کے لئے، تیسرا خود اپنی ذات کے لئے ـــــ آدھی رات یا اس کے بعد بیدار ہوتے، مسواک سرہانے رکھتے، پہلے مسواک پھر وضو فرماتے اور اس کے بعد تہجد میں مشغول ہو جاتے۔ عام معمول آٹھ رکعت تہجد کا تھا، کبھی اس سے زیادہ اور کبھی اس سے کم رکعت ادا فرماتے، فجر کے بعد پالتی مار کر مسجد ہی میں تشریف رکھتے تا آنکہ آفتاب اچھی طرح نکل آئے اس درمیان حسب موقع نصیحت فرماتے، خواب بیان کرتے یا خواب کی تعبیر بیان فرماتے، مال غنیمت اور وظائف وغیرہ کی تقسیم بھی اسی وقت ہوتی۔

کچھ دن چڑھے، کبھی چار اور کبھی آٹھ رکعت نماز چاشت ادا فرما کر گھر جاتے اور گھر کے کاموں میں مشغول رہتے، عصر کے بعد ازواج مطہرات کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے جانے کا معمول تھا، جن ام المؤمنین کی باری ہوتی، مغرب بعد سے انہی کے یہاں قیام رہتا، مغرب تا عشاء دوسری ازواج مطہرات بھی وہیں آ جاتیں۔ عشاء کے بعد جلد سو جاتے اور اس وقت بات چیت کو ناپسند کرتے۔ سوتے وقت قرآن مجید کی کوئی سورت پڑھ کر سوتے، دعا پڑھتے، دائیں کروٹ ہوتی اور دایاں ہاتھ دائیں رخسار کے نیچے ہوتا، آنکھ کھلتی تو پھر پہلے دعا پڑھتے[1] ـــــ دو وقت کھانے کا معمول تھا، دن میں پہلے پہر کے بعد اور رات میں بعد مغرب[2] دن کے کھانے کے بعد قیلولہ بھی فرمایا کرتے[1]

بچے ـــــ اسلام کی نظر میں

q ابوداؤد باب ماجاء فی المتشدق فی الکلام

w ترمذی عن ابی هریره بحواله مشکوة، باب حفظ اللسان ردالمحتار:

بچے اللہ کی بڑی نعمت اور عظیم عطیہ ہیں، انسانی معاشرہ میں ان کی حیثیت پھولوں اور کلیوں کی ہے، وہ انسان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک اور راحت کا ذریعہ ہیں۔اسی لئے انسانی فطرت میں صاحب اولاد بننے کا زبردست داعیہ رکھا گیا ہے، یہ داعیہ ایک معمولی آدمی سے لے کر بڑے سے بڑے برگزیدہ انسانوں تک میں موجود ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں دو اولوالعزم انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام کے سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے خدا سے اولاد کے لئے دعا فرمائی[2] اور اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرمایا۔

پھر قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ انسان جو اس دنیا میں خدا کا خلیفہ اور نمائندہ ہے[3] اور جس کے لئے پوری کائنات کو مسخر کر دیا گیا ہے[4] وہ اپنے بچپن میں سب سے محتاج، کمزور ناتواں عاجز و درماندہ اور قدم قدم پر اور ایک طویل مدت کے لئے بے شمار سہاروں اور مددگاروں کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے خدا نے انسانوں کی فطرت میں اپنی اولاد سے محبت اور تعلق کا ایک والہانہ اور بے ساختہ جذبہ رکھ دیا ہے۔ ایسی محبت جس کو الفاظ کا روپ دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سورج کی تصویر سے شعاعوں کا بکھیرنا۔ انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات ایک تو اپنے نقطۂ آغاز ہی سے خود مکتفی ہوتی ہیں، دوسرے ان میں اولاد سے محبت و شیفتگی کے اتنے بے پناہ جذبات نہیں ہوتے بلکہ بعض مخلوقات تو ایسی ہی ہیں جو اپنی اولاد کو خود اپنی غذا بنا لیتی ہیں۔

یہ دراصل قدرت کا ایک لطیف اشارہ ہے جو انسانی بچوں، ان کی تربیت ونشو ونما

۲۶۶/۵

e ردالمحتار: ۲۶۶/۵

q ملاحظہ ہو: زاد المعاد: ۷۱/۳ w المجادلة، آیت: ۱۱

e حوالہ ترمذی عن ابن عمرو، باب کراھیة ان یقام الرجل من مجلسه الخ

اور سماج کی ان کی طرف توجہ کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے افزائش نسل ان کی تعلیم و تربیت کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کے لئے ایسا نظام العمل ترتیب دیا ہے جو اس کی پیدائش سے جوانی تک کی پوری زندگی کو حاوی ہے۔

مبارک باد

بچہ کی پیدائش پر سماج کا کیا ردعمل ہونا چاہئے؟ ـــــــ قرآن بتاتا ہے کہ لوگوں کو اس پر مبارک باد دینا اور مسرت کا اظہار کرنا چاہئے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام کے تولد ہونے کی اطلاع دینے کا قرآن مجید ان الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے: ''ہمارے قاصد (فرشتے) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے اور سلام کیا، انہوں نے بھی جواباً سلام کہا......اس وقت ابراہیم کی بیوی (سارہ) کھڑی تھیں، وہ ہنس پڑیں، ہم نے ان کو اسحاق علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے بعد یعقوب علیہ السلام کی خوشخبری دی۔''[1] حضرت زکریا علیہ السلام کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

> ''فرشتوں نے ان کو اس وقت ندا دی جب وہ محراب میں کھڑے مصروف نماز تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتے ہیں۔'' [2]

یہ مبارک باد جس طرح بچوں کے لئے ہے اسی طرح بچیوں کے لئے بھی بچیوں کی پیدائش پر رنجیدہ خاطر اور محزون ہونا جاہلانہ اور غیر اسلامی انداز فکر ہے، قرآن نے اس کو کافرانہ طریقہ قرار دیا ہے۔[3] اس لئے کہ اولاد جو بھی ہو اللہ کا عطیہ اور اس کی متعین کی ہوئی تقدیر ہے۔ اس طرح جو شخص لڑکیوں پر کبیدہ خاطر ہوتا ہے وہ دراصل اپنے عمل سے اس بات کا اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ وہ خدا کے فیصلہ سے ناراض اور نالاں ہے۔

---

۲ ترمذی باب ماجاء فی کراهية الجلوس الخ

اذان واقامت

ولادت کے بعد بچہ سے متعلق سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کے کلمات کہے جائیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کی پیدائش کے دن ان کے کانوں میں اذان واقامت کے کلمات کہے ہیں[1] اور اس کا حکم بھی دیا ہے[2] اس اذان واقامت کا منشا یہ ہے کہ پہلی بات اور پہلی نداء جو بچہ کے کان میں پڑے وہ خدا کی کبریائی اور اس کی الوہیت کی ہو، نیز اس سے پہلے کہ شیطان انسان کے کانوں اور دلوں تک اپنی بات پہنچائے، پہلے ہی اس کو اسلام اور ہدایت کی دعوت دے دی جائے۔

تحنیک

تحنیک کے معنی کھجور چبانے کے ہیں۔ تحنیک سے مراد یہ ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد کوئی بزرگ اور صالح آدمی کھجور یا کوئی میٹھی چیز چبا کر اس کا لعاب بچہ کے منہ میں اس طرح لگا دے کہ ایک خفیف حرکت کے ذریعہ منہ کے اندرونی حصہ میں دائیں اور بائیں جانب لگ جائے۔ اس کا مقصد برکت کا حصول ہے، انسان یا کسی بھی مخلوق کے جسم کے اجزاء اور لعاب جس طرح اپنے طبی اثرات رکھتے ہیں اور جسمانی صحت اور بیماری کا ذریعہ بنتے ہیں اسی طرح اس کے اخلاقی اثرات بھی ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انسان نے ان جانوروں کے گوشت کھانے کو ممنوع اور لعاب کو ناپاک قرار دیا ہے جن میں فطری طور پر درندگی اور خساست ہے مثلاً شیر، بھیڑیئے اور سور وغیرہ۔ اس طرح عین ممکن ہے کہ بزرگ وصالح اشخاص سے تحنیک کرانے سے

---

t ترمذی باب ماجاء فی کراھیة القعود وسط الحلقة

q ترمذی باب ماجاء فی الاتکاء

w ابوداؤد، مشکوٰة باب الجلوس

بچہ میں حسن اخلاق اور دینداری پیدا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت ہے، حضرت ابو موسیٰ اپنے صاحبزادے کو حضور کی خدمت میں لائے تو آپ نے ان کا نام ابراہیم رکھا، کھجور سے تحنیک کی اور برکت کی دعا دی۔[1] حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے کی بھی آپ نے کھجور سے تحنیک کی اور ان کا نام عبداللہ تجویز فرمایا۔[2]

بال مونڈنا

بچوں سے متعلق احکام میں سے یہ بھی ہے کہ ساتویں دن سر کے بال مونڈ دیئے جائیں اور بال کے ہم وزن چاندی یا اس کی قیمت فقراء اور محتاجوں پر صدقہ کر دی جائے، یہ حکم محض از راہ استحباب ہے۔ اس سے طبی فائدہ تو یہ ہوگا کہ سر کے مسامات کھلیں گے اور اس کی وجہ سے دماغ اور اس سے وابستہ دوسری صلاحیتوں کو قوت حاصل ہوگی، دوسرے اس خوشی میں سماج کے پس ماندہ اور پست حال افراد بھی شریک ہو سکیں گے جو اسلامی تعلیمات کی روح ہے۔ چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا، اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت حسن اور حضرت حسین کے بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ فرمائی ہے۔[3]

ناموں کا انتخاب

ناموں کی حیثیت کسی قوم اور سوسائٹی میں بڑی بنیادی ہوتی ہے ان کے ذریعہ

---

e بخاری عن ابن عمر

r ترمذی عن جابر بن سوداء باب ماجاء فی الاتکاء

t ابوداؤد عن جابر بن سمرہ

y ابوداؤد عن شریک

مذہب اور فکر وعقیدہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام نے اس سلسلہ میں تفصیلی ہدایات دی ہیں ـــــ اچھے اور بامعنی نام رکھنے چاہئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ قیامت کے دن اپنے اور اپنے باپ کے ناموں سے پکارے جاؤ گے اس لئے اچھے نام رکھا کرو۔[1] چنانچہ جو نام اپنے مفہوم کے لحاظ سے نامناسب ہوتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے بدل دیتے۔[2] حضرت سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک صاحبزادی کا نام ''عاصیہ'' تھا جس کے معنی گنہ گار کے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدل کر جمیلہ (خوبصورت) رکھا۔[3] اس کے علاوہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے نام تبدیل کئے ہیں۔[4]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ناموں کو ناپسند فرمایا ہے جس سے بدشگونی اور بدفالی ہوتی ہو۔ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا، کیا نام ہے؟ انہوں نے کہا "حَـزْن" (سخت زمین)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں تم "سَهل" ہو۔[5] (سہل نرم زمین کو کہتے ہیں) اسی طرح حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حسین کا نام ''حرب'' تجویز کیا جس کے معنی لڑنے کے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام کو تبدیل کر کے حسین رکھا۔

ایسے نام رکھنا بھی مناسب نہیں جن سے اللہ تعالیٰ کو موسوم کیا جاتا ہے ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے جن کو لوگ ''ابوالحکم'' کہا کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ حکم تو ذات خداوندی ہے، پھر بیٹے کی طرف نسبت کرتے ہوئے ان کا نام ابوشریح تجویز فرمایا۔[1]

q بخاری باب فی العطار
w ابوداؤد عن ابی ھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
e ترمذی عن ابن عمر: ۱۸۸/۲
q نباء
w بخاری عن ابن عمر، باب حق الضیف

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کے نزدیک مبغوض ترین اور بدترین انسان وہ ہوگا جو اپنا نام ''ملک الاملاک'' (شہنشاہ) رکھے۔ اس لئے کہ ملک (بادشاہ) صرف خدا ہی کی ذات ہے۔[2]

ایسے ناموں کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا ہے کہ اگر کبھی ان کو پکارا جائے اور ان کی غیر موجودگی کی اطلاع دی جائے تو بظاہر بدشگونی پیدا ہوتی ہو، مثلاً کسی کا نام ''یسار'' ہے جس کے معنی آسانی کے ہیں، اب اس کے بارے میں کہا جائے کہ ''یسار نہیں ہے'' تو اس کے ظاہری معنی ہوں گے آسانی نہیں ہے —— ایسے چار ناموں کا حدیث میں ذکر آیا ہے۔ یسار (آسانی) رباح (نفع) نجیح (کامیاب) اور افلح (کامیاب)۔[3]

ایسے نام بھی نہیں رکھنے چاہئیں جس سے شرک کا اظہار ہوتا ہے جیسے عبدالنبی (نبی کا بندہ) یا ایسے نام جس میں غیر مسلموں سے تشبہ پیدا ہو اور ناموں میں مسلمانوں کا تشخص باقی نہ رہے جیسے جمشید، آفتاب، ماہتاب، نسرین، یاسمین وغیرہ۔

اس کے برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ناموں کو پسند فرمایا ہے جس سے اللہ کی عبدیت کا اظہار ہوتا ہو جیسے عبداللہ، عبدالرحمٰن وغیرہ، اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کے نام ابراہیم و اسماعیل وغیرہ۔[4]

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور سلف کے ناموں پر اپنے نام رکھنے چاہئیں اور ایسے ناموں کا انتخاب کرنا چاہئے کہ اول لمحہ سمجھ لیا جائے کہ یہ شخص مسلمان ہے، نام بامعنی ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ نام کا اثر انسان کی ذات اور اس کے اوصاف پر بھی پڑتا ہے۔

---

[2] ترمذی، باب ماجاء فی کراھیۃ ذلک

[3] ترمذی، باب ماجاء فی کراھیۃ الاضطجاع علی البطن

[4] شرح سنۃ عن ابی قتادۃ، مشکوۃ، باب الجلوس والنوم والمشی

[5] زاد المعاد: ۵۹/۱

ناموں کی ایک قسم ''کنیت'' ہے۔کنیت وہ نام ہے جس میں اب یا ابن کی طرف نسبت ہو۔ جیسے ابو ہریرہ (بلی والے) ابوسفیان بمعنی سفیان کے باپ اور علی بن ابی طالب، ابوطالب کے بیٹے علی۔ سلف صالحین میں اس قسم کے ناموں کا کثرت سے رواج تھا جیسے ابوبکر، ابوالحسن، ام سلمہ، ابن عمر، ابن مسعود وغیرہ، ایسے ناموں سے انسان کی شخصیت اوراس کے نسب کا اظہار ہوتا ہے اس لئے ایسے نام رکھنے چاہئیں۔

اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ ناموں میں بگاڑ نہ پیدا ہو مثلاً کسی کا نام عبدالکریم یا عبدالرزاق ہوتو اس کو صرف کریم یا رزاق کہا جائے۔[1] یہ سخت گناہ ہے اس لئے کہ یہ اللہ کے نام ہیں، اسی طرح اگر بچہ گونگا کانا اور زیادہ لمبا ہو تو اس کو گونگا، لمبا کہنا بری بات ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید نے ''تنابز بالالقاب'' سے منع فرمایا ہے۔

''ولا تنابزوا بالالقاب'' [2]

ساتویں دن تک بچہ کا نام رکھ دینا چاہئے، بعض احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ویسے بہتر یہ ہے کہ ولادت کے دن ہی نام رکھ دینا چاہئے۔ چنانچہ حضرت ابواسید اپنے صاحبزادہ کی ولادت کے بعد خدمت والا میں لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت ان کا نام ''منذر'' تجویز کیا۔[3] حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش شب میں ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ رات میرے یہاں ایک بچہ تولد ہوا اور میں نے اس کا نام اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کے نام پر ابراہیم (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رکھا ہے۔[1]

عقیقہ

u ابوداؤد باب النهي عن السمر بعد العشاء

q زاد المعاد: ۵۹/۱ w زاد المعاد: ۵۹/۱

e زاد المعاد: ۵۹/۱ r زاد المعاد: ۵۹/۱ t زاد المعاد: ۵۹/۱

عربی زبان میں ''عق'' کے معنی کاٹنے کے ہیں، عقیقہ میں ایک طرف جانور ذبح کیا جاتا ہے اور دوسری طرف ان بچوں کے بال کاٹے جاتے ہیں جن کا عقیقہ کیا جاتا ہے، اس دوہری مناسبت کی وجہ سے عرب اس کو عقیقہ کہا کرتے تھے۔[2] اسلام سے پہلے عرب میں مختلف قسم کی قربانیاں کی جاتی تھیں، انہیں میں ''عقیقہ'' بھی ہے۔[3] اس طرح اس پر ماقبل اسلام سے عمل ہے ـــــ اسلام نے بھی عقیقہ کو باقی رکھا اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نواسوں کا عقیقہ فرمایا، خیال ہوتا ہے کہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حلال اور مباح کو علانیہ کیا جانا چاہئے اور اس کا پوری طرح اظہار و اعلان ہو جانا چاہئے، نکاح حلال ہے اور اس کے ذریعہ ایک مرد و زن کا علاقۂ باہمی پاکبازی پر مبنی ہے، اس لئے ولیمہ کے ذریعہ اس کی تشہیر کی گئی اسی طرح ایک جائز رشتہ کے ذریعہ جب بچہ کی تولید ہو تو اس کے نسب کو بھی معروف کیا جانا چاہئے تا کہ عام لوگ بھی اس سے مطلع ہو سکیں۔ غالباً اسی مقصد کے لئے شریعت نے ''عقیقہ'' کی سنت رکھی ہے۔

عقیقہ کا حکم

امام ابوحنیفہ کا قول مشہور یہی ہے کہ عقیقہ محض مباح ہے نہ واجب اور نہ سنت۔[4] اس لئے کہ حضرت عائشہ کی روایت میں ہے کہ بقرعید کی قربانی نے اور تمام قربانیوں کو منسوخ کر دیا ـــــ اکثر فقہاء کے نزدیک عقیقہ مسنون ہے۔[1] ـــــ اور یہی صحیح ہے اور اس سلسلہ میں کئی حدیثیں موجود ہیں[2] اسی بنا پر خود احناف کے بھی محقق علماء اس کے مستحب یا مسنون ہونے کے قائل ہیں، خود امام طحاوی نے مستحب قرار دیا ہے۔ یہی رائے مولانا عبدالحئی لکھنوی فرنگی محلی کی بھی ہے[3] علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ اس سے

q مسلم، باب السفر قطعة من العذاب
w ابوداؤد، باب فی الرجل یسافر وحده
e احیاء العلوم: ۲۵۲/۲

بھی اللہ تعالیٰ کا تقرب ہی مقصود ہے۔[4] اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی عقیقہ کو کم از کم مستحب کا درجہ ضرور دیتے تھے۔ رہ گئی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ قربانی واجب ہونے کے بعد عقیقہ واجب نہیں رہا، محض مستحب کا درجہ رکھتا ہے۔

عقیقہ کے جانور

حضرت ام کرز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لڑکے کا عقیقہ دو بکرے سے اور لڑکیوں کا ایک بکرے سے کیا جائے۔[5] اسی مضمون کی روایت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہے۔[6] اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی۔[7] اس کے مقابلہ میں عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا عقیقہ ایک ایک ہی مینڈھے سے کیا ہے۔[8] احناف اور مالکیہ اس حدیث کے مطابق ایک مینڈھے کا عقیقہ لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لئے قرار دیتے ہیں اور شوافع اور حنابلہ کا عمل پہلی حدیث پر ہے یعنی بہتر طریقہ لڑکوں کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا ہے۔[1] اور یہی زیادہ صحیح ہے، حضرت حسن و حسین کا عقیقہ ایک مینڈھے کے ذریعہ جواز بتانے کے لئے ہے۔

عقیقہ کن جانوروں کے ذریعہ ہوگا اس سلسلہ میں عام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جن جانوروں کی قربانی درست ہے انہی کے ذریعہ عقیقہ بھی درست ہے اور قربانی

---

r احیاء العلوم: ۲۵۲/۲

t تخریج عراقی علی الاحیاء، حوالہ مذکور

y ابوداؤد باب فی الدعاء عند الوداع

q احیاء العلوم: ۲۵۳/۲ w احیاء العلوم: ۲۵۳/۲ e زاد المعاد: ۳۶/۲

جن جانوروں کے ذریعہ درست ہے وہ اونٹ گائے، بیل اور بکرے مینڈھے ہیں، البتہ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اونٹ کے ذریعہ عقیقہ بہتر ہے اور امام مالک کے نزدیک بکرے کے ذریعہ[2] اور واقعہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے حدیث سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی ایک بیوی نے بچے کی پیدائش پر اونٹ کی قربانی نذر مانی تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ سنت پر عمل کرنا افضل ہے اور وہ یہ ہے کہ لڑکوں کی طرف سے دو اور لڑکیوں کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے۔[3]

عقیقہ کب کیا جائے؟

عقیقہ بچہ کی ولادت کے ساتویں دن کیا جانا چاہئے، یوں ساتویں دن سے پہلے بھی کر لیا جائے تو کافی ہے۔ کس عمر تک عقیقہ کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں امام شافعی اور امام احمد کا خیال ہے کہ بالغ ہونے سے پہلے پہلے تک۔[4] امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساتویں دن عقیقہ نہیں کر پایا تو اب عقیقہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔[5]

ساتویں دن عقیقہ نہیں کر پائے تو چودھویں ورنہ اکیسویں دن عقیقہ کرنا چاہئے، اس سلسلہ میں حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کیا ہے، محدثین کے یہاں جس کی صحت مشکوک ہے[1] نیز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ایک قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اسی لئے علامہ ابن قدامہ نے بھی ساتویں تاریخ پر عقیقہ نہ ہو سکے تو چودھویں اور اکیسویں تاریخ کو عقیقہ

---

q زادالمعاد: ۳۶/۲ w زادالمعاد: ۳۷/۲ e حوالہ سابق بحوالہ مسلم

q احیاء العلوم: ۲۵۶/۲ w احیاء العلوم: ۲۵۵/۲

e ابوداؤد باب فی الطروق r زادالمعاد: ۳۶/۲

t زادالمعاد: ۳۸/۲ y احیاء العلوم: ۲۵۷/۲

u دیکھئے ابوداؤد باب فی القلق i زادالمعاد: ۸۳/۲

مسنون قرار دیا ہے۔[2]

متفرق احکام

عقیقہ کے گوشت میں سے خود بچہ کے اولیاء کے لئے کھانا، دوسروں کو کھلانا، غرباء کو دینا مسنون ہے۔[3] یہ بھی مستحب ہے کہ عقیقہ کے جانوروں کی ہڈیوں کو توڑا نہ جائے بلکہ صرف جوڑوں سے الگ کیا جائے، حضرت حسین وحسن کے عقیقہ کے جانور کی ران آپ نے دایہ کو دی تو فرمایا کہ اس کی ہڈیوں کو نہ توڑنا۔ "لا تکسروا منھا عظماً۔"

4

بعض روایتوں میں یہ بات بھی آئی ہے کہ عقیقہ کے جانور کا خون بچہ کے سر میں لگایا جائے، لیکن اکثر علماء کے نزدیک فنی اعتبار سے یہ روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔ نیز دوسری صحیح روایات میں یہ ہدایت موجود ہے کہ بچہ سے گندگی کو دور کرو۔ "امیطوا عنه الاذی" مذکورہ روایت کے مضمون کے برعکس ہے، اس کے علاوہ عبداللہ مزنی سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچہ کے سر کو خون نہ لگایا جائے "لا یمس رأسه"[1] اس لئے صحیح یہی ہے کہ عقیقہ کا خون بچہ کے سر پر لگانے کی ضرورت نہیں اور اسی پر عام فقہاء کا عمل ہے۔[2] —— مستحب طریقہ یہ ہے کہ پہلے جانور ذبح کیا جائے پھر بچہ کا بال مونڈا جائے۔[3] اگر عقیقہ کے جانور کا چرم فروخت کیا جائے تو قربانی کے چرم کی طرح قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہوگا۔[4]

یہ بھی مسنون ہے کہ بچہ کا بال کاٹ کر اس کے ہم وزن چاندی صدقہ کر دی

---

q سیرۃ النبی: ۲۱۲/۲ تا ۲۱۴ معمولات ملخصاً

w جیسا کہ روایات کے مجموعی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

q بخاری: ۱۲۸/۱، باب القائلۃ بعد الجمۃ

w الصفت، آیت: ۱۰۰، مریم، آیت: ۵

e البقرہ، آیت: ۳۰

جائے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو اس کی تلقین فرمائی۔

"وتصدقی بوزن شعرہ فضۃ۔"[5]

ختنہ

حضرت ابو ہریرہ کی ایک روایت کے مطابق امور فطرت میں سے ایک "ختنہ" ہے۔[6] ابوالانبیاء سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ۸۰ سال کی عمر میں خود اپنا ختنا فرمایا۔[7] جو انسانی تاریخ کا غالباً پہلا ختنہ تھا اور قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کو بطور خاص قابل اتباع اور لائق پیروی قرار دیا ہے۔[8] پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مختون ہونے پر اتفاق ہے، البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ختنہ کیوں کر ہوا؟ اس سلسلہ میں اہل علم سے تین روایتیں منقول ہیں، اول یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختون ہی پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح کی روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب نے ساتویں دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ختنہ کرایا، دعوت کی اور "محمدؐ" کے نام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو موسوم کیا اور حضرت ابو بکرہ راوی ہیں کہ حضرت حلیمہ سعدیہ کے یہاں رہنے کے دوران "شرح صدر" کے واقعہ کے ساتھ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ختنہ کیا۔[1] حقیقت یہ ہے کہ اتنا تو واضح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختون تھے اور عربوں میں زمانۂ قدیم سے ختنہ کا رواج تھا لیکن مذکورہ روایات میں کوئی بھی فنی اعتبار سے اس

---

r الجاثیہ، آیت: ۱۳

q ھود، آیت: ۶۹،۷۱ w آل عمران، آیت: ۲۹ e الزخرف، آیت: ۱۷

q بیھقی عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ، ابوداؤد و ترمذی عن ابی رافع رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ

w بیھقی عن حسن بن علی رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ

درجہ قوی نہیں ہے کہ اس پر اعتبار اور اعتماد کیا جا سکے۔

ختنہ صحت کے لئے مفید ہے۔ حشفہ کے اوپر چمڑے باقی رہیں تو میل جمع ہو کر مختلف امراض اور بیماریوں کا سبب بن سکتے ہیں، ختنہ کی وجہ سے ان بیماریوں سے نجات مل سکتی ہے۔ ختنہ کے بارے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ اس سے طرفین کے لئے لذت لذت میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور مرد کے شہوانی تقاضوں میں اعتدال بھی آتا ہے، اس لئے اس کو مطابق فطرت کہنا عین درست ہوگا۔

حکم اور طریقہ

ختنہ اکثر فقہاء کے نزدیک سنت ہے۔ یہی رائے فقہاء احناف کی ہے، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مشہور قول کے مطابق مرد و عورت دونوں کے لئے واجب اور امام احمد کے نزدیک مردوں کے لئے واجب اور عورتوں کے لئے سنت ہے فقہاء احناف سے عورتوں کے ختنہ کے سلسلہ میں دو رائیں منقول ہیں۔ ایک سنت ہونے کی، دوسرے مستحب (مکرمہ) ہونے کی [2] اور اس کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ہوتی ہے: "الختان سنة للرجال ومكرمة للنساء ختنہ مردوں کے لئے سنت اور عورت کے لئے مستحب ہے۔[3]

مردوں کے لئے ختنہ کی صورت یہ ہے کہ حشفہ کے اوپر کے چمڑے کو کاٹ دیا جائے اور عورت کے ختنہ کی صورت یہ ہے کہ پیشاب کے مخرج کے اوپری حصہ کے ابھرے ہوئے چمڑے کو کاٹ دیا جائے [1] جس سے عورت کی شہوت میں کمی واقع ہوتی ہے، گرم ممالک میں غالباً اس کا رواج زیادہ ہے۔ اہل سیر کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مردوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ختنہ کی ابتداء ہوئی۔ اسی طرح

q بخاری عن ابی بردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۸۲۱/۲ باب تسمیة المولود غداة یولد لمن لم یعق عنہ وتحنیکہ

w بخاری عن انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ باب تسمیة المولود الخ

عورتوں میں حضرت ہاجرہ ام اسماعیل علیہ السلام سے[2] واللہ اعلم۔

ختنہ کی عمر

لڑکوں کا ختنہ بہتر ہے کہ سات سال سے ۱۲ سال کی عمر کے درمیان کیا جائے[3] فقہاء شوافع کا خیال ہے کہ ساتویں دن یا چالیس دن کے اندر اور زیادہ سے زیادہ ساتویں سال میں ختنہ کر دینا مستحب ہے۔[4] بہر حال نابالغی کی عمر میں ختنہ کر دینا چاہئے اور بچہ کی صحت اور اس کی آسانی کے اعتبار سے وقت اختیار کرنا چاہئے۔

بالغ آدمی اسلام قبول کرے تو اگر ختنہ کی تکلیف برداشت کرنے کی قوت نہ ہو تو ختنہ نہ کرے، تکلیف اٹھا سکتا ہو اور اپنا آپ ختنہ کرنے پر قادر ہو تو خود ختنہ کر لے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہے، خود نہ کر سکتا ہو تو ایک طرف بے ستری ہوتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ ختنہ ممنوع ہو، دوسری طرف ختنہ شعار اسلام کا درجہ رکھتا ہے اور شعار کی جو اہمیت ہے وہ محتاج اظہار نہیں ــــــ ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے لئے ختنہ کرا لینا بہتر ہے، اس لئے کہ ختنہ ایک درجہ میں علاج بھی ہے اور علاج کے لئے بے ستری کا جائز ہونا ظاہر ہے۔ دوسرے عثیم بن کثیر کی روایت میں بھی موجود ہے کہ ایک نومسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ختنہ کرانے کا حکم فرمایا[1] اسی لئے فقہاء نے بھی ''حمامی'' (غسل خانہ کے کارندہ) سے ختنہ کرانے کی اجازت دی ہے[2]

بعض اور احکام

---

e موطا امام مالک عن جعفر بن محمد رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ

q ابوداؤد عن ابی الدرداء رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ

w ترمذی عن عائشہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھا باب ماجاء فی تغییر الاسماء

e ترمذی وابن ماجہ عن ابن عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ

جو بچے پیدائشی طور پر مختون ہوں، ان کا ختنہ نہیں کرایا جائے۔[3] ختنہ کرنے اور علاج کے اخراجات خود بچہ کے مال سے ادا کئے جائیں ورنہ اس کی ذمہ داری باپ پر۔[4] یا اس شخص پر ہوگی جس کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہے۔[5]

تعلیم وتربیت

بچوں کی تعلیم وتربیت کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "قوا انفسکم واھلیکم[6] نارا۔" آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الرجل راع فی اھلہ ومسئول عن رعیتہ والمرأۃ راعیۃ فی بیت زوجھا ومسئولۃ عن رعیتھا۔"[7]

آپ کا ارشاد ہے کہ یہ بات کہ آدمی اپنے بچے کو ادب سکھائے اس سے بہتر ہے کہ ایک صاع صدقہ کردے۔[8] اس کی وجہ ظاہر ہے بچوں کی حیثیت ایک نرم اور نوخیز پودے کی ہے اسے جس طرح چاہے موڑا جاسکتا ہے۔ جب یہ پودے اپنی پختگی کو پہنچ جائیں گے ان کو موڑ ناممکن نہ رہے گا۔ یہی حال انسان کا ہے بچپن جس ماحول میں گزرے گا اور جیسی ذہنی اور عملی تربیت کی جائے گی، زندگی کا پورا سفر اسی طرح تمام ہوگا۔

پھر اسلام بچہ کی تربیت کا جو تصور رکھتا ہے وہ نہایت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ وہ

---

r امام ابوداؤد نے ایسے بہت سے نام ذکر کئے ہیں اور از راہ اختصار ان کی سندیں ذکر نہیں کیں۔

t بخاری عن سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ باب اسم الحزن

q ابوداؤد، باب فی تغییر الاسم القبیح

w بخاری عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ، باب ابغض الاسماء الی اللہ: ۹۱۶/۲

e بخاری عن جابر باب احب الاسماء الی اللہ

چاہتا ہے کہ دینی، اخلاقی، جسمانی، عقلی اور نفسیاتی ہر طرح بچہ کی ایسی مکمل تربیت کی جائے کہ مکمل طور پر اس کی شخصیت کی تعمیر ہو سکے اور وہ ایک آئیڈل بن سکے۔

دینی تربیت

تربیت کے مختلف شعبوں میں سب سے اہم دینی اور اسلامی تربیت ہے جس میں مبادیات دین کی تعلیم، عبادات کی ترغیب، حلال وحرام کی تفہیم، قرآن مجید کا پڑھانا وغیرہ داخل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اتنی اہمیت دی ہے کہ فرمایا کہ بچے سے جو سب سے پہلا کلمہ کہلایا جائے وہ ہے لا الہ الا اللّٰہ "افتحوا علی صبیانکم اول کلمة بلا اله الا اللّٰہ"ح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بچوں کو اوامر کی انجام دہی اور شریعت کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچنے کا حکم دو۔ یہ ان کے لئے بھی جہنم سے تحفظ کا ذریعہ ہے اور تمہارے لئے بھی۔[2]

اب ظاہر ہے کہ جب تک حلال وحرام اور فرائض وواجبات کی تعلیم نہ دی جائے اور اس کو نہ سمجھایا جائے ان کو اس کا حکم کیونکر دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ سات سال میں بچوں کو نماز کا حکم دیا جائے اور دس سال کے ہوں تو نماز کی خاطر مار پیٹ بھی کی جائے۔[3]

اسی حدیث سے معلوم ہوا کہ سات سال کے بچے کو اسلامی عبادات اور ان سے متعلق احکام سے واقف ہونا چاہئے اور دس سال تک ان کو پوری طرح خوگر بنا دینا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اسلام کی بنیاد اور اساس ہے اور دراصل یہیں سے اطاعت اور اتباع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

r ابوداؤد عن سمرة بن جندب، باب في تغيير الاسم القبيح

q تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قاموس الفقه لفظ "اللّٰہ"

w الحجرات، آیت: ۱۱

ارشادفرمایا:

”اربوا اولادکم علی ثلاث خصال حب نبیکم وحب ال بیتہٖ وتلاوۃ القرآن۔“ [1]

چنانچہ صحابۂ کرام کا معمول تھا کہ وہ اپنے بچوں کو دینی اور اسلامی تربیت کے لئے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم جس طرح اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے ہیں اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی بھی تعلیم دیتے ہیں۔[2]

اخلاقی تربیت

دینی تربیت کا ایک حصہ اخلاقی تربیت اور تہذیب نفس ہے، اسلام میں فطری طور پر اس کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص نے اپنی اولاد کو اچھے اخلاق و آداب سے بہتر عطیہ نہیں دیا۔[3] اور یہ کہ اپنی اولاد کو تہذیب و شائستگی سکھاؤ۔ ”واحسنوا ادبھم“ خیر کی تعلیم دو۔[5] دو چیزوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کا باپ کے ذمہ حق قرار دیا ہے۔ ایک اچھے اخلاق و آداب سے آراستہ کرنا، دوسرے اچھا نام رکھنا۔[1] ایک روایت میں ہے کہ ساتویں دن بچہ کا عقیقہ کیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور نہلایا دھلایا جائے پھر جب سات سال کی عمر کو پہنچے تو نماز کی تلقین کی جائے، نو سال میں بستر علیحدہ کر دیا جائے، تیرہ سال کی عمر میں نماز

---

e مسلم عن سھل بن سعد ساعدی
q مسلم عن سلیمان بن مغیرہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ
w فتح الملک المعبود تکملہ العذب المورود: ۷۳/۳
e بدائع الصنائع: ۶۹/۵ r بدائع: ۶۹/۵، عالمگیری: ۲۶۳/۵
q دیکھئے المغنی: ۶۹۵/۸ اور بدایۃ المجتھد: ۹۹۸/۱

روزہ کے لئے سرزنش کی جائے سولہ سال کی عمر میں باپ اس کی شادی کر دے، پھر اس کا ہاتھ پکڑے اور کہے میں نے تجھے اخلاق سکھلا دیئے "قد ادبتک و علمتک" دی اور تمہارا نکاح کر دیا۔ اب میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ تو دنیا میں میرے لئے فتنہ کا یا آخرت میں عذاب کا باعث بنے۔[2]

اسی اخلاقی تربیت کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کو کسی ایسی حرکت سے منع فرمایا جو بچہ کے معصوم اور سادہ ذہن پر اپنا غلط نقش چھوڑ جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ جو شخص بچہ کو کہے کہ لے لو پھر اسے نہ دے تو یہ بھی جھوٹ ہے۔[3] ایک بار دسترخوان پر حضرت عمرو بن ابی سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانے میں شریک تھے جو اس وقت بہت کم سن تھے۔ وہ برتن میں مختلف جگہوں سے کھا رہے تھے جو آداب طعام کے خلاف تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا اور اپنے سامنے سے کھانے کا حکم فرما دیا۔[4] ایک بچی آئی اور اس نے بسم اللہ کہے بغیر دسترخوان سے کھانا چاہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور فرمایا جس کھانے پر خدا کا نام نہ لیا جائے اس میں شیطان شریک ہو جاتا ہے۔[5]

اسلام میں تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہی کافی ہے کہ اسلام ایک خاص حد میں ''جبری تعلیم'' کا حامی ہے اس لئے کہ اس نے تعلیم حاصل کرنے کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ قرار دیا ہے: "طلب العلم فریضة علی کل مسلم"[1] اور جو فرائض ہوں ان میں جبر سے کام لینا ہے۔ پھر چھوٹے بچوں کی تعلیم کو اسلام نے خصوصی اہمیت دی ہے۔

---

w دیکھئے ابوداؤد باب فی العقیقة e التعلیق الممجد: ص ۲۸۸

r بدائع: ۲/۵ t ابوداؤد باب فی العقیقة

y ابوداؤد باب فی العقیقة u ترمذی

i سبل السلام: ۲۲۶/۴ باب العقیقة

q نیل الاوطار: ۱۳۲/۵، عالمگیری: ۳۶۲/۵، سبل السلام: ۱۴۲۸/۴

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مستقل باب قائم کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ پانچ سال ہی کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہو جانا چاہیئے۔[2] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہترین صدقہ قرار دیا ہے کہ ایک شخص دوسرے کو علم سے بہرہ مند کر دے۔[3]

اس تعلیم میں سب سے بنیادی چیز تو دینی تعلیم ہے۔ اس لئے کہ وہ ہر شخص کی ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اس کے علاوہ ایسی ضروری دنیوی تعلیم دلانی بھی والدین کی ذمہ داری اور ان کا فریضہ ہے جو اولاد کی زندگی یا اس کی معیشت کے لئے ناگزیر ہو۔ سلف صالحین نے ایسے غیر دینی مفید علوم وفنون کی بھی توصیف کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا:

"العلوم خمسة الفقه للاديان والطب للابدان والهندسة للبنيان والنحو للسان والنجوم للزمان۔"[4]

D: ''(مقصدی) علوم پانچ ہیں، فقہ مذہب کو سمجھنے کے لئے، طب جسمانی علاج کے لئے۔ انجینئرنگ تعمیر کے لئے، قواعد نحو زبان دانی کے لئے اور علوم نجوم وقت کی تحقیق کے لئے۔''

جسمانی تربیت

عقل وفہم، اخلاق وشائستگی اور فکر وعقیدہ کی درستگی اور اعتدال کے لئے سب سے بنیادی اور مادی ضرورت انسان کی جسمانی صحت اور اعتدال ہے۔ اسلام نے اس گوشہ کو بھی تشنہ نہیں رکھا اور واضح ہدایات دی ہیں باپ کو رزق اور لباس کا ضامن اور ذمہ دار قرار دیا ہے۔[1] اور اس شخص کو گنہ گار قرار دیا جو اپنے زیر پرورش لوگوں کا خیال نہ

w دیکھئے: بدایة المجتھد: ۴۴۹/۱، نیز شرح مھذب: ۴۳۰/۸
e مستدرک: ۲۳۸/۴ بحوالۂ اعلاء السنن: ۱۱۵/۱۲
r شرح مھذب: ۳۳۰/۸، المغنی: ۹۴۹/۸
t سبل السلام: ۱۴۲۹/۴

کرے، ان کو ضائع ہونے دے یا ان کی ضروریات کی کفالت سے رک جائے[2] بیمار آدمی کو تندرست آدمی پر زیادہ آمدورفت کرنے سے منع کیا گیا[3] ہر مرض کو قابل علاج قرار دیا اور علاج کی ترغیب دی[4] نشانہ بازی، گھوڑ سواری اور تیرا کی کو ذکر الٰہی کے حکم میں رکھا ہے[5] اور عیش کوشی سے پرہیز، جفا کشی اور تیر اندازی کا حکم دیا گیا[6]

یہ ہدایات مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لئے ہیں اور صلاحیت واستعداد کے لحاظ سے بچے اور جوان اس کے زیادہ مخاطب ہیں، ان کے اندر جسمانی ریاضت، چستی اور پھرتی پیدا کرنے کی جو صلاحیت ہے، وہ ظاہر ہے۔ اسی طرح ایام جاہلیت میں خواتین بچوں کے تالو کو مسل دیتی تھیں، جو بسا اوقات شدید مضرت کا باعث بن جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا[7] ماں کا دودھ بچے کے لئے ایک صحت مند غذا ہے، ماؤں کو اس کا مکلّف قرار دیا گیا کہ وہ عام حالات میں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں[1] حیض کی حالت میں بیوی سے ہمبستری قطعاً ممنوع قرار دی گئی[2] جو بچے کے لئے شدید اور سنگین خلقی امراض کا باعث بنتا ہے۔

تربیت کے اصول

اسلام ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ تربیت دینے کا طریقہ کیا ہے؟ اور اس کے لئے کیا کیا ذرائع استعمال کئے جا سکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں اصولی طور پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اسلام ہر طرح کی

---

q دیکھئے مجمع الزوائد: ۴/۵۹، زمن العقیقه

w المغنی باب الذبائح

e شرح مهذب: ۸/۴۴۸

r المحلی: ۶/۲۴۰ مع تحقیق ڈاکٹر عبدالغفار، ویسے بہشتی زیور: ۶/۱۳ میں ہڈی نہ توڑنے کو بے اصل قرار دیا گیا ہے۔

q مجمع الزوائد: ۴/۵۸ — w المغنی: ۹/۳۶۵

e فتح الباری: ۹/۵۱۵ — r المغنی: ۹/۳۶۶

اصلاح و تربیت کے لئے حتی المقدور نرمی سے کام لینے اور بلا وجہ تشدد سے احتراز کرنے کا حامی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن بھیجا اس وقت چند مختصر اور جامع لفظوں میں دعوت کے جو زریں اصول بتائے وہ یہ تھے کہ نرمی کرو، سختی نہ کرو، خوشخبری دو اور متنفر نہ کرو۔ "**یسرا ولا تعسرا و بشرا ولا تنفرا۔**" [3]

بے جا تشدد اور سخت گیری اکثر اوقات بڑے مضر اور نقصان دہ نتائج پیدا کرتی ہے، مشہور مورخ علامہ ابن خلدون نے طلبہ کی نفسیات اور ایسے نامناسب رویہ کے اثرات پر بڑی حکیمانہ گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''جس کا طریق تربیت غلاموں اور بچوں یا خادموں کے ساتھ تشدد آمیز اور قہر آلود ہوتا ہے۔ ان کے زیر تربیت لوگوں پر خوف مسلط ہو جاتا ہے، وہ تنگ دل ہو جاتے ہیں اور ان کی طبیعت کا نشاط ختم ہو جاتا ہے پھر اس کی وجہ سے اس کے اندر سستی اور کسل پیدا ہو جاتا ہے اور یہ چیز اس کے لئے جھوٹ اور مختلف برائیوں کا محرک ثابت ہوتی ہے...... وہ مکر و فریب اور حیلہ جوئی سیکھتا ہے یہاں تک کہ یہی رفتہ رفتہ اس کی عادت اور طبیعت بن جاتی ہے۔'' [1]

> البتہ ایسا بھی نہ ہونا چاہئے کہ بچوں کی تربیت میں سختی اور مار پیٹ سے کام ہی نہ لیا جائے۔ اس لئے کہ اکثر اوقات اس کی وجہ سے بچے بہت شوخ اور نافرمان ہو جاتے ہیں اور رعب و دبدبہ ان کے دل میں باقی ہی نہیں رہ پاتا، اس کا ثبوت وہ حدیث ہے کہ اس پر اللہ کی رحمت ہو جو اپنے گھر میں کوڑا لٹکا کر رکھے تا کہ اس کے ذریعہ اس کے اہل و عیال ڈریں۔'' [2]

t سبل السلام: ۱۴۲۹/۴ y بخاری عن ابی ھریرہ، باب تقلیم الاظفار

u بخاری عن ابی ھریرہ باب قول اللّٰہ واتخذ اللّٰہ ابراھیم خلیلاً

پھر تربیت میں جہاں مختلف ذرائع استعمال کرنے پڑیں وہاں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ پہلے خفیف تنبیہ اور پھر اس کے بعد اس سے سخت تنبیہ کی جائے۔ اس کا اندازہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوت و اصلاح کے مجموعی طریق کار سے تو ہوتا ہی ہے، اس بات سے بھی ہوتا ہے جو قرآن نے بیوی کی فہمائش کے سلسلہ میں ہدایات دی ہیں کہ پہلے وعظ و پند اور نصیحت و موعظت سے کام لیا جائے۔ اس سے کام نہ چلے تو وقتی طور پر ترک تعلق کر لیا جائے "ھجر فی المضاجع"[1] اگر یہ بھی کافی نہ ہو تو ان کے مناسب حال خفیف سرزنش کی جائے ـــــ یہی اصول بچوں بلکہ سن و سال کے لوگوں کی اصلاح اور ان کی تربیت کے لئے ہے۔

اسوۂ رسالت کی روشنی میں

اس سلسلہ میں جب ہم خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالات اور مخاطب کے لحاظ سے مختلف مواقع پر جداگانہ اور الگ الگ طرز عمل اختیار کیا ہے۔ کبھی صرف موثر توجہ دہانی فرما دی مثلاً عمر بن ابی سلمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر پرورش تھے اور کم عمر تھے، کھانے کے دوران مختلف جگہوں سے کھا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ دلائی اور فرمایا بسم اللہ کہو۔ دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور برتن کے اس حصہ سے کھاؤ جو تم سے قریب ہے۔[1]

کبھی شفقت اور دلجوئی کا لب و لہجہ اختیار فرمایا، ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مشروب لایا گیا۔ آپ کی دائیں جانب عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جو اس وقت بہت کم عمر تھے اور بائیں سمت بڑی عمر کے اصحاب تھے۔ آپ نے

---

i النحل، آیت: ۱۲۳

q الاتحاف: ۶۶۶/۲

حضرت ابن عباس سے فرمایا کیا تم مجھے اس کی اجازت دو گے کہ یہ بچا ہوا ان بڑوں کو دے دوں؟ انہوں نے عرض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو ملنے والا ہے خدا کی قسم میں اس میں ایثار نہیں کرسکتا یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھوٹا پینے کا شرف خود میں حاصل کروں گا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشروب ان کے ہاتھوں میں رکھ دیا[2] یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باتوں ہی باتوں میں بڑوں کا حق اور ان کے ساتھ رعایت کی تعلیم بھی دے دی۔

مربی اور معلم کبھی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اشارہ اور عمل کے ذریعہ کسی بات پر تنبیہ کردے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایسا ثابت ہے۔ ایک بار حجۃ الوداع کے دوران قبیلہ بنوخثعم کی ایک خاتون آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حج کے بارے میں ایک مسئلہ دریافت کرنے آئیں۔ حضرت فضیل بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور کم عمر ہی تھے وہ ان کی طرف دیکھنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ان کا چہرہ دوسری سمت موڑ دیا[3] یہ گویا عملی طور پر اس بات کی تعلیم تھی کہ غیر محرم عورتوں سے اپنی نگاہ کو بچانا چاہئے۔

موقع کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے از راہ تربیت خفگی کا اظہار بھی کیا ہے اور ڈانٹا ڈپٹا بھی ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بار غالبًا اپنے غلام کو ڈانٹتے ہوئے ماں کا طعنہ دیا اور کہا ''اے کالی کلوٹی عورت کا بیٹا'' ''یا ابن السوداء'' یہ جملہ از راہ بشریت فرط غصہ میں ان کی زبان سے نکل گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سخت خفگی کا اظہار کیا اور ارشاد فرمایا ''ابوذر! تمہارے اندر جاہلیت کے اثرات

---

w ملاحظہ ہو شرح مہذب: ۱/۳۰۰،۳۰۱، الاتحاف: ۲/۶۶۵، عالمگیری: ۵/۳۵۷

e رواہ احمد والبیہقی ...... باسناد ضعیف، اتحاف: ۲/۶۶۵

q شرح مہذب: ۱/۳۰۲،۳۰۳

باقی ہیں۔’’انک امرأفیک جاھلیة[1]‘‘

کبھی وقتی طور پر بے رخی اور ترک تعلق کا اظہار بھی موثر ہوا کرتا ہے حدیث کی کتابوں میں تفصیل سے یہ واقعہ مذکور ہے کہ بعض مخلص صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم باجود قصد وارادہ کے آج کل میں غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہو سکے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ کو واپسی ہوئی۔ان حضرات نے آکر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اس موقع پر جب تک خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کی توبہ کی قبولیت کا حکم نازل نہ ہوگیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور دوسرے مسلمانوں نے ان سے گفتگو بند کردی اور تعلقات منقطع کر لئے مگر ظاہر ہے اصلاح وتربیت کا یہ انداز انہیں کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے جن کا شعور بالغ ہو چکا ہو۔کمسن بچوں کے ساتھ یہ رویہ مفید سے زیادہ مضر ہوگا۔

آخری چارۂ کار کے طور پر اسلام مارنے اور جسمانی سرزنش کرنے کی بھی اجازت دیتا ہے جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔بچوں کو دس سال کی عمر میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لئے مارنے کی اجازت بلکہ اس کا حکم دیا ہے۔[2]

جسمانی سرزنش

جسمانی سرزنش کے سلسلہ میں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس کا استعمال آخری طریق کار کے طور پر اس وقت کرنا چاہئے جب فہمائش پند وموعظت اور ڈانٹ ڈپٹ وغیرہ سے کام نہ چل سکے۔اس وقت نہیں مارنا چاہئے جب آدمی بہت جذباتی ہو۔غصہ میں ہو یا غیر معتدل حالت میں ہو۔جیسا کہ حدیث میں اس طرح بیوی کو مارنے کی ممانعت آئی ہے کہ اس کی گردن کی رگیں (مارے غصہ کے) پھولی ہوئی

w الاتحاف بحوالہ سھیلی: ۴۴۸/۲

e عالمگیری: ۳۵۷/۵

r شرح مھذب: ۳۰۳/۱

ہوں۔[1] چہرہ اور جسم کے نازک حصوں پر نہیں مارنا چاہئے حدیث میں چہرہ پر مارنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔[2] اس طرح نہ مارنا چاہئے کہ جسم کا کوئی حصہ ٹوٹ جائے یا بچہ کی صحت متاثر ہو جائے۔ اس ممانعت کا ثبوت وہ حدیث اور اسلامی شریعت کا اصول ہے کہ "**لا ضرر ولا ضرار**" نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ پہنچاؤ)۔[3]

بسا اوقات مدرسین و اساتذہ اس معاملہ میں حد سے گزر جاتے ہیں اور تعذیب کی حد تک بچوں کی سرزنش کرتے ہیں۔ یہ طریقہ نفسیاتی اعتبار سے نہایت نقصان دہ اور مضر ہے۔ اس لئے کہ اس سے طلبہ میں بسا اوقات خود تعلیم ہی سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نیز وہ سزاؤں کے اس قدر خوگر و عادی ہو جاتے ہیں کہ نہ ان کے اندر پند و موعظت سے کوئی بیداری پیدا ہوتی ہے اور نہ سزاؤں کا خوف باقی رہتا ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ استاذ نامناسب حد تک سزا دے تو خود استاد کی تعزیر کی جائے گی۔

نکاح

اولاد کا آخری حق جو والدین کے ذمہ ہے، یہ ہے کہ بالغ ہونے کے بعد جلد سے جلد ان کا نکاح کر دیا جائے۔ نکاح چوں کہ عفت و عصمت اور پاکیزگی کا نہایت موثر اور اہم ذریعہ ہے، اس لئے بالغ ہونے کے بعد اسلام اس میں عجلت کو پسند کرتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جس کا بچہ ہو وہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کی تربیت کرے۔ پس جب بالغ ہو جائے تو شادی کر دے، پھر اگر بالغ ہوا اور شادی نہ کرے اور وہ گناہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا۔[1]

دوسری حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تورات میں لکھا

---

q الاتحاف: ۶۶۶/۲ w ھندیہ: ۳۵۸/۵

e شرح مھذب: ۳۰۸/۱ r عالمگیری: ۳۵۸/۵

t شرح مھذب: ۳۰۶/۱ y التحریم، آیت: ۶

ہوا ہے کہ جس کی عمر بارہ سال ہو جائے اور اس کی شادی نہ کرے پھر وہ لڑکی گناہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کا گناہ شادی نہ کرنے والے سرپرستوں پر ہوگا[2] چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا نکاح کیا کرو۔[3]

اسی طرح نکاح کرتے وقت بچے کے لئے اچھے رشتے کا انتخاب کرے یعنی ایسی بہو لائے جو دیندار اور حسن اخلاق کی حامل ہو اور قبول صورت ہو، جو سن و سال اور طبیعت کے لحاظ سے اس کے لئے موزوں ہو سکے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ عورت سے نکاح چار اسباب کے تحت کیا جاتا ہے۔ مال، خاندان، حسن و جمال اور دین۔ اس میں کامیاب نکاح وہ ہے جو دین کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔[4] چنانچہ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے صاحبزادہ حضرت عاصم کے لئے اس لڑکی کا انتخاب کیا جس نے اپنی بوڑھی ماں کے حکم کے علی الرغم رات کے اندھیرے میں دودھ میں پانی ملانے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف اس کی اس ایمانداری اور دیانت کو معیار بنایا، نہ خاندان وحسب پوچھا، نہ مال و متاع کی تفصیل معلوم کی اور نہ رنگ روپ۔[1]

غیبت اور جھوٹ

جیسے چہرہ انسان کے حسن و جمال کا مظہر ہے، اسی طرح اخلاق انسان کی سیرت اور اس کی اندرونی کیفیت کا پیرہن ہے، اخلاق ہی کے ذریعہ انسان کی حقیقت شخصیت کی شناخت ہوتی ہے۔ اسی لئے اسلام میں اخلاق کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل

u بخاری عن ابن عمر باب العبد راع في مال سيده
i ترمذی عن جابر بن سمره باب ماجاء في ادب الولد
q مستدرک حاکم عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ
w ابن جریر عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ

کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔" انما بعثت لا تمم مکارم الاخلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی مکارم اخلاق کی عملی تفسیر ہے اور انہیں مکارم اخلاق کے مطابق زندگی کو سنوارنا قرآن کی زبان میں تزکیہ ہے۔

اخلاق کے کچھ ابواب مثبت ہیں اور کچھ منفی جو مطلوب ہیں وہ ''مثبت'' ہیں۔ انہیں کو فضائل اخلاق کہا جاتا ہے، جو مذموم ہیں اور جن سے اجتناب شریعت کا منشاء ومقصود ہے، وہ ''منفی'' ہیں اور رذائل اخلاق کہلاتے ہیں ـــــ صدق و راستی، رحم دلی، حلم و بردباری عفو ودرگزر، غیرت وحیاء، سخاوت وسیر چشمی، تواضع وفروتنی، ایثار و قربانی، شجاعت و بہادری، دیانت و امانت، عفت و پاکدامنی، قناعت و استغناء، شیریں کلامی، ایفاء عہد، احسان واداء حقوق، بڑوں کا احترام چھوٹوں پر شفقت ومحبت یہ فضائل اخلاق ہیں اور یہ بہرصورت واجب العمل ہیں۔ ان کے مقابلہ میں جھوٹ، بہتان تراشی، ظلم، غیظ وغضب، بے شرمی، بخل، کبروترفع، خودغرضی، بزدلی، خیانت، بے عفتی، حرص ولالچ تلخ کلامی، بدعہدی، حق تلفی، غیبت و بدگمانی، بہتان، بڑوں کی بے توقیری اور چھوٹوں کے ساتھ بدسلوکی وغیرہ مذموم وناپسندیدہ اوصاف ہیں، اوران سے اجتناب ضروری ہے۔

لیکن غور کیا جائے تو تمام فضائل اخلاق کی جڑ صدق وسچائی ہے اور تمام رذائل کی جڑ جھوٹ اور غیبت ہے۔ جھوٹ اور غیبت جہاں گناہ ہے وہیں بعض صورتوں میں ایک ضرورت بن جاتا ہے اور ایسے موقعہ پر دائرہ جواز میں آجاتا ہے، اسی لئے فقہاء نے بھی باب اخلاق کے ان دو رذائل پر بحث کی ہے اور میں بھی ان فقہاء کی اقتداء میں رذائل واخلاق کے دونوں پہلوؤں پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

غیبت کب حرام اور کب حلال ہے؟

---

e ترمذی عن عبدالملک بن الربیع بن سبرہ عن ابیہ عن جدہ: ۹۳/۱

غیبت کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔قرآن مجید نے نہ صرف غیبت سے منع کیا بلکہ اس کو اپنے مردہ بھائی کے گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا[1] حدیثوں میں نہ صرف غیبت کرنے بلکہ غیبت سننے کی بھی ممانعت کی گئی[2] ـــــــ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی کوئی ایسی بات بیان کرنی کہ اگر وہ اس کو سنے تو ناگواری ہو، غیبت ہے۔ چاہے اس بات کا تعلق جسمانی نقص، خاندان واخلاق سے ہو، قول وفعل سے ہو یا دین ودنیا سے۔[3]

جیسا کہ عرض کیا گیا غیبت حرام ہے لیکن جب شر سے حفاظت یا ظلم کا دفاع مقصود ہو تو جائز ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے چھ صورتیں لکھی ہیں جن میں غیبت کی اجازت ہے:

اول: ظلم کے خلاف دادرسی یعنی مظلوم اپنے فریق کی خیانت، رشوت ستانی یا کسی اور ظلم کی شکایت قاضی، سلطان یا ذمہ دار کو کرسکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صاحب عقل کو بات کہنے کا حق حاصل ہے۔ "ان لصاحب الحق مقالاً"

دوسرے: کسی کی اصلاح اور منکر کو روکنے کی غرض سے زیادہ مؤثر شخص کی مدد حاصل کرنے کے لئے بھی غیبت کی جاسکتی ہے، وصال نبوت کے بعد ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان کو سلام کیا لیکن جواب سے محروم رہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی شکایت کی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان سے رجوع کیا۔ یہ شکایت اصلاح کے لئے تھی نہ کہ اہانت کے لئے۔

تیسرے: مفتی سے سوال کرنے والا اگر استفتاء میں کسی کے ظلم یا عیب کا ذکر کردے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوسفیان کی بیوی نے اپنے شوہر کے مال

---

q طبرانی عن علی رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ

w تربیت الاولاد فی الاسلام: ۱/۱۵۰

e ترمذی عن ایوب رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ، باب ماجاء فی ادب الولد

میں سے کچھ لینے کے متعلق مسئلہ پوچھتے ہوئے عرض کیا کہ ابوسفیان بخیل آدمی ہیں۔ اتنا نہیں دیتے کہ میرے اور بچوں کے لئے کافی ہو جائے، کیا میں ان کے مال میں سے (بلا اجازت) کچھ لے سکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بقدر کفایت لے سکتی ہو ـــــ لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ استفتاء میں بھی ایسے مسائل میں متعلق شخص کے نام کی صراحت کے بجائے فرضی ناموں کے ذریعہ سوالات کئے جائیں۔

چوتھے: کسی مسلمان کو کسی شخص کے شر سے بچانا مقصود ہو مثلاً کوئی نکاح یا سامان امانت رکھنے کے سلسلہ میں مشورہ کرے، ایسے شخص کو خادم رکھے جو چوری وغیرہ کا عادی ہو، خریدار بیچنے والے کو کھوٹہ سکہ دے اور وہ اس کے کھوٹے ہونے سے واقف ہو، ایسی صورتوں میں ایک مسلمان کو ضرر اور شر سے بچانے کے لئے غیبت کرنا جائز ہے۔

پانچویں: کوئی انسان کسی ایسے نام سے معروف ہو گیا ہو جس سے اس کے نقص جسمانی کا اظہار ہوتا ہو تو تعارف کے لئے ایسے ناموں کے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، جیسے بعض مشہور علماء اعرج (لنگڑا) اعمش (کانا) وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں یا جیسے ہمارے یہاں بعض بصارت سے محروم لوگ حافظ نابینا یا حکیم نابینا وغیرہ سے مشہور ہو جاتے ہیں، انہی ناموں سے ان کا ذکر کرنے میں مضائقہ نہیں۔

چھٹے: ایسا شخص جو علانیہ فسق و فجور کرتا ہو اور اس سے نہیں شرماتا ہو، اس کی برائی بیان کرنے میں بھی مضائقہ نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ایسے شخص کی کوئی حرمت و کرامت نہیں، اسی طرح کی بات حسن بصری سے بھی نقل کی گئی ہے، ایک روایت میں ہے کہ جس نے اپنے چہرہ سے چادر حیا اتار دی اس کی شکایت غیبت نہیں[1]

فقہاء نے بعض اور صورتوں کو بھی جائز قرار دیا ہے یا اس کو غیبت میں شمار نہیں کیا ہے مثلاً اشخاص کی تعیین کے بغیر کسی گاؤں یا شہر کے لوگوں کی خامی بیان کی جائے یا کسی

کی کمزوری کو بطور اظہار افسوس کے ذکر کیا جائے، غصہ اور توہین مقصود نہ ہو تو ان صورتوں میں بھی شکایت غیبت نہیں ہے لیکن مناسب یہ بھی نہیں۔ اسی طرح حدیث کے راوی یا کسی معاملہ کے گواہ پر جرح جائز بلکہ واجب ہے کہ یہاں اس کی خامیوں کے بیان کرنے کا مقصد شریعت کی حفاظت اور مظلوم کو ظلم سے بچانا ہے۔[2]

جھوٹ ـــــ حرام اور حلال

جھوٹ بدترین گناہ اور اکبر کبائر ہے، قرآن میں دسیوں مواقع پر جھوٹ کی مذمت کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ جھوٹ کو اللہ کی لعنت کا سبب خاص قرار دیا گیا ہے۔[3] اللہ تعالیٰ نے جہاں شرک و بت پرستی سے منع کیا ہے وہیں دوش بدوش دروغ گوئی سے بھی اجتناب کا حکم فرمایا ہے۔[4] لیکن بعض صورتوں میں زیادہ بہتر اور اہم مقاصد کے لئے جھوٹ بولنے کی اجازت دی گئی ہے۔ خود احادیث میں جھوٹ کی بعض صورتوں کا استثناء موجود ہے۔

حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین مواقع پر جھوٹ کی اجازت دیتے تھے، ایک اس صورت میں جب دو مسلمانوں کے درمیان مصالحت مقصود ہو، دوسرے جنگ میں تاکہ دشمن کو دھوکہ دیا جا سکے، تیسرے شوہر بیوی کو یا بیوی شوہر کو خوش کرنے کے لئے۔[1] حدیث کا مقصود تین ہی صورت کا حصر نہیں بلکہ بقول امام غزالی اصل اہمیت مقصود کی ہے، وہ مقاصد جو شریعت کی نگاہ میں مطلوب اور پسندیدہ ہیں، اگر سچ اور جھوٹ دونوں ذریعہ سے حاصل کئے جا سکتے ہوں تو جھوٹ بولنا حرام ہے اور اگر جھوٹ بول کر ہی وہ مقصد حاصل ہوسکتا ہو تو اگر وہ مقصد مباح کے درجہ کا ہو تو جھوٹ بولنا بھی مباح ہوگا اور

r ابن ماجہ عن حارث بن نعمان، باب بر الوالد والاحسان الی البنات
t مسند عبدالرزاق عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
q بیہقی عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ

واجب کے درجہ کا ہو تو جھوٹ بولنا بھی واجب۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے میمون بن مہران سے خوب نقل کیا ہے کہ بعض دفعہ جھوٹ سچ سے بہتر ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی مسلمان کے قتل کے درپے ہو اور وہ چھپ جائے۔ آمادۂ قتل مجرم اس کی تلاش میں آئے تو اس موقعہ پر جھوٹ بول کر اس کی جان بچا لینا، سچ بول کر اس کی نشاندہی کرنے سے بہتر ہے۔[2] ـــــ علامہ حصکفی نے اس سلسلہ میں ایک قاعدہ بیان کیا ہے کہ اپنے حق کے تحفظ اور ظلم سے بچنے کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے۔[3] علامہ شامی نے لکھا ہے کہ سچ کے ذریعہ جو فساد ہوتا ہو وہ جھوٹ کے فساد سے بڑھ کر ہو تو جھوٹ جائز ہوگا ورنہ حرام۔[4]

%

w مسند ابن حبان عن انس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ
e مسند احمد عن انس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ
r کنز العمال عن عمرو بن ابی سلمہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ: ۴/۲
t کنز العمال عن حذیفہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ

کتابیات

قرآنیات

قرآن حکیم ....

الجامع لاحکام القرآن.................................. ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی

احکام القرآن .... ابوبکر جصاص الرازی

احکام القرآن .... ابن عربی

احکام القرآن .... مولانا ظفر احمد تھانوی

معارف القرآن .... مفتی محمد شفیع صاحب

احادیث وشروح احادیث

بخاری شریف .... محمد بن اسماعیل البخاری

مسلم شریف.. مسلم بن الحجاج القشیری

ابوداؤد شریف .... سلیمان بن الاشعث ابوداؤد سجستانی

ترمذی شریف .... ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی

نسائی شریف .... ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی

ابن ماجہ شریف .... محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی

موطا امام مالک.. امام مالک بن انس الاصبحی

سنن کبریٰ .... ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی

مسند بن حبان .... ابوحاتم بن حبان التمیمی المصری

مجمع الزوائد.. حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی

جمع الفوائد .... الامام محمد بن محمد بن سلیمان

ریاض الصالحین .... الامام یحییٰ بن شرف النووی

مستدرک.. امام ابوحاکم نیسابوری

جامع الاصول .... ابن اثیر
کتاب الاعتبار .... علامہ حازمی
کنز العمال .... علی متقی الہندی
مشکوٰۃ شریف .... الامام محی السنۃ البغوی
زاد المعاد .... ابن قیم جوزی
فتح الباری .... احمد بن علی بن حجر عسقلانی
عون المعبود .... محمد شمس الحق عظیم آبادی
فتح الملک المعبود تکملہ عون المعبود ....
نیل الاوطار .... محمد بن علی بن محمد الشوکانی
سبل السلام .... محمد بن اسماعیل الامیر الیمنی الصنعانی
اعلاء السنن .... ظفر احمد عثمانی التھانوی
تحفہ الاحوذی .... ابوالعلی محمد عبدالرحمٰن مبارک پوری
المعتصر من المختصر .... ابن باجہ مالکی
شمائل ترمذی .... الامام محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی
عمل الیوم واللیلۃ .... علامہ دینوری
المقاصد الحسنہ .... علامہ سخاوی
تکملہ فتح الملہم .... مولانا محمد تقی عثمانی
مرقاۃ المفاتیح .... ملا علی بن سلطان محمد القاری
احیاء العلوم .... امام ابوحامد الغزالی
اتحاف السادۃ المتقین .... محمد بن محمد حسینی الزبیدی الشہیر بمرتضیٰ

فقہ واصولِ فقہ

رحمت الامۃ .... ابوعبداللہ محمد بن عبدالرحمٰن الدمشقی
بدایۃ المجتہد .... الامام محمد بن رشد القرطبی
الفقہ علی المذاہب الاربعہ .... عبدالرحمٰن الجزیری

بدائع الصنائع .... ملک العلماء ابوبکر بن مسعود کاسانی

المبسوط .... شمس الدین سرخسی

البحر الرائق .... زین الدین بن نجیم الحنفی

فتح القدیر .... کمال محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الہمام

ردالمحتار .... محمد آمین آفندی الشہیر بابن عابدین الشامی

درمختار .... علاء الدین حصکفی

خلاصۃ الفتاویٰ .... عبدالرشید طاہر بخاری

ہدایہ .... برہان الدین مرغینانی

مجمع الانہر .... عبداللہ بن الشیخ محمد بن سلیمان المعروف بداماد آفندی

عنایہ .... اکمل الدین محمد بن محمود بابرتی

الفتاویٰ الہندیہ .... شیخ نظام و جماعۃ من علماء الہند

فتاویٰ تاتارخانیہ .... علام عالم بن العلاء انصاری

فتاویٰ غیاثیہ .... ابوداؤد بن یوسف الخطیب

فتاویٰ قاضی خاں .... فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی

فتاویٰ بزازیہ .... محمد بن محمد بن شہاب المعروف بابن البزازالکردی

الفقہ الاسلامی وادلتہ .... ڈاکٹر وہبہ زحیلی

کتاب الام .... الامام محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ

المغنی .... ابومحمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ

المجموع شرح مہذب .... الامام یحیٰ بن شرف النووی

فتح العزیز مع شرح المہذب ....

حاشیہ اذرعی علی ہامش المجموع ....

الشرح الکبیر ....

الاحکام فی اصول الاحکام .... علی بن محمد آمدی

المحصول فی علم الاصول .... امام فخر الدین رازی

الموافقات .... ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ شاطبی

اعلام الموقعین .... ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر المعروف بابن قیم
الاشباہ والنظائر.. زین الدین بن نجیم الحنفی
الاشباء والنظائر .... علامہ جلال الدین سیوطی
غمز عیون البصائر.. احمد بن محمد الحنفی الحموی
امداد الفتاویٰ .... مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ
کفایت اللہ المفتی .... مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ
جواہر الفقہ .... مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
جدید فقہی مسائل .... خالد سیف اللہ رحمانی

متفرقات

شرح فقہ اکبر .... ملا علی بن سلطان محمد القاری
الاعتصام .... ابو اسحاق شاطبی
مقدمہ ابن خلدون... عبد الرحمٰن بن محمد بن خلدون
حجۃ اللہ البالغہ .... شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ
مکتوبات مجدد الف ثانی .... شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ تعالیٰ
فیوض یزدانی.. شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ
سیرت النبی .... علامہ سیّد سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ
تربیۃ الاولاد فی الاسلام..

%

B –